نشتر کدہ

نشتر ہنگامی

ڈھلتا نہیں ہیرے میں یونہی پارہء سنگ
صدیوں میں کوئی عیبِ ہنر بنتا ہے

فضا ابنِ فیضی

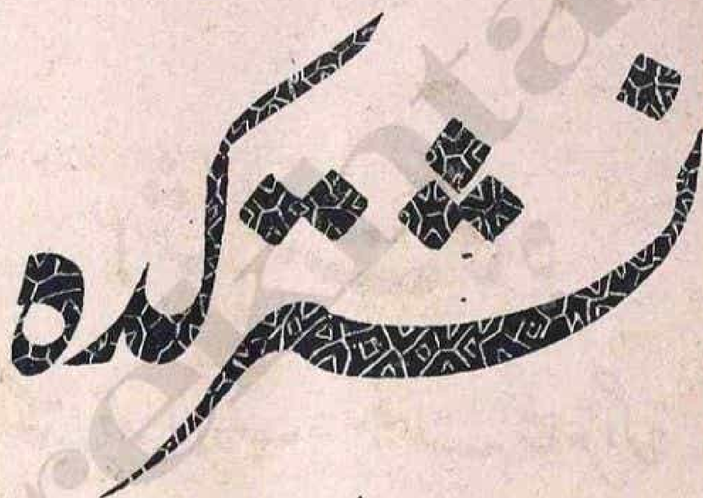


PdfBy, Misken Mazhar Ali Khan

Cell No, 00966590510687

نشترکدہ

نشتر ہنگامی



دیوانِ غزلیات

محسنِ ادب جناب منشی ہرگوبند دیال صاحب نشتؔر ہنگامی

وکیلِ اورئی

اشاعت گاہ

مکتبۂ قصر الادب، دفترِ "شاعر" آگرہ

سنہ ۱۹۳۷ء

پہلا ایڈیشن

ایکہزار

قیمت فی جلد دو روپیہ آٹھ آنے

مطبوعہ

رفاہِ عام برقی پریس آگرہ

فہرست

عرضِ مصنف

عرصہ قریب چار سال کا ہوا کہ اپنے دوستوں کے اصرار سے اپنی پُرانی غزلیات اور کچھ نئی غزلیات کہہ کر طبع کرانے کے لئے (باوجود اس کے کہ میں ہمیشہ اس کے خلاف رہا اور طبیعت قبول نہ کرتی تھی) راضی ہوا۔ اُس کے بعد ایک سال سے زائد نئی غزلیات کے کہنے میں جو دقتیں بوجہ مصروفیت پیشۂ وکالت (جس کا فخر مجھ کو خدا کے فضل سے شروع وکالت سے جس کو زمانہ قریب ۳۲ سال کے ہوتا آتا ہے، حاصل تھا) پیش آئیں اُنکو حیطۂ تحریر سے باہر سمجھکر ناظرین کے قیاس پر چھوڑتا ہوں۔ جب خدا خدا کرکے ایک کتاب کے لائق غزلیں ہوگئیں (میرا مطلب دوستوں کی رائے سے ہے، کیونکہ میری رائے اگر چلتی تو نہ جانے کب کا تکمیلِ کتاب کا فتویٰ میں نے دیدیا ہوتا) تو جان میں جان آئی۔ میں نے غزلیات کہنے میں کبھی اُس وقت کا ایک منٹ بھی صرف نہیں کیا تھا جو روزمرہ صبح شام وکالت کے کام کے لئے مخصوص تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دم لینے کا وقت جو یوں ہی کیا بہت تھا پھر قلم لینے میں صرف ہوتا تھا۔ اس صورت حال کے متواتر قائم رہنے سے تندرستی پر قدرتاً بُرا اثر پڑا۔ مگر میں ہر وقت اس دل خوش کُن خیال میں مست تھا کہ چلو جو گذر رہی ہے گذری جا رہی ہے۔ اپنی زندگی میں صاحبِ دیوان ہونے کا فخر تو حاصل ہوا جاتا ہے۔ رہا تندرستی کا معاملہ، وہ جس طرح بہ تدریج خراب ہوئی تھی پھر بہ تدریج درست ہو جائیگی۔ اور وہ ہی ہوا۔ قریب قریب روزمرہ ایک غزل طیار کرنے کا سلسلہ جو دفعتاً منقطع ہوگیا تو ایسا معلوم ہوا کہ خداوند کریم نے دونوں ہاتھوں سے میری کھوئی ہوئی تندرستی مجھ کو واپس کرنی شروع کردی اور میں نے کچھ ہی زمانے میں اپنی سابق تندرستی حاصل کرلی۔

واضح رہے کہ میں صرف اپنی غزل گوئی کی تیز رفتاری کی تعریف کر رہا ہوں۔ نوعیتِ کلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ناظرین مجھ کو خود ستائی کا مرتکب نہ قرار دیں۔ کیونکہ میں اگر کسی چیز سے دور بھاگتا ہوں تو اسی سے، اور اگر دنیا میں مجھے کسی چیز سے نفرت ہے تو اسی سے، اپنی تعریف کرنا تو درکنار، سُننے سے بھی زمین میں گڑ جانیکو جی چاہتا ہے،

بہرحال یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ کتاب مکمل ہو جانے کے بعد اس کے طبع کرانے کی فکر ہوئی۔ خیال یہ تھا کہ کسی بڑے شہر میں کسی پریس سے خط و کتابت کر کے چھپائی کی شرطیں طے کی جائیں گی کہ اتنے میں مقامی "شمسی پریس" کے مالک جو میرے عنایت فرما ہیں میرے ارادے کی خبر پا کر میرے پاس آئے اور مجھ سے اس بات کے متمنی ہوئے کہ وہ کتاب بغرض طبع انھیں کے حوالہ کر دی جائے۔ ایک غزل بھی وہ لکھ کر لے گئے اور نمونتاً چھاپ کر مجھ کو دکھائی۔ دوست احباب نے پسند کی، مجھ کو بھی بُری معلوم ہوئی۔ چنانچہ کتاب اُن کے سپرد کر دی گئی اور لگی چھپنے۔ مقامی پریس میں چھپنے سے یہ اور فائدہ تھا کہ مولوی عبدالرزاق صاحب بیخود سہسرامی وکیل (جن کی ذات بابرکات کی وجہ سے کتاب تکمیل کو پہونچی تھی جس کا مفصل ذکر کتاب کے دیباچہ میں میں نے تحریر کر دیا ہے) اور حکیم عبدالرب صاحب رئیس بارہ بنکوی میونسپل طبیب و سکریٹری مقامی مشاعرہ کمیٹی کتابت کے وقت دیکھ سکیں گے اور کچھ دنوں ایسا ہوا بھی۔ لیکن شامتِ اعمال سے کچھ دنوں بعد کاپی نویس صاحب کا پتلا حال ہو گیا اور چھوٹے سے مقام پر حسب دلخواہ دوسرا کاپی نویس نہ مل سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مالک مطبع صاحب کتاب لیکر آگرے چلے گئے۔ وہیں اُنھوں نے کتاب لکھوائی اور وہیں چھپوائی۔ غرضکہ جملہ مراسم جو ایک کتاب کے طبع ہونے تک اُس کے متعلق ادا ہوتے ہیں وہیں ادا ہوئے۔ پھر مجھ کو اس کتاب کے متعلق (سوائے اس کے کہ یہ معلوم ہوتا رہا کہ کتاب چھپ ہی رہی ہے) اور کوئی حال اسوقت تک نہ معلوم ہو سکا۔ جبتک کہ کتاب چھپ کر دسمبر ۱۹۳۲ء میں میرے سامنے پیش ہوئی۔ ظاہرا تو کتاب بہت اچھی تھی۔ لیکن جب میں فرصت کے لمحوں میں اُس کو پڑھنے بیٹھا۔ تو جا بجا اس میں کتابت کی غلطیاں نظر آئیں یہ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا۔ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ شاید غزل جس مقام پر کہی جاتی ہے، وہیں ٹھیک طرح پر پڑھی بھی جا سکتی ہے۔ دوسری جگہ کی آب و ہوا اس کے موافق نہیں آتی۔ مگر میرے چند دوست احباب نے مجھ سے کہا کہ آپ لکھتے بھی تو بااوقات ایسا ہیں کہ کچھ کا کچھ پڑھ جانا پڑھنے والے کے لئے مشکل نہیں۔ یہاں پڑھنے والے آپ سے پوچھ لیا کرتے تھے، وہاں غریب آپ کو کہاں پاتے۔

میں نے لوگوں کے اس کہنے کو نہ اُس وقت مانا اور نہ اب ماننے کو طیار ہوں۔ میں برابر اپنی تحریر کو صاف پڑھ لیتا ہوں مجھ کو ایک بھی موقع ایسا نہیں یاد ہے جب میں نے اپنا لکھا ہوا نہ پڑھ دیا ہو اور یہ کہہ کر ٹال دیا ہو کہ بہت دنوں کی بات ہے اب یاد نہیں پڑتا کہ کیا لکھا تھا۔ جیسا کہ میرے ایک دوست نے جو کننگ کالج لکھنؤ میں طالب علم تھے ایک مرتبہ فارسی کے پروفیسر صاحب سے کہہ دیا تھا جنھوں نے ان کی امتحان کی کاپی میں سرمغزی کے بعد کئی جگہ نشانات لگا دئیے

تھے کہ خود طالب علم سے پوچھیں گے۔ جب پروفیسر صاحب نے پہلے ہی نشان کی بابت دریافت کیا کہ "دیکھو یہ تم نے کیا لکھا ہے۔ بیٹے تم شاید خطوط نویسی نہیں دیکھا"۔ آپ نے اپنی تحریر کو پہلے میز پر رکھے ہی رکھے پڑھنے کی کوشش کی۔ جب اسمیں ناکامیابی ہوئی تو اُس کو اُٹھا کر آنکھوں کے پاس لائے۔ جب پھر بھی کام چلتا نظر نہ آیا تو اسے نظروں سے ہٹا کر لگے آپ حافظہ پر زور دینے۔ پھر تو پروفیسر صاحب جو اُن کی طرف تاکتے تاکتے عاجز آگئے تھے بگڑ کھڑے ہوئے اور بولے کہ یہ کیا حرکت ہے سوچتے کیا ہو۔ پڑھتے ہو کہ سوچتے ہو؟ آپ نے کس مزے سے فرمایا کہ "بہت دنوں کی بات ہو گئی یاد نہیں پڑتا کیا لکھا تھا" اسوقت پروفیسر صاحب کو غالباً پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ لکھنے والے سے اُس کی تحریر اُسی وقت تک پڑھائی جا سکتی ہے۔ جبتک جو اُس نے لکھا تھا۔ اُس کے ذہن میں محفوظ ہے اس کے بعد پڑھانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔

چونکہ اکثر لوگ مجھ سے میرا لکھا ہوا پڑھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس لئے اتنا تو مجھ کو باوجود میری ہٹ دھرمی کے ماننے کے لئے مجبور ہونا پڑیگا کہ میں خوش خط نہیں ہوں۔ لیکن اصلی قصور وارانِ کتابت کی غلطیوں کے وہی لوگ ہیں جنھوں نے جو جی میں آیا پڑھ پڑھ کے کتاب میں غلطیوں کی جابجا ڈاک سی بٹھادی ہے اس وقت تقسیم ذمہ داری کی بحث نہیں اس لئے اس مسئلہ کو بلا اس بات کے مانے ہوئے کہ میرا بھی اس ذمہ داری میں کوئی حصہ ہے۔ خارج از بحث سمجھتا ہوں۔

جب میں نے یہ غلطیاں دیکھیں تو مجھ کو سخت افسوس ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس حالت میں پبلک کے سامنے یہ کتاب پیش کی جائے یا نہیں؟ چنانچہ پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کی اشاعت ملتوی کرادی جو ہنوز ملتوی ہے ایک کاپی میں نے علامہ سیماب صاحب اکبرآبادی کے پاس بھیجی۔ اُنھوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔ ابھی میں اپنی اس کتاب کے متعلق آخری رائے قائم کر سکا تھا کہ علامہ سیماب صاحب کو ایک شاعرے کی تقریب میں جو میرے غریب خانہ پر جون ۱۹۳۵ء میں منعقد ہوا تھا تشریف آوری کا موقع ہوا۔ اُنھوں نے اثنائے گفتگو میں مجھ سے کہا کہ اب نوبت جو یہاں تک پہونچ گئی ہے تو میری رائے میں تم کچھ غزلیات اور کہہ لو اور کچھ اس کتاب میں سے لیکر دوسری کتاب شایع کردو۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ میرا یہ حال ہوا۔ کہ "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"۔ جس مصیبت کو میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں نے تمام عمر کے لئے خیرباد کہہ دیا ہے وہ پھر میری بدقسمتی و بیکسی پر میرے سامنے مسکراتی ہوئی نظر آنے لگی۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ میرے امکان سے باہر ہے۔ جو مصیبت کے دن مجھ پر گذر گئے ہیں اُن کو واپس بلانے

کے لئے مجھ کو مجبور نہ کیجئے انھوں نے فرمایا کہ اب آپ کو اُس رفتار سے غزل کہنے کی ضرورت نہیں صرف ۵۰۔۶۰ غزلیں چاہئیں۔ اُن کو سال بھر کے عرصے میں بہ اطمینان کہہ لیجئے۔ آئندہ سال کتاب شایع ہو جائے گی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ابھی آپ میری طبیعت سے واقف نہیں، میں ایک مرتبہ بھگت چکا ہوں۔ جب ایک مرتبہ میں غزلیں کہنے کا تہیہ کر لیتا ہوں تو مجھ پر شاعری کا بھوت سوار ہو جاتا ہے اور جو تعداد غزلوں کی آپ اس وقت نہایت اطمینان سے مجھ کو ایک سال میں کہنے کے لئے تجویز کر رہے ہیں اس کو میری جلد باز طبیعت (بلا لحاظ میری تندرستی کے) مجھ کو قلیل سے قلیل مدت میں ختم کر دینے کے لئے مجبور کر دیگی اور پھر میرا وہی حال ہوگا جو ابھی حال ہی میں ہو چکا ہے اور جس کی یاد سے ابتک میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے ہر چند اُن سے اپنا دُکھڑا رویا مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور کہا کہ اگر تم کوشش کروگے تو اپنی طبیعت کو بہ آسانی روکے ہوئے غزلیں کہہ سکتے ہو۔

جب میں نے سمجھ لیا کہ ابھی کم سے کم ایک اور دَورِ شاعری میری قسمت میں لکھا ہے تو طوعاً و کرہاً راضی ہوا میں نے اُن سے کہا کہ پہلی کتاب والی غزلیں بیخودؔ صاحب نے نہایت فراخدلی سے دیکھنے کا وعدہ کیا تھا اور سادی فراخدلی سے اُس کو پورا بھی کر دکھایا۔ وہ یہیں موجود تھے بہ آسانی کام ہو جاتا تھا۔ میری طرح سے وہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ اب اس مصیبت سے اُن کو دوچار نہ ہونا پڑیگا۔ میں تو خیر آپ کی تعمیلِ ارشاد میں پھر سے یہ مصیبت اپنے سر لینے کو تیار ہوں مگر اُن سے کس مُنہ سے کہونگا کہ آپ بھی اپنی مصیبتِ رفتہ کو پھر سے نوید دیجئے۔ علاّمہ صاحب نے بے ساختہ مجھ سے فرمایا کہ تم کو اس تشویش کی قطعی ضرورت نہیں، اگر تم چاہو تو میں اُسی فراخدلی سے یہ کام اپنے سر لے سکتا ہوں، تم بلا تامل غزل کہہ کر میرے پاس بھیجدیا کرو۔ میں فوراً غزل دیکھکر واپس کر دیا کرونگا انشاء اللہ تم کو اس بات کا احساس بھی نہ ہونے دونگا کہ غزل دیکھنے والا کوئی مقامی شخص ہے یا باہر کا۔ میں اپنی طبیعت کی روش سے چونکہ واقف تھا۔ اس لئے میں نے اُن سے کہا کہ ابھی آپ میری رفتارِ طبیعت سے واقف نہیں اگر اس کمبخت نے پھر وہی طوفان میل والی رفتار اختیار کی تو یا تو جو کچھ اسوقت آپ لاعلمی کی وجہ سے فرما رہے ہیں اُس سے قاصر رہیں گے اور یا اپنے کہے پر افسوس کرینگے۔ اُنھوں نے فوراً کہا نشترؔ صاحب یہ آپ کیا فرماتے ہیں ان میں سے کوئی بات نہ ہوگی۔ اگر آپ غزل کہنے میں تیز رفتار ہیں تو غزل دیکھنے میں آپ انشاء اللہ مجھکو بھی کچھ کم تیز رفتار نہ پائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ علاّمہ سیمابؔ صاحب نے فرمایا تھا اُس کو انھوں نے حرف حرف

سچ کر دکھایا اور اپنے وعدے کو اس خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے پورا کیا کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں پوری طرح پر اُنکا شکریہ ادا کر سکوں۔ دوسرے روز وہ میرے یہاں اور قیام فرما رہے۔ وہ دن اُنکا، کلام سُننے میں صرف ہوگیا۔ ۹ بجے رات کی گاڑی سے اُن کو بھیجکر مکان جو واپس آیا تو میری طبیعت نے اپنے پُرانے کرشمے دکھانے شروع کر دیئے۔ اُن کے اثنائے قیام میں میرے دوستوں نے اُن سے کہا تھا کہ میں "دل" "قاتل" "بسمل" کے قوافی پر غزلیں اچھی کہتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تین غزلیں "دل" کے قافیہ کی سنائیں "ایک دل نہ تھی" دوسری "دل دیکھکر" تیسری "دل ہو جائے" غالبًا علامہ صاحب بعدِ واپسی سفر تکانِ سفر سے پوری طرح آسودہ بھی ہوئے ہونگے کہ تینوں غزلیں اُن کے پاس پہونچ گئی ہونگی۔ پھر تو غزلوں کا تانتہ لگ گیا اور علامہ صاحب نے بھی کمال کر دکھایا کہ میں نے آج غزل بھیجی کل اُن کے پاس بعد دوپہر کسی وقت پہونچی اور اُنھوں نے اسیوقت دیکھکر حوالۂ ڈاک کر دی۔ اور تیسرے روز شام کو غزلیں میرے ہاتھ میں موجود۔ مجھ کو بہت کم موقعے ایسے یاد ہیں کہ جب بلا کسی خاص وجہ کے میری غزلیں اس سے زیادہ وقفے کے بعد مجھکو ملی ہوں۔

ایک واقعہ میں اسکے متعلق بغیر لکھے ہوئے نہیں رہ سکتا۔ ایک مرتبہ آپ نے غزلوں کی واپسی پر خط میں لکھا کہ آپکے خط کے جواب کیوجہ سے عصر کی نماز میں دیر ہو گئی۔ مجھ کو یہ پڑھکر افسوس ہوا اور میں نے فورًا اُن کو لکھا کہ آپ تمام بنی نوع انسان پر تو مجھ کو فوقیت دیتے ہی تھے اب آپ میری آڑ پکڑ کر خدا پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگے۔ اللہ اِس گناہِ کبیرہ سے بچائے۔ غزل پہنچنے میں ایک آدھ روز کی دیر ہو جاتی تو کون آفت آ جاتی؟ آپ نے اسکے جواب میں لکھا کہ "نشتر صاحب بات یہ ہے کہ اکثر جب آپکا خط ملتا ہے۔ اُس کے کچھ ہی دیر بعد عصر کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے اور وہی وقت کمبخت ڈاک کا ہوتا ہے اگر ذرا تساہلی خط بھجوانے میں ہو جائے تو خط ایک روز کو گیا۔ اس کے نیچے آپ نے یہ شعر لکھدیا ؎

مجھے شرع سے کوئی ضد نہیں پھر اس اتفاق کو کیا کروں
کہ جو وقت بادہ کشی کا ہو وہ ہی عینِ وقتِ نماز ہو

اس شعر نے مجھے پھڑکا دیا۔ آج دو سال کا عرصہ ہو گیا۔ یہ شعر مجھکو بھلائے نہیں بھولتا۔ نقش کالحجر ہو کر رہ گیا ہے۔ شعر خود بھی مزیدار تھا اور اسپر اس کمبخت نے صورتِ حال کا کچھ ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ مجھ کو ہر طرف فضا میں ہی شعر نظر آنے لگا جب اس سے اسطرح پیچھا چھوٹنا مشکل ہو گیا تو میں نے اسی غزل کہنی شروع کر دی۔ غزل لکھکر ڈاک میں ڈالدی جب کہیں اسکے اثرات سے جان بچی۔

غزلیں اسطرح برابر ہوتی گئیں۔ آخر کار جب انکا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ جو غزلیں اسطرح کہی گئی تھیں وہ بجائے خود ایک کتاب کے لئے کافی سے زیادہ تھیں پہلی کتاب سے غزل لینے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ بلکہ انھیں غزلوں میں سے متعدد غزلیں (بلا اپنی کسی تقصیر کے) محروم اشاعت رہ گئیں۔ چونکہ پہلی کتاب سے دست بُرد کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے انشاء اللہ اس کتاب کے طبع ہونے تک اُس کتاب کی اشاعت کی بھی اجازت، اسکے متعلق چند امور پر غور کرنے کے بعد دیدونگا۔ کیونکہ "میں کب سے شاعر ہوں"، "کس قسم کا شاعر ہوں" اور "آیا شاعر ہوں یا نہیں"، "کس طرح پر میں ہمیشہ شاعری سے اپنا پیچھا چھڑاتا رہا اور کس طرح شاعری ہمیشہ میرے پیچھے پڑی رہی" "کیا کیا ذکیں شاعری نے مجھکو دیں اور کیا کیا ذکیں شاعری نے میرے ہاتھوں اُٹھائیں" یہ سب باتیں اس کتاب کے دیباچہ میں مفصل طور پر درج ہیں جنکی تشریح یہاں ناممکن ہے تاوقتیکہ وہ سب واقعات پھر نہ دہرائے جائیں جو نہ ممکن ہے نہ مناسب۔ اسکی اشاعت ہو جانے سے پبلک میری رام کہانی سے محروم نہ رہیگی اور میری محنت بھی اکارت نہ جائیگی۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے ناظرین کو واضح ہو گیا ہوگا کہ میری یہ کتاب صرف انھیں غزلیات کا مجموعہ ہے جو میں نے جون ۱۹۳۵ء لغایتہ جون ۱۹۳۶ء کہی ہیں۔ بیشتر غزلیات انمیں سے ایسی ہیں جو روزانہ ایک غزل کے اوسط سے کہی گئی ہیں جس طرح پہلی کتاب کی کوئی غزل ایک جگہ ٹھیکر اور خیالات مجتمع کرکے نہیں کہی گئی وہ ہی کیفیت اس کتاب کی غزلیات کی ہوئی۔ نہ مجھکو جب اس کیلئے وقت تھا نہ خدا کے فضل سے اب ملا اگر مجھ کو اس کے لئے قطعی افسوس نہیں ہے بلکہ میں خداوند کریم کا شکر گذار ہوں

کچھ احباب کا یہ خیال ہے کہ اگر کچھ ٹھہر کر اور ایک جگہ بیٹھکر میں غزل کہا کروں تو نسبتاً اچھی کہوں اور کچھ احباب کا یہ ایمان ہے کہ میری افتادِ طبیعت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ میں یونہی چلتے پھرتے غزلیں کہہ سکتا ہوں۔ اگر اس کے برعکس طریقہ پر غزل کہنے کی کوشش کروں تو بجائے نسبتاً اچھی غزل کہنے کے خراب کہہ گذروں۔ دراصل میرے دلمیں بھی یہی اندیشہ ہے جو آخرالذکر طبقۂ احباب کو ہے اور اسی لئے میں نے کبھی اول الذکر احباب کے اشائے پر فکر کرنے کی جرات نہیں کی۔ ابھی بہت کچھ لوگوں کی نظروں میں اونچا ہوں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں اس سے بہتر غزل کہنے کی قابلیت موجود ہے۔ اگر میں نے ایکمرتبہ بھی اُنکے طریقہ پر غزل کہی اور اسمیں کوئی خاص بات نظر نہ آئی، تو میں کہیں کا نہ رہا۔ بھرم خدا نہ کرے کسی کا کھلے۔ اور پھر علاوہ اس کے میں اپنے ان دوستوں کا وہ دلخوش کن خیال جو وہ میری طرف سے قائم کئے ہوئے ہیں مٹانے والا کون؟

جسطرح پر یہ غزلیں کہی گئی ہیں اس کا ملحوظ نظر رکھنا ناظرین کو میرے کلام کی ٹھیک قیمت تشخیص کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے ورنہ جیسا کہ میں پہلی کتاب میں بھی لکھ چکا ہوں ناظرین اپنی دل شکنی کے خود ہی ذمہ دار ہونگے۔

میں پہلی کتاب کے دیباچہ میں لکھ چکا تھا کہ دوسری کتاب اب میری زندگی میں شایع ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ روزمرہ دیکھا جاتا ہے انسان کا کیا کچھ نہیں ہو سکتا، خدا جو چاہے کرے۔ مجھکو اسوقت کیا خبر تھی کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ اسقدر قریب مستقبل میں غلط ثابت ہو جائیگا اور اسی لئے میں ابکی مرتبہ اپنے مستقبل شاعری کے متعلق عمداً سکوت اختیار کرتا ہوں اور پہلی مرتبہ کی غلطی سے سبق لیکر اب کی بار خدائے برتر پر چھوڑتا ہوں۔ جو وہ میری شاعری کے متعلق مناسب سمجھیگا اور کریگا وہی ہوگا۔

میں بدترین قسم کی ناشکر گذاری کا مستوجب ہونگا اگر میں اپنی یہ تحریر بلا اس بات کو معرضِ تحریر میں لائے ہوئے ختم کردوں کہ اگر علامہ سیماب صاحب میرے کلام پر وقتاً فوقتاً اور غزلیات کے اشعار پر صدائے آفریں بلند نہ فرماتے رہتے تو میرے شوق کو قدم قدم پر سست ہو جانے کا اندیشہ تھا اور اس کتاب کا تکمیل کو پہونچنا ناممکن تھا بسا اوقات آپنے میری پوری غزل کی مجموعی حیثیت میں تعریف کی ہے اور اسمیں جن الفاظ استعمال کئے ہیں انھوں نے کسطرح میری طبیعت بڑہائی ہے اُسکو حیطۂ تحریر میں لاکر یہ ظاہر کرنے سے کہ انکا حیطۂ تحریر میں آنا ممکن ہے میں اُن الفاظ کی اور اپنے جذبات کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ میرے سودے والی بیاض میں حرف بحرف انکے تمام کلماتِ آفریں موجود ہیں جو میرے لئے مایۂ ناز ہیں اور جنکو میں وقتاً فوقتاً دیکھکر اپنا جی خوش کر لیتا ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ مجھکو اپنے کلام سے جو کچھ خوشی حاصل ہونے کو تھی وہ ہو چکی ہے۔ کاش علامہ صاحب اپنے یہ خیالات "مقدمہ" کے لئے محفوظ رکھتے تو میں اپنی کتاب چھپنے کی اچھوتی خوشی بھی منا لیتا لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اگر وہ اس معاملے میں خاموش ہو جاتے تو میرے سمندِ شوق کے لئے تازیانے کہاں سے آتے اور کہاں سے یہ کتاب پوری ہوتی؟

آخر میں، میں مولوی عبدالرزاق صاحب بیخود دسہرامی وکیل اورئی و حکیم عبدالرب صاحب رئیس بارہ بنکوی میونسپل طبیب و سکرٹری مشاعرہ کمیٹی اورئی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس تمام زمانے میں میری غزلیات بالعموم قبل روانگی آگرہ و بسا اوقات بعد واپسی آگرہ سُن سُن کر میری ہمت افزائی فرمائی۔ علیٰ ہذا القیاس پنڈت شیونا تھ مصرا صاحب مصرا ایڈوکیٹ اورئی و مولوی عبداللطیف صاحب شیدا وکیل اورئی کا بھی ممنون ہوں۔

نشتر ہنگامی

قطعۂ تاریخ اشاعت دیوان از مولانا بیخود دسہرامی وکیل اورئی

چھپ گیا ہے کلام نشتر کا
مدح گستر ہر اک سخنور ہے

فکرِ تاریخ کس لئے بیخود
طبع کا سال "شوقِ نشتر" ہے

۱۳۵۶ ہجری

مقدمہ

(از علامہ مولانا سیماب اکبرآبادی)

ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ نشتر صاحب کا ایک دیوان، اس دیوان سے پہلے بھی شایع ہو چکا ہے۔ اس دیوان کا نام "زخمِ خنداں" تھا۔ جب اسکی ایک جلد میرے پاس پہونچی تو میں نے دیکھا کہ کاتب اور پریس نے ملکر نشتر صاحب کے پارہ ہائے جگر کو واقعی "زخمِ خنداں" بنا دیا ہے۔ کتاب کا کوئی صفحہ ایسا نہ تھا جسے دیکھکر بے اختیار ہنسنے کو جی نہ چاہتا ہو۔ ٹائٹل پر بچوں کی کتاب کے سے "گل بوٹے" جدول اور سطر بے ڈول۔ جلی قلم سے جا بجا ردیفیں لکھی ہوئی۔ دوہری جدول میں غزلیں مقید۔ ہر غزل پر قوالی کی کتابوں کی طرح اسی غزل کا ایک مصرع بطورِ عنوان قائم۔ سارا دیوان نشتر صاحب کا اور تکملہ میں بیخود صاحب کی غزلیں موجود۔ "علامہ سیماب اکبرآبادی" لکھنے کے بعد قطعہ غائب۔ غرضکہ سارا دیوان ایسی ہی بے عنوانیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور کتابت کی غلطیاں تو اسقدر تھیں کہ اگر ان کو گِنوایا جائے تو مقدمہ کے صفحات بھی شاید کافی نہ ہوں۔

میں نے یہ دیوان دیکھکر نشتر صاحب سے کہا کہ یہ زمانہ ترقی و تہذیب کا ہے۔ اردو اور اردو پریس دونوں بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ اس اسلوب سے اپنا کلام پیش کرنا کلام اور مصنف دونوں کی توہین ہے۔ اس دیوان میں بعض غزلیں اچھی بھی ہیں اور بعض بغیر انتخاب و نظرِ ثانی لکھوا دی گئی ہیں۔ اگر آپ کو عوام کے سامنے اپنا کلام پیش کرنا ہے تو ذرا اچھی طرح پیش کیجئے۔ نشتر صاحب کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ دوسرے دیوان کے لئے غزلیں بھی نئی کہی جانے لگیں اور وہی غزلیں آج "نشترکدہ" کے عنوان سے آپ کے سامنے ہیں۔

پہلی غزلیں جنابِ بیخود دہلوی کی دیکھی ہوئی تھیں۔ اور اس دیوان کی غزلوں پر تمام تر نظرِ ثانی میں نے کی ہے (نشتر صاحب اس اجمال کی وضاحت فرما چکے ہیں) میں نے دیکھا کہ نشتر صاحب میں جوہرِ قابل موجود ہے۔ اگر رہنمائی اور مشورے میں ذرا احتیاط سے کام لیا جائے تو کلامِ نشتر کا نشتر کی طرح دل نشین ہونا مشکل نہیں۔ اس لئے یہ خدمت میں نے اپنے ذمہ لے لی۔

اور باوجود اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے میں نے اُن کی رفتارِ فکر کا برابر ساتھ دیا اور اُن کے حوصلے بھی بڑھاتا رہا۔

بعض لوگ ہمیشہ نشتر صاحب کو یہ خوف دلاتے رہے ہیں کہ ذوقِ شاعری اُن کے پیشۂ وکالت پر غالب آگیا تو اس میں نقصان پہونچے گا۔ یہ خوف نشتر صاحب کے ایسا دلنشیں ہوا کہ وہ کئی بار اپنے اس ذوق کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوگئے مگر میں اُنھیں برابر اُبھارتا رہا۔ تاآنکہ یہ مجموعہ صورت پذیر ہوگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ڈاکٹر سر اقبال بیرسٹر ہوتے ہوئے شاعری کرسکتے ہیں، اور شاعرِ عصر بن سکتے ہیں۔ اور جسٹس سر محمد سلیمان، اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ ماہرِ فلسفہ ہی نہیں بلکہ مجددِ فلسفہ بن سکتے ہیں تو پھر ایک وکیل، اپنے پیشۂ وکالت کے ساتھ اِس ذوقِ لطیف کو کیوں جاری نہیں رکھ سکتا؟

اس تخویفِ بے معنی کا سبب اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ نشتر صاحب کی بڑھتی ہوئی قوتِ فکر اور چڑھتے ہوئے، ذوقِ شاعری سے خود خائف ہیں کہ اگر اُن کی شاعری کی یہی رفتار رہی تو کہیں ان کے سامنے انکا چراغِ شہرت گل نہ ہو جائے۔ جب نشتر صاحب اتنا کم کہنے پر بھی اتنا زیادہ اور اتنا اچھا کہہ لیتے ہیں تو اگر انھیں فکرِ سخن کی آزادی دیدی جائے اور شاعری کو وکالت کے لئے کابوس نہ سمجھا جائے تو خدا جانے وہ کیا ستم ڈھائیں!

شاعری فنِ لطیف ہے۔ یہ فن اپنی لطافت کی وجہ سے طبیعت پر کبھی بار نہیں ہو سکتا۔ تمام فنونِ لطیفہ کا یہی حال ہے۔ میں نے بڑے بڑے وکلا اور سول افسروں کو مصوّری اور موسیقی کا دیوانہ دیکھا ہے۔ وہ اپنی فرصت کے اوقات ان خوشگوار اور لطیف اشغال میں صرف کرکے کبھی نہیں پچھتائے تو پھر نشتر صاحب کی وکالت پر شاعری غالب کیونکر آسکتی ہے؟ سید افتخار علی مضطر مرحوم شاعر بھی تھے اور وکیل بھی پھر سب جج ہو گئے۔ وہ باوجود عدالتی مصروفیات کے اکثر تجویزیں منظوم لکھتے تھے۔ رسا مرحوم وکیل بھی تھے اور شاعر بھی۔ اسی طرح اور سیکڑوں وکیل بھی ہیں اور شاعر بھی۔ شاعری جب اُنھیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی تو ایک نشتر صاحب ہی سے اُسے کیا بیر ہے کہ وہ اُن کے لئے باعثِ نقصان ثابت ہو؟

عملاً ثابت ہو گیا کہ وہ تخویف محض حاسدانہ تھی۔ اس لئے کہ آج نشتر صاحب دو دیوانوں کے مصنف بھی ہیں اور ایک کامیاب وکیل بھی۔ پھر سوال ہے بقائے نام کا۔ ایک وکیل صرف وکیل رہ کر دنیا میں اپنا نام زندہ نہیں رکھ سکتا۔ کروروں کامیاب ترین وکیل سپردِ خاک ہو گئے مگر اب کوئی انکا نام بھی نہیں لیتا۔ نشتر صاحب اپنے کلام اور کام کے ذریعے اپنے بعد بھی زندہ رہیں گے۔ تو کیا اس امتیاز و افضلیت اور اس حیاتِ دائمی و ابدی سے اُنھیں محروم کر دینا دوستی کا کوئی اچھا ثبوت ہے؟

بہرحال ان یارانِ حوصلہ شکن کی ایک نہ چلی۔ اور ریں، بتقدیر آلہی، نشتر صاحب کو آج ایک ایسے مقام پر لے آیا ہوں جہاں شہرت ہی شہرت ہے۔ عظمت ہی عظمت ہے۔ اور زندگی ہی زندگی ہے۔ یہی صرف وہ مقام ہے جو انھیں اپنے ہم پیشہ معاصرین سے ممتاز اور بلند کر رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہر شخص بغیر تائیدالٰہی کبھی نہیں پہونچ سکتا۔ اور یہی وہ مقام ہے جسے "سدرۃ الحیات" کہتے ہیں۔ جو اُسی کو ملتا ہے جس کی فکر میں جبریل کی سی قدوسیت اور الہام کی سی معصومیت ہو۔ مجھے کسی کی رہنمائی اور پیشوائی کا شوق نہیں ہے۔ لیکن ایسے طالبانِ فن اور صاحبانِ ذوق کی خدمت میں ضرور اپنا فرضِ حیات سمجھتا ہوں جن میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی استعداد دیکھ لیتا ہوں۔ اور سمجھ لیتا ہوں کہ ان کی رہنمائی یا تو ہوئی نہیں یا ہو رہی ہے تو وہ محض رسمی اور غلط ہے۔ نشتر صاحب اگر اس دیوان کے بعد "زخمِ خنداں" کی نشر و اشاعت میں کامیاب ہو گئے تو آپ خود اندازہ لگا سکیں گے کہ اگر نشتر صاحب اُسی دیوان تک رفتارِ فکر کو محدود کر کے آیندہ کے لئے اپنے دوستوں کے ارادے کے مطابق خاموش ہو جاتے تو یہ دفترِ حقائق و معارف اور یہ شیرازۂ حکایات و لطائف میں مرتب کرتا یا آپ؟

نشتر صاحب کا مذاقِ سخن کسی طرح منشی نوبت رائے نظر لکھنوی اور سرور جہاں آبادی سے کم نہیں ہے۔ اور اگر وہ نظمیں بھی کہنے لگیں تو آج ملک میں چکبست آنجہانی کی جگہ ان سے پُر ہو سکتی ہے۔

یہاں مجھے اُن کے کلام کی تحسین و تعریف منظور نہیں، لیکن میں تجزیتاً یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ نشتر صاحب کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔ جو ایک حقیقی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں وہ تغزل قدیم کے خوگر ہیں مگر ان کے اسلوبِ بیان میں ایک ایسی شگفتگی، ایک ایسی برجستگی اور ایک ایسی بالیدگی ہے کہ تغزل قدیم پر بھی غزلِ جدید کا دھوکا نہیں یقین ہونے لگتا ہے۔

قاتل۔ بسمل۔ عندلیب۔ ناصح۔ زاہد۔ قیس۔ فرہاد۔ لیلیٰ۔ شیریں، قدیم شاعری کے تمام پرانے موضوعات ان کے یہاں بھی موجود ہیں۔ لیکن انھیں موضوعات کو اُنکی طبع ایجاد پسند نئے اسالیب میں پیش کر کے ان میں نیا پن نمودار کر دیتی ہے۔

میکدہ، ساقی اور شراب کے متعلق بھی نشتر صاحب کے یہاں اشعار کی کمی نہیں۔ لیکن اس موضوع کو بھی ان کی فکرِ رسا نے بہت شائستگی اور شاعرانہ سرمستی کے ساتھ ندرت آمیز کر دیا ہے۔ بادی النظر میں ان کے اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میکشی و مے نوشی کے پرانے تجربہ کار اور ساقی کے بہت قدیم پرستار یا دوست ہیں۔ لیکن جہانتک

میرا مشاہدہ ہے، مجھے معلوم ہے کہ وہ شراب بالکل نہیں پیتے۔

عشق و محبت کے مضامین میں آپ نشتر صاحب کے یہاں بہت وارفتگی، بلندی، اور حقیقت پائیں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح جذباتِ حُسن و عشق کے محض نقال یا راوی نہیں ہیں بلکہ یہ عالم تا دیر اُن پر گذر چکا ہے اور وہ اس منزل کے فضا شناس رہرو ہیں۔ اُن کے ایسے اشعار میں اُن کی دل کی آواز بھی شامل ہے۔ اسی لئے اُن میں اثر ہے، کیف ہے، زور ہے، اور وہ سب کچھ ہے جو جذباتی و واردانی شاعری میں ہونا چاہئیے۔

سب سے بڑی خصوصیت اُن کے کلام کی یہ ہے کہ اُنکی شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جسمیں **درس و پیام** نہ ہو۔ یہ خصوصیت انھیں شعرائے متغزلین میں ممتاز، اور قدیم تغزل سے ان کے رنگِ تغزل کو علیحدہ کر دیتی ہے۔ وہ اپنے سیدھے سادے، عام فہم، اور دلنشین انداز میں ایسے ایسے حقائق و معارف بیان کر جاتے ہیں۔ جنھیں ضمیر مانتا ہے، عقل تسلیم کرتی ہے، اور دماغ جن سے متأثر ہوتا ہے۔

ایسی شاعری کی ہمارے اس دور میں بہت کمی ہے۔ حالانکہ ضرورت ایسی ہی شاعری کی ہے۔ کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں، جس پر نشتر صاحب نے اپنی رسائی فکر اور ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے نشتر زنی کر کے حقیقت کے چہرے سے نقاب نہ اُٹھایا ہو۔ مثالاً ملاحظہ فرمائیے:۔

ملنے کی اُس کے اور نہیں دوسری سبیل ۔۔۔ جبتک ہو، اپنے نقشِ خودی کو مٹائے جا

اس باغِ جہاں کے گُل بوٹے، مہماں ہیں اک دو ساعت کے ۔۔۔ اُس نقش پہ کیا مرنا اے دل، جس نقش کو باطل دیکھ لیا
جبتک حق کا ادراک نہ تھا، احساسِ باطل خاک نہ تھا ۔۔۔ جب حق کو حق محسوس کیا، باطل کو باطل دیکھ لیا
اس طرح نہیں ملتی منزل، اسطرح نہیں کٹتی مشکل ۔۔۔ تو نے ابتک رہ کر غافل، اے طالب منزل دیکھ لیا
ہے دوری منزل نقصِ طلب، ہم اپنی بیتی کہتے ہیں ۔۔۔ منزل نے دئیے خود اپنے پتے، جب طالب منزل دیکھ لیا
دشواریٔ عالم کار ستہ۔ دشوار پسندی سے کاٹا ۔۔۔ اُس کام کے پیچھے پڑ گئے ہم جس کام کو مشکل دیکھ لیا
جو چاہے کرے انساں کا دل، رحماں بھی ہے، شیطاں بھی ہے ۔۔۔ قزاق اسے ہم نے پایا، اور رہبر کامل دیکھ لیا

ایک ہی غزل اور ایک ہی زمین میں اتنے درس، اور اتنے پیام، اس بات کا ثبوت کافی ہیں کہ نشتر صاحب

کی فکرِ رسا تدبیرِ منزل، اور تہذیبِ حیات کی موشگافیوں میں بہت زیادہ قوی العمل ہے۔
اور سنئیے :۔

اس کے سوا مفر نہیں اس کے فریب سے
دُنیا کو ہر طریقہ افسانہ دیکھنا
جو کچھ گذر رہے ہیں زمانے میں واقعات
دو چار روز میں انھیں افسانہ دیکھنا

اپنی خودی کو بھول جا صبح و مسا کو بھول جا
ایک خدا کو یاد رکھ، ہر دوسرا کو بھول جا
اب جو ہے غم سے نوحہ گر، تیری خطا ہے سر بسر
کس نے کہا تھا اے بشر، اپنے خدا کو بھول جا
دارِ بقا ہے دائمی، دارِ فنا ہے عارضی
دارِ بقا پہ رکھ نظر، دارِ فنا کو بھول جا
ہے جو عطا کا ملتجی، تجھکو بھی چاہیئے یہی
جس سے ہو جب خطا کوئی، اُسکی خطا کو بھول جا

دریا میں ملا ہستی اپنی، اے قطرے پھر دریا ہو جا
آخر تو فنا ہونا ہے تجھے، پھر قبل فنا ہی فنا ہو جا
اے انساں چھوڑ خودی اپنی، اور محوِ ذاتِ خدا ہو جا
مخلوق میں پہلے یکتا تھا، مخلوق میں پھر یکتا ہو جا
غیروں کا بھروسہ کیا کرنا، اپنا ہی بھروسہ سچا ہے
صحرائے محبت میں اپنا تو آپ ہی راہ نما ہو جا

یہ پوری غزل اسی رنگ میں ہے، اور ملاحظہ فرمائیے۔

قصور آئیگا تیرے سر خطا تیری ہی ٹھہرے گی
نہیں تو کام یوں بگڑیں ترے اور کارساز ایسا!

رہنے کی یہ جگہ نہیں دُنیا حقیقتاً
زنداں سے جو نکل گیا، اچھا نکل گیا

اسے کب حقیقت کا عرفان ہوگا؟
نہ جانے کب انسان، انسان ہوگا

اے بشر ہے تری کوتاہئ ہمت ورنہ
دہر میں تیری ترقی کے ہیں میداں کیا کیا

اور سب مخلوق فطرت کے اشاروں پر چلی
جذبۂ انسانیت افسوس انساں میں نہ تھا

ہیں یہاں دشواریاں، آسانیوں کی ذمہ دار
خواہش آسانی کی ہے تو بجز مشکل میں آ

دل ہی نہیں ملتا تو خدا ہم کو ملے کیا
گھر والے کا کیا ذکر ہے، جب گھر نہیں ملتا

وہ اپنا سر نہ اُٹھائے جو بیٹھنا چاہے
جو اُٹھا بیٹھ گیا گردِ کارواں کی طرح

اُسے پائے گا تو دیوانہ بنکر
وصال اُسکا ہوتا ہے، بیگانہ بنکر

چشمِ ظاہر بند کرلو، چشمِ باطن کھول لو
اُسکا جلوہ دیکھ لو، جب چاہو پردا چھوڑ کر
کاش انساں چھوڑ دیتا زندگی ہی میں اسے
آخرِ کار ایکدن جانا ہے دُنیا چھوڑ کر
ساری دُنیا اُسکی ہے، ساری خدائی اُسکی ہے
بیٹھ جاتا ہے جو اک گوشے میں دُنیا چھوڑ کر
اے بھکاری مانگ کر اب تک تجھے کیا مل گیا
دیکھ کچھ دن لعنتِ عرضِ تمنّا چھوڑ کر

ان اشعار میں اخلاقیات کا درس و پیام کتنے مؤثر پیرائے میں دیا گیا ہے:۔

ہمدردیوں کا حال مری تھا یہ عمر بھر
مرنا سُنا کسی کا مرا دم نکل گیا

قناعت نہ دلمیں سمائیگی جب تک
یہ ارمان ہوگا وہ ارمان ہوگا

میں نے یوں قائم کیا تھا رشتۂ انسانیت
چاک دامن میں کسی کے تھا، مرے دامن میں تھا

میں تو انساں، اُسی انساں کو ہمیشہ سمجھا   کام پڑنے پہ بھی انسان، جو انساں نکلا

دولت کے تونگر تو ہیں دُنیا میں ہزاروں   افسوس کوئی دل کا تونگر نہیں ملتا

کیا قیامت ہے، مُسلماں کو ہے ہندو سے گریز   اور ہندو نہیں جاتا ہے مُسلماں کے قریب

زباں اُسی کی ہے، بیشک زباں اُسی کی ہے   زبان رکھ کے گذا لے جو بے زباں کی طرح
میانہ رَو رہے، دُنیا میں عمر بھر نشتر   نہ ہم زمیں کی طرح تھے نہ آسماں کی طرح

اس تنِ خاکی سے کر لے خدمتِ اہلِ جہاں   پھر ہے کس مصرف کی مٹی رائیگاں ہونے کے بعد

بندہ ہوں قناعت کا، مجھے ان سے نہیں کام   اب حرص و ہوا سے کہو دیکھیں کوئی گھر اور

زبان اور محاورات کی سادگی کے ساتھ متانت، بلندی، اور شکوہ بھی نشتر صاحب کے کلام میں جا بجا پایا جاتا ہے:-

مجھ سا غم دوست زمانے میں نہ ہوگا کوئی   غم کبھی موجبِ افسردگیٔ دل نہ ہوا

افسوس سراغِ رہِ منزل نہیں ملتا   رہبر کوئی تقلید کے قابل نہیں ملتا

شراب پی کے بھی مستِ شراب ہو نہ سکا   رہینِ منّتِ کیفِ شباب ہو نہ سکا

جبتک یہ خرابِ غمِ جاناں نہ ہوا تھا   دل میرا غمِ عشق کے شایاں نہ ہوا تھا

جبتک تھی تری چشمِ کرم ظرف پہ میرے — میں شاکیِ کوتاہیِٔ داماں نہ ہوا تھا
ذہنیتِ ناقص نے کیا مایلِ تخریب — انسان مکمل ابھی انساں نہ ہوا تھا
اُسوقت سے ہمرازِ گل و لالہ ہوں نشتر — جو وقت گلستاں بھی گلستاں نہ ہوا تھا

آخر مری قناعتِ طوفاں فریب نے — ساحل کو بحر، بحر کو ساحل بنادیا

اے فصلِ خزاں تو نے دکھایا مجھے یہ دن — گلشن مجھے ہم معنیِٔ صحرا نہ ہوا تھا
تھی لذتِ دیدار میں محویّتِ کامل — بے ہوش میں ہنگامِ تماشا نہ ہوا تھا

کیا شعلۂ فریاد کو حاصل ہوئی معراج؟ — کیوں آج سراغِ مہ و اختر نہیں ملتا
باور جو کسی کا ہے اُسے وعدہ باطل — پھر آج مزاجِ دلِ مضطر نہیں ملتا

نشتر صاحب کے یہ اشعار ان کے مشرب اور عالمگیر مذہب پر روشنی ڈالتے ہیں:-

کعبے سے دوستی نہ کلیسا سے دشمنی — ہم جس ڈگر پہ چلنے لگے کام چل گیا

تھے راستے میں اس لئے ٹھہرا ہوا ذرا میں — دیر اور حرم کو مری منزل نہ سمجھنا

آپ کو ایسے اشعار اس دیوان میں جا بجا ملیں گے۔ جس سے نشتر صاحب کا مشربِ بلند واضح ہوتا ہے۔

عبرت و نصیحت کا سامان ان اشعار میں کس فراوانی کے ساتھ جمع کیا گیا ہے:-

اب وہ پڑے ہوئے ہیں زمیں میں دبے ہوئے — احساں بھی جنکی خاطرِ نازک پہ بار تھا

کچھ مجھے آتا تھا رونا، کچھ ہنسی انسان پر — ڈون کی لیتا تھا، گو صرف ایک مشت خاک تھا
کیوں کسی کی موت پر آخر یہ شیون یہ بکا — خاک میں ملنے سے پہلے بھی یہ انساں خاک تھا

جہاں اونچے اونچے محل دیکھتے ہو　　وہاں ایک دن صاف میدان ہوگا

کسی کی موت پہ رو دیتی ہے کائنات تمام　　کسی کو بعدِ فنا نوحہ خواں نہیں ملتا

تھا یہ دُنیا کا تعلق صرف کُنجِ گور تک　　اس سے آگے ساتھ پھر اپنا نہ بیگانہ گیا

پوشاک چاہیے تھی جنہیں روز اک نئی　　مرنے پر اُنکا کام کفن سے نکل گیا

اک روز وہ آئیگا کہ مٹ جائیگی دُنیا　　باقی فقط افسانہ ہی افسانہ رہیگا
انسان سمجھنے کو سمجھتا رہے کچھ بھی　　افسانہ تھا، افسانہ ہے، افسانہ رہیگا

خدا کرے کہ خدا کا کسی پہ قہر نہ ہو　　زمین پھٹنے لگتی ہے آسماں کی طرح

میر تقی میر کے بہتر نشتروں میں نشتر صاحب کے اگر یہ نشتر بھی ملا دیئے جائیں تو کیا کوئی تمیز کر سکتا ہے؟

اس حسن کی محفل میں ایسے بھی دن آتے ہیں　　جب شمع تو ہوتی ہے پروانہ نہیں ہوتا

کچھ رنگ اور ہی ہے دلِ بیقرار کا　　کیا پھر قریب آگیا موسم بہار کا؟
دامانِ آستین کے رفو ہو سکے نہ چاک　　پھر آگیا قریب زمانہ بہار کا

ایک دن کی بات ہو تو شوق سے رہ بیقرار　　پھر نہ رات آئیگی اے دل پھر نہ ہوگی شام کیا
زندگی جسطرح بھی کٹ جائے نشتر ٹھیک ہے　　چار دن کی بات ہے، تکلیف کیا آرام کیا!

اللہ محبت کی وہ میٹھی مری نیندیں! جب خواب مرا خواب پریشاں نہ ہوا تھا

اللہ محبت کے وہ دن رات کہاں ہیں تنہائی میں بھی میں کبھی تنہا نہ ہوا تھا

چارہ گر جس درد کی تونے ابھی کی تھی دوا وہ تو پھر ہونے لگا ظالم وہیں دل کے قریب

نشتر صاحب کا ایک خاص سلوبِ بیان اور بھی ہے۔ جسمیں وہ صاحبِ طرز کہلانے کے مستحق ہیں۔ اپنے اس انداز پر وہ بلاشرکتِ غیرے قابض و دخیل ہیں۔ جو کم از کم مجھے بہت پسند ہے :۔

کوئی ابھی ابھی ہمیں دیوانہ کر گیا یہ بھی نہ دیکھہ پائے کہ ظالم کدھر گیا

آدمی ہوتا ہے جب زندانِ ہستی میں اسیر پوچھئے وہ کون موقع ہے مبارکباد کا؟

جہاں قرار ہمارا ایسا ہے لے ظالم وہاں یہ دل بھی (جو ہے بیقرار) لیتا جا

میں نے صرف چند ردیفوں سے یہ اشعار چُنے ہیں۔ پورے دیوان میں ایسے سینکڑوں اشعار ہیں اور کوئی غزل ایسی نہیں جس میں درس و پیام، اخلاقیات، عبرت و نصیحت اور عرفان و ایقان کے مضامین نہ ملیں۔ دیوان کے مطالعے سے میرے اس بیان کی تائید ہو جائے گی۔

نشتر صاحب کے اسلوبِ فکر میں ایک یہ بات بھی مخصوص ہے کہ وہ جس زمین میں قلم اُٹھاتے ہیں۔ اُسے قطعاً پامال کر ڈالتے ہیں۔ اور دوسروں کے لئے گنجائشِ فکر نہیں چھوڑتے اُنکا دستور یہ ہے کہ وہ ایک ایک قافیے کو بار بار لکھتے ہیں۔ اور اسوقت تک قافیہ کی جان نہیں چھوڑتے جبتک اسے بے روح نہیں کر دیتے۔ مثلاً "نظر کہیں۔ اثر کہیں" اُنکی ایک غزل ہے۔ اُسمیں "نظر" کے قافیے میں ایک پوری اور سیر غزل لکھ ڈالی ہے اور "سحر" کا قافیہ دوسری غزل میں ۱۱ مرتبہ لکھا ہے۔ غور کیجئے ۱۱ مرتبہ جس قافیہ کو فکر کے شکنجے میں کسا جائے۔ اُسمیں کیا

جان باقی رہ سکتی ہے؟

یہی حال اور غزلوں میں بھی ہے۔ جب تک قافیہ نئے نئے خیالات پیدا کرتا رہتا ہے نشتر صاحب اُسے تختۂ مشق بنائے رہتے ہیں اور جب وہ بے روح ہو کر اپنی تخلیقی قوتوں سے محروم ہو جاتا ہے تو اُسے رہائی مل جاتی ہے۔

نشتر صاحب کے کلام میں قدیم و جدید دونوں قسم کا مذاقِ تغزل پایا جاتا ہے۔ غزل کا گلدستہ مختلف رنگ و بُو کے پھولوں سے جیسا وہ سجاتے ہیں ہر شخص نہیں سجا سکتا۔ ایک ہی غزل میں کہیں عشق و محبت کا فلسفہ اور تجربہ ہے۔ کہیں معرفتِ الٰہی ہے کہیں شراب کے شوخ مضامین ہیں۔ کہیں منزل اور جادۂ منزل پر تبصرہ ہے۔ کہیں حُسن و وفا کا ذکر ہے۔ کہیں عبرت کے مناظر ہیں۔ کہیں حقیقت کے مظاہر۔ کہیں فلسفہ ہے کہیں تصوف ہے۔

پھر کلام میں کہیں گنجلک اور پیچیدگی نہیں ہوتی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شعر سانچے میں ڈھال کر نکالا گیا ہے۔

جنکو اصرار ہے مجھ سے کہ نہ دوں جان اپنی — وہ ہی جینے کی بتا دیں کوئی صورت مجھکو
مجھ سے دُنیا کا کوئی ذکر نہ اللہ کرے — خوب معلوم ہے دُنیا کی حقیقت مجھکو
تم جو کچھ روز دکھاتے نہیں صورت اپنی — زندگی کی نظر آتی نہیں صورت مجھکو
غم سے گھبراؤں محبت میں تو کیوں گھبراؤں — رفتہ رفتہ یونہی ہو جائیگی عادت مجھکو

اسی طرح ہر غزل اور غزل کا ہر شعر صاف ستھری، عام فہم زبان میں ہوتا ہے۔

باوجود احتجاج و انتباہ، ہندوستان کے ۵۰ فیصدی شعرا آج تک اُسی قدیم رنگِ تغزل کے دیوانے ہیں، جو اب اپنے محدود موضوعات کی طرح فرسودہ اور کہنہ ہو چکا ہے۔ اُنھیں پرانے برتنوں پر قلعی ہو رہی ہے جو کبھی ظرف شناسانِ سخن نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے بنائے تھے اور جو آج سے دو سو ڈھائی سو برس پہلے قابلِ رواج سمجھے جاتے تھے۔ ایسے قدامت پسندوں کو نشتر صاحب کے کلام سے سبق لینا چاہئے کہ نشتر صاحب نے اُسی قدیم روش و اسلوب میں بھی اپنی دلنشیں طرزِ نگارش سے بحدِ کافی نیا پن پیدا کر دیا ہے۔ کم سے کم اتنا مذاقِ تجدید تو ہو۔

نشتر صاحب کے کلام میں موسیقی بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً بڑی بحروں میں انھوں نے جتنی غزلیں مسجع یا غیر مسجع کہی ہیں، سب کا اسلوب نہایت دلکش ہے۔ شاید اس لئے کہ انھیں موسیقی سے بھی لگاؤ ہے۔ اور اگر وہ خود اچھا نہیں گا سکتے (غالباً) تو گانے کے اُتار چڑھاؤ اور گانے کے قابل غزلوں کے تناسبِ الفاظ سے وہ (یقیناً)

اچھی طرح واقف ہیں۔ اس آگاہی اور مہارت نے اُن کے کلام میں زیادہ سے زیادہ جراحت آفرینی پیدا کر دی ہے۔

اسقدر مشقِ سخن اور سیر گوئی کے بعد نشتر صاحب کو حق پہونچتا ہے کہ وہ دوسرے اربابِ ذوق کی بھی رہنمائی کریں۔ اور جس شاہراہ پر خود گام زن ہیں اُسکے راستے اُن لوگوں کے لئے بھی آسان کر دیں جو اُن کے گرد و پیش بھٹک رہے ہیں۔ اور نشتر صاحب کو بھی اُن کے مقامِ بلند سے اپنی پستیوں میں کھینچنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

شعر کی تعریف میں، مَیں شاعروں کی رسمی، فرضی، وقتی، اور ہنگامی واہ واہ کا قائل نہیں ہوں۔ شاعرے میں تو ہر شعر پر سر ملتے ہیں اور زبان کی جنبش سے جو الفاظ بنتے ہیں وہ قریب قریب تحسینی ہی ہوتے ہیں۔ شعر کو کاغذ پر دیکھنا چاہیے۔ جہاں اُسکی تمام چولیں نگاہِ تنقید کے سامنے ہوتی ہیں۔ اور از اول تا آخر شعر پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اس معیار سے جب ہم نشتر صاحب کا کلام کاغذ پر دیکھتے ہیں تو ہمیں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ الفاظ کا صحیح محلِ استعمال۔ محاوروں کی صحت، فصاحت کا رکھ رکھاؤ۔ علمِ کلام کے مظاہرے۔ زبان کی گھلاوٹ۔ فکر کی تازگی۔ طبیعت کی روانی۔ ذہن کا کشاد۔ مشق کی گنگی۔ فکر کا سلجھاؤ۔ جذبات کی فراوانی۔ بیان کی عذوبت یکسانی۔ سلاست۔ حلاوت۔ ہمواری۔ چستی۔ بلندی۔ اور شگفتگی ہر شعر سے مترشح نظر آتی ہے۔ سماعت ان تمام خصوصیات پر بیک وقت غالب نہیں ہو سکتی۔ شعر کا اصلی جوہر اور وجدانی روپ کاغذ ہی پر نظر آتا ہے۔

میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ نشتر صاحب کے کلام کی تعریف کروں۔ اس لئے کہ وہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی اُن کے کلام سے اکثر متاثر ہوتا رہا ہوں۔ اور اُن کے بعض اشعار میں نے کئی کئی بار پڑھے ہیں۔ کاش وہ میرے ذہن میں محفوظ ہوتے اور میں اپنے معیار کے کچھ اشعار بھی اُن کے کلام سے آپ کے سامنے پیش کر سکتا۔

مگر وہ تمام اشعار آپ کو اسی دیوان میں کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔ اور آپ بھی اُن سے میری طرح اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔

میں نشتر صاحب کو اُن کے اس دیوان کی طباعت و اشاعت پر صمیمِ قلب مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ وہ اس کے بعد بھی اپنا دوسرا اور تیسرا دیوان چھپوائیں۔ تاکہ ان کے کلام کی تدریجی ترقیاں دنیائے ادب کے پیشِ نگاہ رہیں۔ اور دنیا گواہ رہے کہ ایک وکیل جب ادبی جرح و تنقیح کا بھی ماہر ہوتا ہے تو

زندگی کا کوئی بڑے سے بڑا اور اہم سے اہم پہلو بھی ایسا نہیں رہتا جو اُس کی نظر و بحث سے محفوظ رہ جائے۔ پھر معمولی مقدمات کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

میرے خیال میں اگر وکیل، شاعر بھی ہو تو وہ وارداتِ مقدمہ اور رودادِ استغاثہ کے جزئیات ایک وکیلِ محض سے زیادہ سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ اُس کی نظر وسیع، فکر بلند اور ذہن رسا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی اور سماجی معاملات کو نسبتاً زیادہ آسانی سے اور مقابلتاً زیادہ اچھی طرح سلجھا سکتا ہے۔ اس کا دماغ فکر کی پیچیدگیاں سلجھانے کا عادی ہوتا ہے۔ اور وہ ہر اہم اور عظیم معاملے کو بھی اپنی ذہنی و فکری شعریت کے سانچے میں ڈھالکر زمینِ شعر کی طرح نرم و ہموار کر سکتا ہے۔

کاش غیر شاعر وکلا تک میری یہ آواز پہونچ سکے!

قصر الادب - آگرہ
۱۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء

سیماب اکبرآبادی



تقریبِ اشاعت

"مکتبۂ قصر الادب آگرہ" کو دلی مسرت ہے کہ وہ آج اور بُ کے فاضل و قابل وکیل، اور ادب اُردو کے محسن و معاون جناب منشی ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی کا دیوان اپنے اہتمام و نگرانی میں شائع کر رہا ہے۔

آج اُردو پریس کے ہاتھوں اُردو شاعری کی مٹی جیسی پلید ہے اُس سے کون واقف نہیں۔ شعرا کے دیوان جب پریس سے نکل کر پبلک کے سامنے آتے ہیں تو اُن کی مجموعی حیثیت و حالت میں کوئی نظر کشی نہیں ہوتی کاغذ ہلکا اور کم قیمت، لکھائی غلط اور بدنما۔ چھپائی خراب۔ اور ترتیب وغیرہ نہایت بھدّی ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کا اثر مجموعی طور پر ناظر کی نگاہوں پر کچھ اچھا نہیں پڑتا اور کلام کی خوبیاں بھی اُجاگر نہیں ہوتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیوان کسادِ بازاری کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور بجائے اشاعتِ کلام، کلام کی گمنامی و فنا اس کا نتیجہ ہوتی ہے۔

سیّد راس مسعود مرحوم کے ایک یوروپین دوست اُن کے ہمراہ ایک مرتبہ دہلی کی سیر کرنے گئے تو وہاں انھوں نے سیّد صاحب سے پوچھا کہ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کا کلام اگر اس دار السلطنت کے کتب خانوں دستیاب ہو جائے تو میں خریدنا چاہتا ہوں۔ سیّد راس مسعود انھیں "بلیماروں" میں ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے اور اس سے "دیوانِ غالب" مانگا۔ کیونکہ غالب سیّد مرحوم کی نگاہ میں سب سے بڑے ہندوستان کے شاعر تھے۔

کتب فروش نے "دیوان غالب" نکال کر دیا۔ جو بوسیدہ کاغذ پر معمولی لکھا ہوا اور چھپا ہوا تھا۔ قیمت

پوچھی تو کتب فروش نے "ڈھائی آنے" بتائے۔ اس پر انگریز سیاح حیرت و عبرت کے پسینوں میں ڈوب گیا اور کہنے لگا کہ "ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کا کلام، اور قیمت صرف ۲/۔!"

اُس نے سید صاحب مرحوم سے کہا کہ آپ کو اس کی بے قدری کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ دیوان کا حق تالیف محفوظ نہیں ہے تو اُس نے کہا کہ میں خود اس دیوان کو جرمنی میں چھپواؤنگا۔

یہ ہے وہ حقیقت، جس کی موجودگی میں ہم آج مغربی فضلا اور اربابِ ادب کے سامنے اپنے ملک کے مشہور شعرا کا کلام پیش کرنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ ہماری ذہنیت محض تاجرانہ رہ گئی ہے اور ہم میں آرٹ کا ذوق بالکل باقی نہیں رہا ہے۔

"مکتبہ قصر الادب آگرہ" نے ہندوستان کے شعرا کے کلام کی اشاعت اپنے ذمہ لے لی ہے۔ یہ دیوان بھی اسی خدمت کا ایک نتیجہ جمیل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ شعرا کا کلام اُن کے کلام کے مرتبے کے مطابق شائع ہو۔ تاکہ اُس کا مطالعہ ذوقِ سلیم پر بار نہ ہو۔ اور مارکیٹ میں اسکی قدر کی جائے۔

"نشتر کدہ" مکتبہ قصر الادب کی حقیر خدمات کا ایک نمونہ ہے۔ نشتر صاحب نے اپنے کلام کی اشاعت و طباعت کے لئے ایک مناسب و موزوں رقم خرچ کی ہے اور "مکتبہ قصر الادب" نے بغیر کسی معاوضے کے اپنی نگرانی میں اُن کا دیوان اُنھیں کے لئے چھپوایا ہے۔ ہماری خدمات کا صلہ یہی کافی ہے کہ ہم اپنے ملک کے شعرا کا کلام نفیس اسلوب اور جدید طریقہ طباعت کے ساتھ معرضِ عام پر لاکر اُن کے کلام کی قدر و قیمت واضح اور مسلّم کر دیں۔ اور ہماری یہ کوشش مشکور ہو۔ تاکہ ملک میں عام طور پر اشاعتِ کلام کا حوصلہ بڑھے اور جو دیوان پریس کی مشکلات اور اربابِ کار کی لاپروائی سے ابتک معرضِ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں ان کے لئے ایک صحیح راستہ پیدا ہو جائے۔

ہم نے حتی الامکان کوشش کی کہ دیوان میں کہیں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ مگر "بے عیب صرف خدا کی ذات ہے" تمام دیوان چھپ جانے کے بعد معلوم ہوا کہ کاتب صاحب نے غزلوں کی ترتیب میں دس نمبر غلط کر دیئے ہیں گو اس غلطی کا اثر نفسِ دیوان پر ذرا بھی نہیں پڑتا مگر غلطی پھر غلطی ہے۔ جس کے لئے ہم نشتر صاحب سے اور آپ سے عذر خواہ ہیں۔ ترتیبی نمبروں کا صحت نامہ بنا دیا گیا ہے۔

ہم اپنے محترم اور محسنِ ادب جناب نشتر ہنگامی کو ان کے اس دیوان کی طباعت و اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

قطعۂ تاریخ اشاعتِ دیوان

منجانبِ ادارہ

شائع ہوا وہ کلامِ دلکش — اشعار ہیں جس کے تیر و نشتر
کیا زورِ قلم ہے اللہ اللہ — جذبات الفاظ سے ہیں باہر
ہے فکر کی وسعت و بلندی — معیارِ شاعرِ نوا گر
ہر لفظ نظر نواز اُس کا — نقطہ نقطہ نگاہ پرور

لکھدو سالِ اشاعت اعجازؔ
"دیوانِ نشترِ سخنور"
۱۹۳۷ء

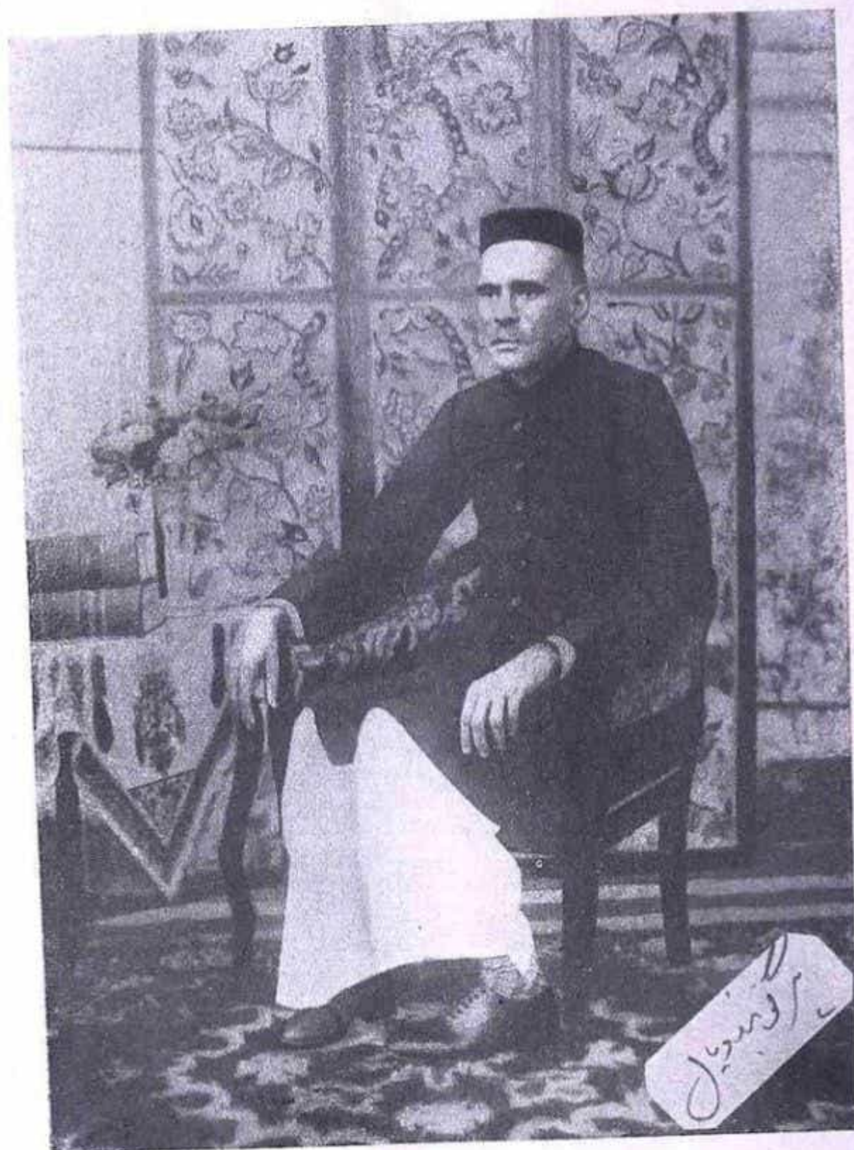
اعجاز صدیقی اکبرآبادی
مدیر "شاعر" آگرہ

تصحیح :-

غزلوں کے ترتیبی نمبروں میں غلطی ہو گئی ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

صفحہ	نمبر غزل غلط	صحیح
۳۵	۲۰	۲
۱۵۳	۹۶	۹۷
۳۵۷	۷۴	۷۳

اس کے علاوہ صفحہ ۱۲۶ سے آخر تک غزلوں کے نمبر غلط ہیں۔ صفحہ ۱۲۵ کے آخر سے جو غزل شروع ہوتی ہے اس کا ۱۰۷ کے بجائے ۱۸۰ ہونا چاہیے اور ۱۳۵ کی آخری غزل پر بجائے ۱۸۰ کے ۹۱ ہونا چاہیے۔ اسی طرح آخر تک تصحیح کے بعد آخری غزل کا نمبر بجائے ۲۸۲ کے ۲۹۳ ہو جائیگا۔ فہرست میں غزلوں کے نمبر بالکل صحیح ہیں۔



محسن ادب جناب منشی ہرگوبند دیال صاحب "نشتر" ہمکامی وکیل اورئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے قادر و برتر و توانا — جانا تجھے سب نے اور نہ جانا
اللہ رے یہ ترا فسانا — سمجھا، نہ سمجھ سکے زمانا
مجھکو تو ہے تیری ذات کافی — بیگانہ ہو یا کوئی یگانا
کہنا پڑا سب کو آخرِ کار — جانا تجھ کو مگر نہ جانا
قائم ہے تو، اور نہ جانے کیا کیا — پیدا ہوا، مٹگیا زمانا
اک جام مجھے بھی آج ساقی — ٹوٹا، پھوٹا، نیا، پرانا
نکلا ہوں میں کسکی جستجو میں! — جسکو دیکھا، سنا، نہ جانا
ناکامیٔ طور کا نہیں غم — کہنے کو تو ہو گیا فسانا
افسانا سنا جو میں نے تیرا — دنیا مجھے ہو گئی فسانا
کیا سمجھے کوئی فسانہ طور — ہم نے جانا کہ تو نے جانا
مانا کہ ملا نہ زیست میں کچھ — مرنے کا تو مل گیا بہانا

سب بن گئے اُس کے کام نشتر
جس نے اسے کارساز مانا

۱ — ۱۲

مرا کہنا مان تو عندلیب چمن سے اپنا مکاں اُٹھا
یہاں روز کا یہی روگ ہے۔ یہ دُھواں اُٹھا وہ ہواں اُٹھا
ہے وہیں کہیں مرا آشیاں جہاں شور ہے کہ دھواں اُٹھا
کوئی بڑھکے دیکھ تو لے ذرا۔ یہ دُھواں اُٹھا تو کہاں اُٹھا
تجھے مژدہ اے مرے جوشِ غم۔ کہ نہیں ہے فرصتِ نالہ کم
کوئی کہہ رہا ہے یہ دمبدم۔ ابھی اور لطفِ فغاں اُٹھا
ارے سوزِ عشق یہ تونے دل کو تباہ کر دیا کسطرح
کہیں آگ تھی نہ شرار تھا۔ نہ لپٹ اُٹھی نہ دھواں اُٹھا
مرے درد میں تری شوخیاں۔ ہیں بقدرِ ضعف نہاں نہاں
جو وہاں تھما تو یہاں اُٹھا۔ جو یہاں رُکا تو وہاں اُٹھا
یہ حجاب منزلِ دوست کے۔ مری بیکسی نے بڑھا دئیے
کہ غبارِ جادہ بنا رہا۔ مری آہ سے جو دھواں اُٹھا
کبھی تھا نفور اسی درد سے یہی درد آج ہے زندگی
وہیں اک سکون سا ہوگیا۔ مرے دل میں درد جہاں اُٹھا
نہ وفا میں قدرِ کمال ہے۔ نہ جفا کی پرسش حال ہے
جو یہی خدا کا خیال ہے۔ تو رواجِ عشق بتاں اُٹھا
مجھے کرکے خوگرِ دردِ دل۔ نئی تونے بخشدی زندگی

مجھے اب تو اسکی بھی حس نہیں کہ جو درد اُٹھا تو کہاں اُٹھا
تری بزم میں تھی چلا چلی - ہوا حشر دونوں کا ایک ہی
کوئی شخص ہنس کے چلا گیا - کوئی شخص نوحہ کناں اُٹھا
نہ جہاں میں کوئی کمی ہوئی - نہ جہاں میں ہوگی کمی کوئی
یہ مرا خیال فضول ہے کہ جو میں اُٹھا تو جہاں اُٹھا
مجھے شکستِ توبہ کیواسطے - مرے دل میں سینکڑوں وسوسے
کہ خدا کے فضلِ عمیم سے وہیں ابر رقص کناں اُٹھا
ترا ناز مجھ سے نہ اُٹھ سکا - یہ مرے نیاز کا نقص ہے
میں یہ لاکھ سمجھوں کہ ہاں اُٹھا - ولے حق تو یہ ہے کہاں اُٹھا
مجھے دردِ دل کی شکایتیں، ہیں اسی لئے کہ وہ یہ کہیں
ترا دل ہی پاس نہیں ترے - تو بتا یہ درد کہاں اُٹھا؟
کبھی نام تیری زبان پر - نہیں اُسکا بھول کے اے بشر
جو عطا ہوئی ہے زباں تجھے - تو زباں سے لطفِ بیاں اُٹھا
وہ جمال نشتر جلوہ جو ہے محیط دہر میں چار سُو ۲۰
۱۶ اُسے دیکھنے کی ہے آرزو - تو حجابِ وہم وگماں اُٹھا

ہزاروں بار یوں تو صحن گلشن میں دھواں اُٹھا — دھواں تھا وہ دھواں لیکن جو زیرِ آشیاں اُٹھا
مجھے برباد کرنے تو ہے ناحق باغباں اُٹھا — ترا گھر بیٹھ جائیگا جو میرا آشیاں اُٹھا

یہ مانا فصلِ گل میں باغ چھوٹا آشیاں اُٹھا — بجا اس شور سے تو ہے دھواں اُٹھا دھواں اُٹھا

جہاں لیکر کڑی نظریں چمن میں باغباں اُٹھا — دلِ پُر خوف میں فوراً سوالِ آشیاں اُٹھا

الٰہی خیر ہو پھر قلب میں دردِ نہاں اُٹھا — وہ شاید خواب سے برہم نصیبِ دشمناں اُٹھا

کسی کو کیا خبر کس رنگ سے پہونچا ہوں منزل تک — کہاں سویا۔ کہاں جاگا۔ کہاں بیٹھا۔ کہاں اُٹھا

ابھی سے تجھ میں کیوں آثار پیدا ہیں خموشی کے — ابھی حشر اے لبِ فریاد دنیا میں کہاں اُٹھا

نہ پوچھ اُس دن کی حالت باغباں جب صحنِ گلشن میں — مرے پہلو سے اک شعلہ قریبِ آشیاں اُٹھا

جہاں میں جو خوشی آئی۔ وہ اپنے ساتھ غم لائی — جو بادل جھوم کر اُٹھا۔ وہ لیکر بجلیاں اُٹھا

جو دل میں درد اُٹھتا ہے تو اُٹھکر تھم بھی جاتا ہے — ہمارا دردِ دل ظالم جہاں اُٹھا وہاں اُٹھا

لگا دے کیا چمن میں دل کوئی گلہائے رنگیں سے — یہاں ہر پھول گھولے سے پابندِ خزاں اُٹھا

نہ جانے آگ کو کیا لاگ ہے اِن چند تنکوں سے — دھواں جب باغ میں اُٹھا قریبِ آشیاں اُٹھا

نہیں رہتا کسی کا وقت یکساں ہم نہ کہتے تھے — عمل تیرا بھی آخر ایک دن دورِ خزاں اُٹھا

بٹھایا آپ نے محفل میں اپنی کب تسلی سے — جب اُٹھا آپکی محفل سے میں نالہ کناں اُٹھا

عجب کیا ہے کہ صبحِ حشر گرد آلود ہو جائے — جو میں صحنِ چمن سے لیکے خاکِ آشیاں اُٹھا

نہ اُٹھا اُن کے سنگِ آستاں سے اپنا سر نشتر
۳ اُٹھانے کو نہ جبتک اُنکا سنگِ آستاں اُٹھا ۱۶

ظرف آشنا ہے ہمتِ دل، آزمائے جا — جلنے کا کچھ اسی میں مزہ ہے ستائے جا

زحمت نہ ہو اگر یوں ہی بجلی گرائے جا — میں تجھکو دیکھتا ہوں تو مسکرائے جا

محوِ ہوائے دوست ہوں اے شمعِ زندگی ۔ کچھ دیر تک تو اور یوں ہی جھلملائے جا
اپنا نہیں مگر مجھے تیرا تو ہوش ہے ۔ بیخود ابھی نہیں ہوں مُغنّی تو گائے جا
دل پُرغبار ہے تو نہ اِس کا خیال کر ۔ اشکوں کا اپنی آنکھ سے دریا بہائے جا
آخر تو ایک روز کھلیں گے ترے فریب ۔ دنیا کو اے محبّتِ دنیا لبھائے جا
ملنے کی اُس کے اور نہیں دوسری سبیل ۔ جب تک ہو، اپنے نقشِ خودی کو مٹائے جا
آنے نہ پاؤں ہوش میں اتنا رہے لحاظ ۔ رکھنا ہے مجھکو مست تو ساقی پلائے جا
اے دل اب اسکی بزم کے شکوؤں سے فائدہ ۔ کس نے کہا تھا تجھ سے کہ تو بے بُلائے جا
آخر معاوضہ بھی تو کچھ چاہیئے ہمیں ۔ چھینا ہے تو نے ہوش تو جلوے دکھائے جا

۴ نشتر تجھے تو عرضِ تمنّا سے ہے غرض
کوئی تری سُنے نہ سُنے تو سُنائے جا ۱۱

دل میں نے قبول ازل میں کیا۔ ہر طور سے جب دل دیکھ لیا
جب ناز کے قابل دیکھ لیا۔ انداز کے قابل دیکھ لیا
ہاں حُسن کو قاتل دیکھ لیا۔ ہاں عشق کو بسمل دیکھ لیا
جب شمع جلائی، انجامِ پروانۂ محفل دیکھ لیا
کب شوقِ شہادت رُکتا ہے جب خنجرِ قاتل دیکھ لیا
اب پار نہ ہو کشتی کیونکر۔ کشتی نے ساحل دیکھ لیا
تم اور ستم جو چاہو کرو۔ اِس طرزِ ستم سے باز آؤ

ہر بار یہ کیا کہہ دیتے ہو۔ جا ہم نے ترا دل دیکھ لیا
دل نے رازِ فطرت سمجھا۔ اب آساں کیا اور مشکل کیا
ساحل کو دریا دیکھ لیا۔ دریا کو ساحل دیکھ لیا
انجامِ محبت جو کچھ ہو۔ مجھ کو تو خوشی اس بات کی ہے
دنیا نے ترا دل دیکھ لیا۔ دنیا نے مرا دل دیکھ لیا
ہاں ہمتو پکارے کہتے ہیں ہشیاری سے غفلت اچھی
ہم نے خوابوں کی بستی میں ہشیار کو غافل دیکھ لیا
تو لاکھ چھپے سو پردوں میں۔ تو لاکھ نظر سے اوجھل ہو
محفل بنکر ہم نے تجھ کو اے صاحبِ محفل دیکھ لیا
جانبازِ محبت ہم ٹھہرے۔ ملتے ہیں قضا سے روز گلے
اُس لمحے ہو گئی عید ہمیں، جب جلوۂ قاتل دیکھ لیا
اب کیوں نہ کرے وہ جور و جفا۔ اب کیوں نہ ہو وہ بیزارِ وفا
ظالم نے ہمارے سینے میں اک درد بھرا دل دیکھ لیا
اِس باغِ جہاں کے گُل بوٹے۔ مہماں ہیں اک دو ساعت کے
اُس نقش پہ کیا مرنا اے دل۔ جس نقش کو باطل دیکھ لیا
جبتک حق کا ادراک نہ تھا۔ احساسِ باطل خاک نہ تھا
جب حق کو حق محسوس کیا۔ باطل کو باطل دیکھ لیا

اب چین نہیں ہے ایک گھڑی - آنکھیں ہیں اور تصویر انکی
کیا جانئے انکی صورت میں کیا دید کے قابل دیکھ لیا

اس طرح نہیں ملتی منزل - اس طرح نہیں کٹتی مشکل
تونے ابتک رہکر غافل اے طالبِ منزل دیکھ لیا

ہے دوری منزل نقصِ طلب - ہم اپنی بیتی کہتے ہیں
منزل نے دیئے خود اپنے پتے - جب طالبِ منزل دیکھ لیا

دشواری عالم کا رستہ - دشوار پسندی سے کاٹا
اُس کام کے پیچھے پڑ گئے ہم - جس کام کو مشکل دیکھ لیا

جو چاہے کرے انسان کا دل - رحمان بھی ہے شیطان بھی ہے
قزاق اسے ہم نے پایا اور رہبر کامل دیکھ لیا

بیمارِ شبِ غم کو نشتر - یہ صبح کے آثار آئے نظر ۵
یا ڈوبنے والے نے سر پر - دامانِ ساحل دیکھ لیا 18

انداز بھری نظر کے ہیں مستانہ دیکھنا — کرنا نہ پھر کہیں مجھے دیوانہ دیکھنا
دیر و حرم نہ کعبہ و بتخانہ دیکھنا — دل ہی میں ہمکو جلوۂ جانانہ دیکھنا
ابرِ سیہ کا عالمِ مستانہ دیکھنا — آتا ہے وہ اُڑا ہوا میخانہ دیکھنا
مایوسیاں رہیں جو دلِ زار کی یہی — دو دن میں اس مکان کو ویرانہ دیکھنا
اسکے سوا مفر نہیں اسکے فریب سے — دنیا کو بر طریقۂ افسانہ دیکھنا

محفل میں بیٹھنے کی اجازت تو دو ہمیں
پھر دیکھنا ہماری طرف یا نہ دیکھنا

ہے جنکے دل میں جلوہ جاناں کی ہوس
سیکھیں وہ پہلے جلوہ جاناں نہ دیکھنا

توبہ کی ہر طرف سے صدائیں بلند ہیں
کیا بند ہو گیا درِ میخانہ، دیکھنا

اے اضطرابِ قلب نہ مجبورِ نالہ کر
ہو جائے رازِ دوست نہ افسانہ دیکھنا

میں بھی ہوں آج بادہ کشوں میں حریف بھی
اب انقلابِ گردشِ پیمانہ دیکھنا

گو کچھ نہیں ہوں پھر بھی میں دنیا پہ چھاؤں گا
ہوگا یہاں وہاں مرا افسانہ دیکھنا

جو کچھ گذر رہے ہیں زمانے میں واقعات
دو چار روز میں انہیں افسانہ دیکھنا

ساقی کی چشمِ مست سے بے خود ہے دل مرا
میخانہ دیکھنا مرا پیمانہ دیکھنا

نشتر بہک چلے ہیں بہت میکدے میں آج
۶ چھوٹے نہ ہاتھ سے کہیں پیمانہ دیکھنا ۱۵

دھن ہے اگر نباہ کی۔ اپنی وفا کو بھول جا
اُن کے ستم نہ یاد کر ناز و ادا کو بھول جا

اپنی خودی کو بھول جا۔ صبح و مسا کو بھول جا
ایک خدا کو یاد رکھ۔ ہر دوسرا کو بھول جا

تو جو ہے غم سے نوحہ گر۔ تیری خطا ہے سربسر
کس نے کہا تھا اے بشر اپنے خدا کو بھول جا

آج وہ اے چراغِ قبر۔ آتے ہیں بہرِ فاتحہ
اُن سے کرا کتابِ نور۔ اپنی ضیا کو بھول جا

روز حیات ہے یہاں روز ممات ہی یہاں
عشق کی انتہا کہاں۔ فکرِ قضا کو بھول جا

اپنی وفا کا ذکر کیا۔ اپنی وفا کی فکر کیا
ہے یہی غایتِ وفا۔ عہدِ وفا کو بھول جا

اے دلِ زار عشق میں۔ آہ پہ کر نہ اعتبار
آہِ رسا کسے نصیب۔ آہِ رسا کو بھول جا

منفعلِ مآل ہو اپنی جفائیں یاد کر — اہلِ وفا کہاں ہیں اب - اہلِ وفا کو بھول جا
بلبلِ نامرادیوں - عمرِ قفس نباہ دے — صحنِ چمن کو بھول جا - اُسکی فضا کو بھول جا
دعویٰ عشق ہے اگر - اے دلِ زار صبر کر — نوحہ گری سے کر حذر - آہ و بُکا کو بھول جا
دارِ بقا ہے دائمی - دارِ فنا ہے عارضی — دارِ بقا پہ رکھ نظر - دارِ فنا کو بھول جا
ہمتِ دل جفا طلب - فطرتِ دل خلش پسند — کیوں میں کہوں جفا نہ کر - خوئے جفا کو بھول جا
ہیں ہمیں خطا کیواسطے - تو ہے عطا کیواسطے — اپنی عطا پہ رکھ نظر - میری خطا کو بھول جا
ہے جو عطا کا ملتجی - تجھکو بھی چاہیئے یہی — جس سے ہو جب خطا کوئی - اُسکی خطا کو بھول جا

نشترِ زار واقعی - دہر ہے محشرِ خودی
کہتے ہیں سب یہاں یہی - اپنے خدا کو بھول جا

۱۵

دریا میں ملا ہستی اپنی - اے قطرے پھر دریا ہو جا
آخر تو فنا ہونا ہے تجھے - پھر قبلِ فنا ہی فنا ہو جا
دنیا نہیں رہنے کے قابل - کر دے اسے ترک فنا ہو جا
چھوڑ اس خاکی پیراہن کو - اور مائلِ ملکِ بقا ہو جا
میں کچھ نہ رہوں تو سب کچھ ہو - کیا تجھ سے کہوں تو کیا ہو جا
تو دل ہو جا، تو جاں ہو جا - یعنی میری دنیا ہو جا
اے انساں چھوڑ خودی اپنی - اور محوِ ذاتِ خدا ہو جا
مخلوق میں پہلے یکتا تھا - مخلوق میں پھر یکتا ہو جا

یہ بس میں ہے لے انسان ترے۔ جیسا چاہے ویسا ہو جا
یا صورتِ قطرہ ناقص رہ، یا کامل بن دریا ہو جا
جاتی ہے جہاں تک میری نظر۔ دُنیا ہے فساد و جنگ کا گھر
دنیا میں مجھے رکھنا ہے اگر۔ دنیا سے بھی کہہ دنیا ہو جا
غیروں کا بھروسہ کیا کرنا۔ اپنا ہی بھروسہ سچا ہے
صحرائے محبت میں اپنا۔ تو آپ ہی راہ نما ہو جا
ہو جائے اگر وہ جو میں کہوں۔ تو پہلا کام یہی میں کروں
صحرا سے کہوں گلشن ہو جا۔ گلشن سے کہوں صحرا ہو جا
یہ دنیا اور فریب اُس کے۔ پیچھا نہ ہمارا چھوڑینگے
کیا دیر ہے اب کھلنے میں ترے۔ اے چشمِ حقیقت وا ہو جا
دُنیا سے غرض تجھکو نہ رہے۔ دُنیا سے غرض مجھکو نہ رہے
ہو جاؤں میں دُنیا ترے لئے۔ تو میرے لیے دنیا ہو جا
رٹ تیری ہے اسکو آٹھ پہر۔ ہر وقت ہے دروازے پہ نظر
بیمارِ الم کی بالیں پر۔ ہو جا۔ اے بے پروا ہو جا
اے غافل بھولے بھٹکے ہی تو نام زباں سے لے اُسکا
میں یہ تو نہیں کہتا تجھ سے۔ تو مطلق محوِ خدا ہو جا
آلودہ عصیاں ہوں ایسا۔ اب آؤں میں اُسکے سامنے کیا

اے اشکِ ندامت جوش میں آ۔ اور آنکھوں کا پردا ہو جا
کرنے دے جو وہ کرتے ہیں جفا۔ کر ترک نہ تو آئینِ وفا
تجھکو اے دل کام ان سے کیا۔ تو اپنے حق سے ادا ہو جا
ہے تجھ کو کبھی فکرِ دنیا۔ ہے تجھ کو کبھی فکرِ عقبیٰ
یہ رنگ دوئی چھوڑ اے غافل۔ جو تیرا ہے اُسکا ہو جا
لگ جائیگی پار کبھی نہ کبھی۔ ایدل یہ ترے غم کی کشتی
ساحل واحل کی فکر نہ کر۔ طوفان سے بے پروا ہو جا
سُننے کے لئے ہوں کان اگر۔ اور دل کو ہو عرفان اگر
ہر سانس یہ کہتی ہے **نشتر**۔ تو قبلِ فنا ہی فنا ہو جا ۱۷

الٰہی ہو گیا کس طرح ایکدم انقلاب ایسا
ہماری یاد سے اور اُنکے دلمیں اضطراب ایسا!
ڈر اُنکے سامنے کیا ہے تجھے چشمِ پُر آب ایسا
کوئی موقع پہ دیتا ہے کہیں سوکھا جواب ایسا
مری عرضِ تمنا پر یہ خفگی۔ اے معاذ اللہ
تمھیں انصاف سے سوچو سوال ایسا جواب ایسا
نہ گلشن میں قرار اسکو۔ نہ صحرا میں سکوں اسکو
ملا کمبخت دل بھی تو ملا خانہ خراب ایسا
وہ دل تھامے ہوئے ہاتھوں سے گھبرائے چلے آئیں
دکھا کوئی کرشمہ آج تو اے اضطراب ایسا
ہمارا اضطرابِ دل الٰہی توبہ۔ معاذ اللہ!
مقدر سے نہ دشمن کے بھی اُنکو اضطراب ایسا
نکل آ دل کے پردے سے مجسم جلوہ گر ہو جا
مرا دیکھا ہوا ہے اور پھر مجھ سے حجاب ایسا
تجھے تشبیہ کس سے دوں کوئی ثانی نہیں تیرا
نہ رنگِ آفتاب ایسا۔ نہ حسنِ ماہتاب ایسا

محبت کا یہ قصہ اور غمگیں ابتدا ایسی — کتابِ درد جہ دلکش اور دیباچہ خراب ایسا

ہزاروں پردوں میں پنہاں۔ نمایاں ذرے ذرے میں — وہ ظالم باحجاب ایسا۔ وہ کافر بےحجاب ایسا

مری آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے نقشہ بے ثباتی کا — فنا کا درس دیتا ہے فنا ہو کر حباب ایسا

انہیں ہم خواب میں بھی دیکھنے کو اب ترستے ہیں — کیا ہے بختِ خفتہ نے ہمیں محرومِ خواب ایسا

وہ ساقی کا کرم۔ وہ میکدے کی صحبتیں نشتر

۹ — نہ اب بزمِ شراب ایسی۔ نہ اب دورِ شراب ایسا — ۱۴

کسی کے وعدے پہ ہے انتظار کیا کہنا — ترا بھی اے دلِ امیدوار کیا کہنا!

یہ جذب اے نگہِ مست یار۔ کیا کہنا — نظر ملی کہ ہوئی دل کے پار کیا کہنا

ہر اک ادا پہ تری دل نثار کیا کہنا — بہار اور مجسم بہار۔ کیا کہنا

غمِ فراق و غمِ انتظار کیا کہنا — ہیں اضطراب کے معنی قرار۔ کیا کہنا

یہ رقص و مستیٔ ابرِ بہار کیا کہنا — کہ جیسے جھومے کوئی میگسار کیا کہنا

نگاہِ مست پہ تیری نثار کیا کہنا — جو پارسا تھے وہ ہیں بادہ خوار کیا کہنا

گلوں کے ڈھیر نسیمِ بہار کیا کہنا — مزار آج ہے میرا مزار۔ کیا کہنا

چمن حسیں ہے فضا خوشگوار کیا کہنا — بہار اور پھر ابرِ بہار۔ کیا کہنا

کبھی تصورِ گیسو۔ کبھی تصورِ رخ — ہمارے عشق کے لیل و نہار۔ کیا کہنا

اک ایسا وار نظر کا۔ تری نظر پہ نثار — اجل پکار اٹھے ایک بار "کیا کہنا"

تمہارا حسن ملائک فریب۔ ارے توبہ — ہمارا جذبۂ بے اختیار۔ کیا کہنا

بہار اور خزاں سے کوئی لگاؤ نہیں — ترا فروغ دلِ داغدار کیا کہنا
کہاں تک اسکی جفاؤں کا کیجیے شکوہ — جو بات کہدی اُسے بار بار کیا کہنا
بتاؤ کون نہ مر جائے ایسے مرنے پر — مزار اُنکے سرِ رہگذار کیا کہنا
تمام دن کا وہ اُمید آفریں عالم — تمام رات کا وہ انتظار کیا کہنا
تمہارے غم کو نہ بدلوں نشاطِ عالم سے — خزاں میں ہے مجھے لطفِ بہار کیا کہنا

دلِ فسردہ شگفتہ نہ کر سکی نشتر
۱۰ یہ ہے بہار تو اسکو بہار کیا کہنا ۱۷

کیوں جوشِ رقابت سے دیوانہ نہیں ہوتا — پروانے کا دشمن کیوں پروانہ نہیں ہوتا؟
میخانہ بھی بے ساقی - میخانہ نہیں ہوتا — جبتک وہ نہ خود ڈھالے پیمانہ نہیں ہوتا
جو تیری محبت میں دیوانہ نہیں ہوتا — کچھ اور وہ ہوتا ہے فرزانہ نہیں ہوتا
اس حُسن کی محفل میں ایسے بھی تو آتے ہیں — جب شمع تو ہوتی ہے پروانہ نہیں ہوتا
جسطرح ہوئے ساقی یہ ہوش مرا لیلے — اس ہوش کے مارے میں دیوانہ نہیں ہوتا
خُم مُنہ سے لگا بھی دے۔ اے ساقی میخانہ — اب میرے لئے کافی پیمانہ نہیں ہوتا
اُس وقت میں جلتا ہوں سوزِ تپِ فرقت سے — جب شمع نہیں ہوتی پروانہ نہیں ہوتا
کیا میرا ہی افسانہ ہے سلسلۂ ہستی؟ — کیوں ختم مرے دل کا افسانہ نہیں ہوتا
دیوانگی میں پنہاں ہے رازِ محبت کا — دیوانہ وہ ہی ہے جو دیوانہ نہیں ہوتا
کب میرے تصور میں آنکھیں نہیں ساقی کی — کب سامنے نظروں کے میخانہ نہیں ہوتا

دیوانہ وہ ہے جسکو دُنیا کہے دیوانہ
یوں خاک اُڑانے سے دیوانہ نہیں ہوتا

ہم جب سے جُدا ہو کر میخانے سے آئے ہیں
اوجھل کبھی نظروں سے میخانہ نہیں ہوتا

جبتک مری اُلفت کا ہوتا نہیں ذکر اُسمیں
افسانہ کسیکا ہوا افسانہ نہیں ہوتا

ہوتا ہے کوئی ٹکڑا افسانے کا افسانہ
پورا کوئی افسانہ، افسانہ نہیں ہوتا

جبتک تو نہیں ہوتا میخانے میں اے ساقی
میخانہ حقیقت میں میخانہ نہیں ہوتا

محتاجِ کرم کوئی - ممنونِ کرم کوئی
بخشش کا ترے کوئی پیمانہ نہیں ہوتا

اسوقت کوئی دیکھے حالت مری فرقت میں
جب پاس کوئی اپنا بیگانہ نہیں ہوتا

کیا کچھ نہیں ہوتا ہے انسان کا یہ دل بھی
کعبہ نہیں ہوتا یا بتخانہ نہیں ہوتا

اُسوقت کوئی دیکھے نشتر کی پریشانی
جب ہاتھ میں حضرت کے پیمانہ نہیں ہوتا

کیا دل کہیں اُس دل کو جو ٹوٹ گیا نشتر
ٹوٹا ہوا پیمانہ، پیمانہ نہیں ہوتا

۱۱ ۳۰

مجھے شوقِ نیاز ایسا - وہ کافرِ بے نیاز ایسا
اِدھر سے التفات ایسا - اُدھر سے احتراز ایسا

نہ رکھنا چاہیئے تجھ کو خدا یا امتیاز ایسا
کسی کو سرنگوں ایسا - کسیکو سرفراز ایسا

نہ تھے جب تم تو افسانہ کہاں تھا دلگداز ایسا
بہت پھیکا پھیکا تھا - نہ سوز ایسا نہ ساز ایسا

درازی روزِ فرقت کی کسی کو کیا بتائیں ہم
یقیں یہ ہے نہ ہوگا روزِ محشر بھی دراز ایسا

جہاں سر رکھدیا ہم نے وہ کعبہ ہو کہ بتخانہ
پھر اٹھا ہی نہیں سجدے سے ہے شوقِ نیاز ایسا

تمھارے درد میں دو مختلف کیفیتیں دیکھیں
نہ کوئی دلنواز ایسا - نہ کوئی دلگداز ایسا

جسے دیکھو مرا منہ تک رہا ہے بزم عالم میں
نہ جانے کھل گیا دھوکے میں مجھ سے کون راز ایسا

تصور آئیگا تیرے سر، خطا تیری ہی ٹھہرے گی
نہیں تو کام یوں بگڑیں ترے اور کارساز ایسا

کرے جو درد سے درماں ترے دردِ محبت کا
مریضِ غم کہاں سے کوئی لائے چارہ ساز ایسا

کلیم و طور کا قصہ دلوں سے محو ہو جاتا
گذرتا واقعہ مجھ پر بھی اک افسانہ ساز ایسا

نہ پابندِ حرم رہتی نہ پابندِ صنمخانہ
جبیں کو کاش ملجاتا کوئی ایوانِ ناز ایسا

میں ہو کر سب سے بیگانہ۔ ترا دیوانہ ہو جاؤں
دکھائے مجھکو اپنا جلوۂ دیوانہ ساز ایسا

ذرا واعظ کو دیکھے اسکی تقریریں سُنے کوئی
کبھی کا ہمکو گذرا تھا نظر سے پاکباز ایسا

تعجب کیا اگر نقشِ دوئی مٹ جائے اب نشتر
نہیں کچھ دردِ دل اور دل میں باقی امتیاز ایسا

۱۴

دل میں ہر وقت خیالِ رُخِ جاناں ہوتا
میں جو انسان بنا تھا تو پھر انساں ہوتا

کاش اس دل میں ترا حسن گل افشاں ہوتا
تھا گلستاں تو پھر رنگ گلستاں ہوتا

مٹ ہی جاتا جو نہ پورا مرا ارماں ہوتا
مجھ کو آرام تو ظالم کسی عنواں ہوتا

سب کرشمے تھے مری شادی و غم کے۔ ورنہ
نہ گلستاں کہیں ہوتا نہ بیاباں ہوتا

چارہ گر تجھ پہ زمانے کو ہنسی آتی ہے
زخمِ دل کیوں نہ تجھے دیکھ کے خنداں ہوتا

تو سکوں کا مرے ضامن جو نہ ہوتا اے ضبط
رات دن جسم مرا شعلہ بداماں ہوتا

شکلِ اُمید نمایاں نہیں مایوسی میں
اس اندھیرے کا بھی کوئی مہِ تاباں ہوتا

دخل صیاد و خزاں کا جو نہ ہوتا اسمیں
باغباں تیرا گلستاں بھی گلستاں ہوتا

کاش دل کو ترے جلووں کے اُجالے ملتے
یہ ستارہ بھی کسی دن مہِ تاباں ہوتا

تو نے چھپنے کی اگر دل میں ٹھانی ہوتی
آج کیوں سارا زمانہ ترا خواہاں ہوتا

تو نے اچھا کیا صیاد نکالا نہ مجھے
میں نکلتا تو مرے ساتھ گلستاں ہوتا

کم نگاہی نہ اگر حائلِ جلوہ ہوتی
جس طرف آنکھ اُٹھاتے رُخِ جاناں ہوتا

اتنے پردوں میں تو یہ حال ہوا موسیٰؑ کا
حشر کیا ہوتا، ترا جلوہ جو عریاں ہوتا

کاش پابندِ حجابات نہ ہوتا انساں
اُسکے جلوے کیطرح شعلۂ عریاں ہوتا

شکر یہ خوفِ خدا کا ہو کہاں تک نشترؔ
یہ نہ ہوتا تو مرا کون نگہباں ہوتا

۱۴

جب آنکھ کھُلی دل کی، سب ایک ہی جلوا تھا
تصویرِ وفا میں تھا۔ وہ ظلم کا پُتلا تھا

کیا دید کے قابل کل۔ محفل میں تماشا تھا
کل کوچۂ قاتل میں کیا خوب تماشا تھا

کیا جانے محبت میں انداز مرا کیا تھا
کرتا نہ محبت میں یہ ہو نہیں سکتا تھا

جب تجھ سے محبت تھی۔ کیا وہ بھی زمانا تھا
افسوس کہ میں تیرا کچھ کام نہ کر پایا

ساقی مجھے دیتا تھا ساغر۔ نہ لیا میں نے

۱۵

بتخانے میں کعبہ تھا۔ کعبے میں کلیسا تھا
میں عشق سراپا تھا۔ وہ حسن سراپا تھا

میں شوقِ سراپا تھا۔ وہ نازِ سراپا تھا
بسمل تھے ادا کے سب اور نام قضا کا تھا

دیکھا جسے حیرت سے وہ مُنہ مرا تکتا تھا
کس طرح مٹا دیتا۔ قسمت میں جو لکھا تھا

تو محوِ تجلی تھا۔ میں محوِ تماشا تھا
جبتک رہا دنیا میں۔ دلدادہ دنیا تھا

اب سوچتا ہوں مجھ کو انکار نہ کرنا تھا

جلوؤں سے ترے تھا جب معمور دلِ عاشق
ہر ذرۂ خاکِ دل۔ اک حسن کی دنیا تھا

اک ہاتھ میں ساغر تھا۔ اک ہاتھ میں بوتل تھی
اک وہ بھی تھے دن اپنے اک وہ بھی زمانہ تھا

ناکام نہ ہم ہوتے الفت میں تو کیا ہوتے
در اصل قصور اپنا اظہارِ تمنّا تھا

ہر رنگ سے تھا ذوقِ نظّارہ مجھے حاصل
دریا بھی مجھے قطرہ تھا۔ قطرہ مجھے دریا تھا

ایمان سے کہہ تو ہی کیا لطف سے کٹتی تھی
جب میں ترّی دنیا تھا۔ اور تو مری دنیا تھا

محفل میں جہاں ان کی، کچھ اور تماشے تھے
حیرت سے مرا تکنا۔ اک اور تماشا تھا

تھے شادی و غم یکساں تخصیص نہ تھی کوئی
صحرا بھی مجھے گلشن تھا۔ گلشن مجھے صحرا تھا

قسمت سے ملے مجھ کو دل اور جگرا ایسے
اک درد کی دنیا تھا۔ اک کرب کی دنیا تھا

اکبار نہیں نشتر سو بار کا قصّہ ہے
محفل سے جب اٹھا ہوں دل بیٹھا جاتا تھا

۱۴ ۱۵

غم نے یہ عالمِ دلِ رنجور کردیا
ہلکے سے ایک زخم کو ناسور کردیا

تم نے جو اپنے حسن کو مستور کردیا
جو جس کے دل میں آیا وہ مشہور کردیا

جب اُس نے اپنے جلووں سے معمور کردیا
سارے جہاں کو جلوہ گہِ طور کردیا

دل سے کبھی قریب کبھی دور کردیا
جو وقت جو انھیں ہوا منظور کردیا

ہم کو ہمارے زہد نے مغرور کردیا
اُس کے قریب لا کے ہمیں دور کردیا

وہ سب لحاظ و پاس نہ جانے کہاں گیا
ساقی کی اک نگاہ نے مجبور کردیا

وہم و فریبِ منزلِ مقصد نے بارہا
منزل سے میری اور مجھے دور کردیا

توبہ کے توڑنے میں سُنا تھا کہ لطف ہے
اس نے شکستِ توبہ پہ مجبور کر دیا

بیٹھے بٹھائے لیلیٔ رخصت کا نام کیوں
پھر تم نے میرا درد بدستور کر دیا

لبریز تھا اُمید سے اے یاس دل مرا
کمبخت تو نے آکے اسے چور کر دیا

کارِ ثواب میرے گناہوں کا دیکھیے
رحمت کیواسطے انھیں مجبور کر دیا

ایدل وہ تجھ سے یوں ہی تھے ہر وقت بدگماں
یہ کیا کیا کہ تذکرۂ حور کر دیا

سب ذوق و شوقِ دید مرا سرد ہو گیا
قصہ عجب تم نے سرِ طور کر دیا

اے چشمِ مستِ ساقی پیتا نہ مرحبا
ساری فضائے دہر کو مخمور کر دیا

۱۵ نشتر ہم اور جذبۂ شہرت غلط غلط
گمنامیوں کے شوق نے مشہور کر دیا ۱۵

میرا بھی عشق کیا مرے پروردگار تھا
مجھ کو تمام عمر غمِ انتظار تھا

اک سمت زندگی میں غمِ روزگار تھا
اور اک طرف یہ جسم یہ مشتِ غبار تھا

اب کیا کہوں جو حال شبِ انتظار تھا
دل کو قرار تھا نہ جگر کو قرار تھا

الزام یہ غلط ہے کہ میں بادہ خوار تھا
پی لی تھی جو ازل میں اُسیکا خمار تھا

باغِ جہاں میں ہمنے گذاری کچھ اسطرح
تھی ہیبتِ خزاں نہ خیالِ بہار تھا

اس دن کی محویت بھی تمھیں یاد ہے مری
تم میرے سامنے تھے مجھے انتظار تھا

تو گلفشاں نسیم تھی جب قبر پہ ابھی
اُس کے قریب ہی تو ہمارا مزار تھا

لذت مجھے خدا کی قسم ہجر میں بھی تھی
بیزار زندگی سے بظاہر ہزار تھا

ناحق تلاشِ یار میں کی زندگی خراب ۔۔۔ دیکھا تو اپنے ہاتھ میں دامانِ یار تھا

تھا دونوں پہلوؤں میں شبِ ہجر درد کیوں ۔۔۔ کیا دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار تھا؟

اے عشق اب بہار میں رنگِ خزاں ہے کیوں ۔۔۔ پہلے خزاں میں کیوں مجھے لطفِ بہار تھا

اب وہ پڑے ہوئے ہیں زمیں میں دبے ہوئے ۔۔۔ احساں بھی جنکی خاطرِ نازک پہ بار تھا

مجھکو تو یہ خوشی ہے کہ مرنیکے وقت بھی ۔۔۔ میری زباں پہ نام ترا بار بار تھا

تونے جدھر نہ بھول کے محفل میں کی نظر ۔۔۔ اُس سمت بھی کوئی ترا اُمیدوار تھا

افسوس زندگی میں نہ معلوم ہو سکا ۔۔۔ جو نقش تھا جہان میں ناپائدار تھا

میری طرف نگاہ نہ محفل میں تمنے کی ۔۔۔ میں بھی تو اک نگاہ کا امیدوار تھا

نیرنگیاں وہ یاد ہیں ایامِ وصل کی ۔۔۔ میں بیقرار تھا مرے دلکو قرار تھا

ممکن نہ تھا کہ عشق میں ہوتا نہ کامیاب ۔۔۔ پہلوئے شوق میں دلِ اُمیدوار تھا

سو مرتبہ یہ عشق میں مجھپر گذر گئی ۔۔۔ کرنا پڑا وہ ہی جو مجھے ناگوار تھا

ہمکو تو ہر خوشی سے مہک آئی رنج کی ۔۔۔ جس پھول پر نظر پڑی ہمرنگِ خار تھا

ہوتا ہمیں چمن سے بچھڑنے کا رنج کیوں ۔۔۔ پہلو میں دل بھی ایکطرح کی بہار تھا

ہر ہر قدم پہ یاس محبت میں تھی مگر ۔۔۔ کیا کیا اُمنگ پر دلِ امیدوار تھا

پھر کیا ہوا خبر نہیں بعدِ وداعِ دوست ۔۔۔ میں اشکبار اِدھر وہ اُدھر اشکبار تھا

سمجھا جسے نشاط وہ تمہیدِ رنج تھی ۔۔۔ سمجھا جسے بہار فریبِ بہار تھا

ان کسلمندیوں پہ نہ جائے کوئی مری ۔۔۔ دنیا کبھی شراب تھی میں بادہ خوار تھا

نشترؔ خوشی سے چھوڑ کے دنیا کو چل دیا
۱۶ ۲۷
صدمہ ہوا انھیں کو جنھیں اس سے پیار تھا

دور تھا خالق سے جبتک بستۂ ادراک تھا
اس سے جب آگے بڑھا میں تھا خدائے پاک تھا

سوزِ فرقت سے جگر صد پارہ، دل صد چاک تھا
سچ اگر پوچھو تو لطفِ عاشقی کیا خاک تھا

کس غضب کا تھا سماں کیا وقتِ حسرتناک تھا
وہ اِدھر آئے اُدھر عاشق کا قصہ پاک تھا

ادعائے عشق پروانے سے کیا کرتا کوئی
دیکھتے ہی دیکھتے جل بھن کے ظالم خاک تھا

رفتہ رفتہ میں نے ان سے صاف دل کو کر لیا
آرزوئیں تھیں کہ انبارِ خس و خاشاک تھا

کچھ مجھے آتا تھا رونا کچھ ہنسی انسان پر
دو دن کی لیتا تھا گو صرف ایک مشتِ خاک تھا

کیوں کسی کی موت پر آخر یہ شیون یہ بکا
خاک میں ملنے سے پہلے بھی یہ انساں خاک تھا

کب گوارا تھا کہ دستِ حسن گرد آلود ہو
جبتک آئیں آئیں وہ عاشق سپردِ خاک تھا

ہیچ سمجھا ہم نے جس دن سے بساطِ دہر کو
آنکھ اُٹھی جس طرف اپنی خدائی پاک تھا

غم ملا تو خوش رہے۔ خوشیاں ملیں تو خوش رہے
کوئی صورت تھی یہاں شکرِ خدائے پاک تھا

کل عجب انداز سے جاتے تھے نشترؔ شام کو
۱۷ ۱۲
آستین نکلی ہوئی تھی اور گریباں چاک تھا

پرسش کے وقت عرصۂ محشر سے ٹل گیا
سوجھی نہ اور کچھ تو میں یہ چال چل گیا

کنجِ قفس میں یوں بھی مرا کام چل گیا
ذکرِ بہار کر لیا اور دل بہل گیا

مرنے کے بعد کون کسے پوچھتا ہے پھر
ہاں نام آگیا تو کبھی ذکر چل گیا

میرا کہا سُنا نظر انداز کیجئے
کچھ کہہ رہا تھا کچھ مرے مُنہ سے نکل گیا

آتے ہیں انقلاب تو ہوتا نہیں اثر
آئینِ انقلاب ہی شاید بدل گیا

کیوں سُونی سُونی سی نظر آتی ہے بزم آج
محفل سے کون بے سر و ساماں نکل گیا

آئے وہ میرے دل میں تو جاتے رہے حواس
یعنی وہ اندر آئے میں باہر نکل گیا

کیا چلتے چلتے اُس نے خدا جانے کہہ دیا
تھا دل کو کچھ سکون مگر پھر مچل گیا

برہم نظر ہے سب کی۔ زمیں ہو کہ آسماں
تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا

پوچھے نہ کوئی ہم سے شبِ غم کی واردات
وقت آ چکا تھا خیر یہ گذری کہ ٹل گیا

کعبے سے دوستی نہ کلیسا سے دشمنی
ہم جب ڈگر پہ چلنے لگے کام چل گیا

تقدیر کو رسا کہوں یا نارسا کہوں
منزل کی دُھن میں محو تھا آگے نکل گیا

رہنے کی یہ جگہ نہیں دُنیا حقیقتاً
زنداں سے جو نکل گیا اچھا نکل گیا

یوں ہی گذار دی غمِ فرقت میں زندگی
گلشن سے دل پھرا سوئے صحرا نکل گیا

منزل نہ آئی عمر پس و پیش میں کٹی
پیچھے کبھی رہا کبھی آگے نکل گیا

ہمدردیوں کا حال مری تھا یہ عمر بھر
مرنا سُنا کسی کا مرا دم نکل گیا

انسان کی یہ آمد و شد بھی عجیب ہے
آیا بکامِ زیست، بکامِ اجل گیا

انسان ہو کے جھیل رہا ہے تبِ فراق
پروانہ سوزِ غم سے سرِ شمع جل گیا

اتنی سی بات کے لئے اتنا ملال تھا
دو آنسوؤں سے حشر میں سب کام چل گیا

امسال اپنا جوشِ جنوں میں یہ حال تھا
دامن رفو کیا تو گریباں نکل گیا

مانا کہ ہوش میں نہ رہے حضرتِ کلیم

۱۸ ارمانِ دیدِ یار تو **نشتر** نکل گیا ۲۱

کچھ رنگ اور ہی ہے دلِ بیقرار کا
کیا پھر قریب آگیا موسم بہار کا

انداز کیا بتائیں غمِ روزگار کا
فصلِ خزاں میں لطف ہمیں ہے بہار کا

کوسوں پتہ نہیں ہے شکیب و قرار کا
حافظ ہے اب خدا دلِ بے اختیار کا

ہیں بادہ خوار حضرتِ واعظ ابھی کہاں
سینے میں دل ضرور ہے اک بادہ خوار کا

ہے نامرادیوں میں جو اُمید کی جھلک
میری خزاں میں رنگ ہے فصلِ بہار کا

ہونگی سکوں مآل یہی بیقراریاں
پہلو انہیں سے کوئی ملیگا قرار کا

کیوں انتظارِ روزِ قیامت سے میں ڈروں
پہلا سبق نہیں یہ مرے انتظار کا

مدت ہوئی قفس سے ہیں آنکھیں لڑی ہوئی
اب ہم کہاں کہاں وہ تماشا بہار کا

بیٹھا ہوں بجلیوں کے تڑپنے کا منتظر
ہر شاخ گا رہی ہے ترانہ بہار کا

اے برقِ حسنِ یار یہ کیا ستم کیا
خرمن جلادیا مرے صبر و قرار کا

صیاد کچھ خبر بھی تجھے ہے۔ ترا اسیر
سب رنگ لیچلا ہے چمن سے بہار کا

ابتو بہار آتے ہی بڑھتا ہے دردِ دل
ہوتا تھا بیشتر یہ زمانہ قرار کا

صیاد مجھکو شوق سے لیچل چمن سے دور
قایم رہے جو رنگ چمن میں بہار کا

صحرا نوردیوں کو زمانہ گذر گیا
ابتک نشان پانوں میں ہے نوکِ خار کا

جس باغ پر ہے ناز تجھے باغباں بہت
اک عکس ہے وہ میرے دلِ داغدار کا

رنج و خوشی میں دیکھے ہمیں لطف ایک سا
قصہ کرو بھی ختم خزان و بہار کا

سنتے جو ہمصفیر تو نالوں کا لطف تھا
اب کیا قفس میں بیٹھ کے رونا بہار کا

اہلِ قفس پہ کون گراتا ہے بجلیاں
چھیڑا ہے کس نے پھر یہ ترانہ بہار کا

فصلِ خزاں میں جو تجھے رکھتا ہے شاد شاد
غافل وہی تو فیض ہے پچھلی بہار کا

دامانِ آستین کے رفو ہو سکے نہ چاک
پھر آگیا قریب زمانہ بہار کا

امید تھی سو یاس سے وہ بھی بدل گئی
اب کون رہ گیا دلِ امیدوار کا

رکھا تھا پاؤں بزم میں نشتر کہ لٹ گیا
آیا تھا دل میں لیکے خزانہ قرار کا

۱۹ ۲۳

اسے کب حقیقت کا عرفان ہوگا
نہ جانے کب انسان انسان ہوگا

وفا کی اگر، دل پریشان ہوگا
جفائیں کئے جاؤ احسان ہوگا

اگر حشر میں دل پشیمان ہوگا
مرے ہاتھ محشر کا میدان ہوگا

اگر دل میں تیرا نہ ارمان ہوگا
یہ انسان ہرگز نہ انسان ہوگا

ہے لازم توازن وفا و جفا میں
حساب انکا اک روز نادان ہوگا

اگر کفر ہے عشق کیشی ہماری
تو یہ کفر دنیا کا ایمان ہوگا

وفا وجہ احساں نہ اب ہو سکیگی
جفا کیجے گا تو احسان ہوگا

قناعت نہ دلمیں سمائیگی جبتک
یہ ارمان ہوگا وہ ارمان ہوگا

نہیں کھیل دنیا میں انسان ہونا
کوئی ایک لاکھوں میں انسان ہوگا

قدم ضبط کے دل میں جس روز آئے — نہ حسرت رہیگی نہ ارمان ہوگا
پڑیگا بُرا وقت محشر میں ہم پر — وہاں بھی اگر تیرا ارمان ہوگا
خبر اُس کو مرنے کی میرے نہ دینا — سُنے گا تو ناحق پریشان ہوگا
وہیں تک تو دردِ محبت بڑھیگا — جہانتک کہ بڑھنے کا اِمکان ہوگا
وہ میری گذارش، کہ آپ آئینگے پھر — وہ کہنا کسیکا "جو اِمکان ہوگا"
یوں ہی ہوتا آیا ہے روزِ ازل سے — جو آباد ہوگا وہ ویران ہوگا
جہاں اونچے اونچے محل دیکھتے ہو — وہاں ایک دن صاف میدان ہوگا
کہانتک سکے جائیں ارمان ظالم — کبھی کوئی پورا بھی ارمان ہوگا
کبھی وہ بھی دن ہوگا اے وحشتِ دل — مرا ہاتھ تیرا گریبان ہوگا
جو ترکِ محبت کا حامی ہو ناصح — کہانتک وہ انسان انسان ہوگا
جھکے گا تری یاد میں نفسِ سرکش — یہ کافر بھی اکدن مسلمان ہوگا
کوئی دم کا مہماں ہے بیمارِ الفت — کرم کیجئے گا تو احسان ہوگا
محبت کو کتنا ہی کوئی چھپائے — محبت کا دنیا میں اعلان ہوگا

۲۰ جسے کفر دنیا سمجھتی ہے **نشتر** ۲۳
یہی ساری دنیا کا ایمان ہوگا

تکمیلِ وفا موت کو اے دل نہ سمجھنا — منزل یہ نہیں ہے اسے منزل نہ سمجھنا
آساں نہ ہو دل کو جسے "دل نہ سمجھنا" — اُس آدمی کو عشق کے قابل نہ سمجھنا

عاشق کیلئے عشق میں فرض ہے پہلا
ہو کتنی ہی مشکل اُسے مشکل نہ سمجھنا

منزل سے کبھی خود ہی میں ہٹ جاتا ہوں اپنی
اس کو مری گمراہیٔ منزل نہ سمجھنا

جلنا ہے مسلسل ابدی سوز ہے میرا
انسان ہوں پروانۂ محفل نہ سمجھنا

دیوانۂ منزل جو نہ منزل کے لئے ہو
زنہار اُسے طالب منزل نہ سمجھنا

عاشق کے لئے عجز کی معراج یہی ہے
اپنے کو کبھی آپ کے قابل نہ سمجھنا

ہر چرخ کا تارہ مہِ کامل نہیں ہوتا
ہر آدمی کو رہبرِ کامل نہ سمجھنا

اک روز یہ پہونچائیگی منزل پہ یقینی
بیکار مری حسرتِ منزل نہ سمجھنا

کیا جانئے کہاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کیا کیا
عشاق کو آوارۂ منزل نہ سمجھنا

لائیگی تمھیں کھینچ کے کتنا ہی کھچو تم
تاثیر سے خالی کششِ دل نہ سمجھنا

دھوکے ہیں رہِ منزلِ مقصد میں ہزاروں
ہر گرد کو گردِ رہِ منزل نہ سمجھنا

تھک راستے میں اس لئے ٹھہرا ہوں ذرا میں
دیر اور حرم کو مری منزل نہ سمجھنا

عشق ان سے کیا ہے تو کرو شوق سے نشتر
دل کو مگر اب اپنے کبھی دل نہ سمجھنا

۲۱ ۱۴

جب علم نہ تھا مجھ کو تو تقدیر میں کیا تھا
پھر زورِ مری کوشش تدبیر میں کیا تھا

اک جذبۂ فطری تھی مری قیدِ قفس بھی
صیاد مرے پاؤں کی زنجیر میں کیا تھا

اُف میری محبت کا یہ انجام صد افسوس
تھا خواب میں کیا خواب کی تعبیر میں کیا تھا

یکبارگی وہ دیکھ کے بھرنے لگے آہیں
یہ رنگ مرے عالمِ تصویر میں کیا تھا!

ہم نے تو محبت کسی امید پہ کی تھی
تھی کس کو خبر پردۂ تقدیر میں کیا تھا

قاتل ترے ہاتھوں کی صفائی پہ مرا ہوں
یوں تو وہی شمشیر تھی شمشیر میں کیا تھا

وہ آئے تو پھر آگئی قالب میں نئی جان
سب جانتے ہیں عاشقِ دلگیر میں کیا تھا

اس پیکرِ خاکی میں اگر جان نہ ہوتی
تصویر ہی تصویر تھی تصویر میں کیا تھا

سب بھول گئیں توبہ مے کی ہمیں باتیں
کیا جانئے ساقی تری تقریر میں کیا تھا

کیوں آج مرا حال محبت میں یہ ہوتا
اے کاش خبر ہوتی کہ تقدیر میں کیا تھا

انجامِ محبت کا گلہ کس سے کروں میں
کیا سوچا تھا اور مری تقدیر میں کیا تھا

طرزِ سخنِ میر پہ سب لوٹ ہیں نشتر
کھلتا نہیں طرزِ سخنِ میر میں کیا تھا

وابستۂ صیاد تھا در اصل میں نشتر
بس نام کی زنجیر تھی زنجیر میں کیا تھا

۲۲ ۱۳

خواہشِ وصل پہ اب ہوں میں پشیماں کیا کیا
لطف دیتا تھا الٰہی غمِ جاناں کیا کیا

داغ کیا کیا مرے پہلو میں ہیں الماں کیا کیا
لے کے نکلا ہوں تری بزم سے ساماں کیا کیا

ہیں نگاہیں مری کچھ روبرو ہے حیراں کیا کیا
پردۂ دل سے نہ جانے ہے نمایاں کیا کیا

رنگ لایا ہے بہاروں میں گلستاں کیا کیا
بلبلیں باغ میں ہر سو ہیں غزلخواں کیا کیا

اہلِ بیداد جو یہ آج نظر آتے ہیں
دیکھنا حشر میں کل ہونگے پشیماں کیا کیا

ہم گلستاں میں اسیری کے وہ دن بھول گئے
یاد آتا تھا اسیری میں گلستاں کیا کیا

تیری رنگینیوں اور اپنی اداسی پہ نثار
عشق میں دیکھ لئے باغ و بیاباں کیا کیا

یاد میں پچھلی بہاروں کے وہ اندازِ جنوں
اپنے ہاتھوں سے ہوئے چاک گریباں کیا کیا

مارا پھرتا ہے زمانے میں تو کیوں اے انسان
دلکو بھی دیکھ کبھی اسمیں ہے پنہاں کیا کیا

میں ہی ایسا ہوں کہ جرأت نہیں کرتا کوئی
ورنہ ترغیب دیا کرتے ہیں ارماں کیا کیا

اے بشر ہے تری کوتاہئ ہمت۔ ورنہ
دہر میں تیری ترقی کے ہیں میداں کیا کیا

ہائے وہ دن کہ محبت تھی کسی سے مجھکو
سامنے رہتے تھے میرے سروساماں کیا کیا

کیسے پُرکیف زمانے میں چھُٹا ہم سے چمن
غنچہ و گل سے مرتب تھا گلستاں کیا کیا

ایک ارمان بھی کمبخت نہ نکلا دل سے
لیکے آیا تھا تری بزم میں ارماں کیا کیا

رسمِ توبہ شکنی آج ادا ہو جائے
ابرِ شاداب فضاؤں پہ ہیں رقصاں کیا کیا

آستینوں کا پتہ ہے نہ گریبانوں کا
جمع ہیں اہلِ جنوں بے سروساماں کیا کیا

عمر بھر دل سے نکلتے ہیں مگر اے نشترؔ
۲۳ پھر بھی رہجاتے ہیں انسان کے ارماں کیا کیا ۱۷

کون سا آپکا وعدہ تھا جو باطل نہ ہوا
پھر بھی مایوس یہ کمبخت مرا دل نہ ہوا

بعدِ کوشش بھی تو دل آپکے قابل نہ ہوا
لاکھ چاہا اسے ہو جائے مگر دل نہ ہوا!

کھینچ لاتی اُنھیں بالیں پہ مریضِ غم کی
تجھ سے اتنا بھی کبھی کششِ دل نہ ہوا

میری مرضی کے خلاف اسکی رہی ہر رفتار
میرا دل ہو کے محبت میں مرا دل نہ ہوا

دلِ نافہم قدم عشق کی منزل میں نہ رکھ
کوئی اس راہ میں آسودۂ منزل نہ ہوا

رات دن رکھتے ہو رنجور کوئی بات بھی ہے
اک مذاق آپکے نزدیک ہوا دل نہ ہوا

منزلِ عشق بھی دراصل عجب منزل ہے — نہ ملی اُس کو جو آوارہ منزل نہ ہوا
بے نیازی سے تری عشق و محبت کا مزہ — مجھکو حاصل جو نہ ہونا تھا تو حاصل نہ ہوا
پاس منزل کے پہونچ کر یہ پلٹنا میرا — آہ اِسوقت کوئی واقفِ منزل نہ ہوا
خوف کیا بحرِ محبت سے کہ پیراک ہیں ہم — خود بنایا وہیں ساحل جہاں ساحل نہ ہوا
تھا وہی آپ کے دیدار کا سچا حقدار — پردۂ دید جسے پردۂ محمل نہ ہوا
مجھ سا غم دوست زمانے میں نہ ہوگا کوئی — غم کبھی موجبِ افسردگیٔ دل نہ ہوا
قابلِ فخر مرے دل کی یہ اک بات رہی — لاکھ بیدل کیا تو نے اسے بیدل نہ ہوا
ہوشیاری ہے محبت میں دلیلِ غفلت — کیا میں ہشیار کہوں اُسکو جو غافل نہ ہوا

بعد مرنے کے گئے فکر کسی کی نشتر
کوئی جو شُدہ خاکسترِ محفل نہ ہوا

٢٤ — 15

یہ رات دن کا غمِ انتظار - کیا ہوگا — رہے اگر یہ ہی لیل و نہار کیا ہوگا
شبِ فراق کی تنہائیاں - معاذ اللہ — یہاں یہ حال ہے زیرِ مزار کیا ہوگا
شمار سے کہیں باہر گناہ ہیں میرے — یہ ڈر رہا ہوں کہ روزِ شمار کیا ہوگا
ابھی سے فکرِ جنوں میں یہ حال ہے اپنا — چمن میں آئیگی جس دن بہار کیا ہوگا
یہی جو روز فزوں بیقراریاں ہیں تری — تو آگے چلکے دلِ بیقرار کیا ہوگا
سبب کو ڈھونڈ یہاں - ہے یہ عالمِ اسباب — جو اضطراب نہ ہوگا قرار کیا ہوگا
جسے تلاش تھی زندگی میں شہرت کی — پسِ فنا اُسے سنگِ مزار کیا ہوگا

خدا کے ہاتھ ہے۔ اب دیکھیں کس کی بات رہے
یہ توبہ اور یہ ابرِ بہار، کیا ہوگا

ہزار پردوں میں عاشق سے چھپ کے بیٹھے ہو
تمہاری طرح کوئی پردہ دار کیا ہوگا

عجب شراب جوانی ہے آدمی کے لئے
جو نشّہ یہ ہے تو اسکا خمار کیا ہوگا

شبِ فراق بتا تو سہی ہمیں ظالم
رہا یونہی جو ترا انتظار، کیا ہوگا

وہ خاک عشق کرے جسکے دل میں درد نہیں
جو تیر ہی نہ لگے گا تو پار کیا ہوگا

کسی کے کام ہی آجائے تو غنیمت ہے
کہ یوں بھی یہ مرا مشتِ غبار کیا ہوگا

وہ جھوٹے وعدے بھی کرتے نہیں ہیں کچھ دن سے
سمجھ لیا ہے مجھے اعتبار کیا ہوگا

کسی کا دل تو مرے ہاتھ رکھکے یوں کہنا
یہ بیقرارِ ازل ہے قرار کیا ہوگا

نہیں وہ غیرتِ ابرِ بہار جب نشتر
تو پھر یہ جامِ مے خوشگوار کیا ہوگا

۲۵ ۱٦

افسوس سراغِ رہِ منزل نہیں ملتا
رہبر کوئی تقلید کے قابل نہیں ملتا

کیوں اے نگہِ دوست کہیں دل نہیں ملتا
سب چھان لی خاکسترِ محفل نہیں ملتا

بے حد نہ ستاؤ اسے مانو مرا کہنا
جب ہاتھ سے جاتا ہے تو پھر دل نہیں ملتا

بیداد مجھی پر نہ کریں وہ تو کریں کیا
کوئی انھیں بیداد کے قابل نہیں ملتا

اے شمع بتا تو ہی اگر تجھ کو خبر ہو
بیچارہ وہ پروانۂ محفل نہیں ملتا

دیدی ہے رخِ یار سے تشبیہ جو اس کو
پھر آج مزاجِ مہِ کامل نہیں ملتا

اس الفت ناصح سے بھی اللہ بچائے
ملتی ہے جہاں آنکھ وہاں دل نہیں ملتا

دیکھے تو کوئی وسعتیں اس بزمِ جہاں کی
ڈھونڈا ہی کرو صاحبِ محفل نہیں ملتا

ہم آنکھ ملانے کو ترستے رہے پہلے
آنکھ اُن سے ملائی ہے تو اب دل نہیں ملتا

کیوں روزِ ازل لیکے دل آفت میں پڑے ہم
سنتے ہیں کہ بے مانگے وہاں دل نہیں ملتا

منظور تماشا ہے تو دریا میں اُتر جا
دریا کا تلاطم لبِ ساحل نہیں ملتا

آغاز میں دریائے محبت نہیں کچھ بھی
کچھ روز میں کمبخت کا ساحل نہیں ملتا

اپنا تو ہے یہ قول کوئی کچھ بھی کہے جائے
ملتا نہیں کچھ عشق میں جب دل نہیں ملتا

ہو فرق دلوں میں تو کبھی دل نہیں ملتے
ساحل سے کبھی دوسرا ساحل نہیں ملتا

پورا نہیں ہوتا کبھی ارمانِ شہادت
جبتک کہ گلے خنجرِ قاتل نہیں ملتا

منزل کے نہ ملنے میں قصور اُسکا نہیں ہے
منزل کو کوئی طالبِ منزل نہیں ملتا

جب دل سے کوئی راہی منزل نہیں ہوتا
منزل کا پتہ سینکڑوں منزل نہیں ملتا

پروانۂ محفل کے سوا اور کسی کو
کیوں عالمِ خاکسترِ محفل نہیں ملتا

کیوں سارے زمانے کے ستم ہیں مرے دل پر
کیا اور ستانے کو تمھیں دل نہیں ملتا

٢٦ مرضی نہیں ہوتی ہے اگر اسکی تو نشتر
دو ہاتھ قریب آکے بھی ساحل نہیں ملتا ٢٠

یہ طریقہ تھا مرا جبتک میں اس گلشن میں تھا
ہو کسی کی آنکھ کا آنسو مرے دامن میں تھا

پتی پتی پر ترا احساں ہے اے ابرِ بہار
ایک پتہ بھی ہرا پہلے کہیں گلشن میں تھا؟

چاہے جس سے پوچھ لو جب جوشِ وحشت تھا مجھے
تار کوئی ایک بھی باقی مرے دامن میں تھا؟

منظرِ گلشن تصور میں تھا ہر دم سامنے
قید میں بھی تھا یونہی جس طرح میں گلشن میں تھا

جان دیدیتا نہ گر عاشق تو کیا کرتا غریب
یوں بھی آخر تفرقہ ہر وقت روح و تن میں تھا

ہمتو یونہی دیکھتے آئے ہیں اس گلشن کا رنگ
پھول جو کل شاخ پر تھا آج وہ دامن میں تھا

رنگ کیا اپنا دکھاتے ہیں جوانانِ چمن
اب نہیں تو کیا ہوا۔ میں بھی کبھی ہر فن میں تھا

میں نے یوں قایم کیا تھا رشتۂ انسانیت
چاک دامن میں کسیکے تھا مرے دامن میں تھا

مل سکا لطفِ اسیری کچھ۔ نہ کچھ لطفِ چمن
چار دن زنداں میں تھا میں چار دن گلشن میں تھا

ہائے وہ آغازِ الفت۔ ہائے وہ پہلی نظر
سارا رازِ عاشقی پنہاں اُسی چتون میں تھا

حضرتِ موسیٰ تو اک پردہ تھے ذوقِ دید کا
دیکھنے والا ابھی تو ہی وادیِ ایمن میں تھا

میری آزادی میں حائل کب ہوئی قیدِ قفس
بند کر لی آنکھ جب میں نے بھرے گلشن میں تھا

تیری بخشش کی تو کوئی حد نہ تھی میرے کریم
نقص جو کچھ تھا مری کوتاہیِ دامن میں تھا

اب کے فصلِ گل میں تھا جوشِ جنوں اس رنگ پر
چاک اکدن آستیں میں اکدن دامن میں تھا

یاد ہے مجھکو چمن سے وہ بچھڑنے کا سماں
٢٧ ایک سناٹا سا نشتر ہر طرف گلشن میں تھا 15

کہاں وہ شوخ نہیں ہے کہاں نہیں ملتا
مگر جو دل سے نہ ڈھونڈو تو ہاں نہیں ملتا

عجب حال ہے اس گلستانِ عالم کا
بڑی تلاش سے بھی باغباں نہیں ملتا

تہِ زمیں کی خدا کو خبر ہے۔ وہ جانے
کسیکو چین تہِ آسماں نہیں ملتا

لگا رہا ہوں میں دونوں جہان کے چکر
مگر وہ مالکِ ہر دو جہاں نہیں ملتا

مزہ جو ضبطِ محبت میں ہے کسی میں نہیں
یہ ہے ضرور کہ لطفِ فغاں نہیں ملتا

مجھے یہ رنج کہ سنتے نہیں کبھی وہ مری
انھیں یہ غم کہ کوئی بے زباں نہیں ملتا

بڑے جو ہوتے ہیں ملتے نہیں وہ چھوٹوں سے
زمیں سے جھک کے کبھی آسماں نہیں ملتا

نشاطِ دہر کے دھوکے انھیں کو ہوتے ہیں
جنھیں تمہارا غمِ جاوداں نہیں ملتا

کوئی جو بھاگ کے جائے بھی تو کہاں جائے
زمیں کہاں ہے جہاں آسماں نہیں ملتا

تلاش اسکی ہے اے دل تو ڈھونڈھ اپنے میں
وہاں تلاش ہے ناحق جہاں نہیں ملتا

کسی کی موت پہ روتی ہے کائنات تمام
کسیکو بعدِ فنا نوحہ خواں نہیں ملتا

ترے چمن کی بہاریں تو چار دن کی ہیں
مگر مزاج ترا باغباں نہیں ملتا

فضول اُسکے نہ ملنے کا ہے گلہ سب کو
تلاش اُسکی وہاں ہی جہاں نہیں ملتا

ہو دل شگفتہ تو ایسا نہیں مقام کوئی
قدم قدم پہ جہاں گلستاں نہیں ملتا

زمین والوں کو کمبخت کھائے جاتا ہے
اس آسماں کو کوئی آسماں نہیں ملتا

مزہ یہ ہے وہیں مٹنے کو چاہتا ہے دل بہ
جہاں غبارِ پسِ کارواں نہیں ملتا

جو آدمی بھی ہے نشتر تو آدمی وہ نہیں
۲۸ جسے سرورِ غمِ جاوداں نہیں ملتا ۱۷

پاس ہی میرے سہی لیکن ضرور اتنا تو تھا
عمر بھر ڈھونڈا کیا میں تجھکو۔ دور اتنا تو تھا

تھا قصور امکان میں میرے ضرور اتنا تو تھا
کیوں خطا میں نے نہ کی۔ میرا قصور اتنا تو تھا

جرم بھی احساسِ رحمت پر، قصور اتنا تو تھا
اور تھا کچھ یا نہ تھا مجھکو شعور اتنا تو تھا

میں نے یہ مانا کہ تھا وہ میرے دل میں جلوہ گر
پھر بھی پنہاں تھا مری نظروں سے - دُور اتنا تو تھا

جب زیادہ ہو گئے ہیں ظلم - فرمایا ہے رحم
اپنے عاشق کا لحاظ اُن کو ضرور اتنا تو تھا

منحرف بادہ کشی سے عمر بھر واعظ رہا
شایقِ خلدِ بریں مشتاقِ حور اتنا تو تھا

زندہ رہکر عشق میں جلنا ہے تہذیبِ وفا
جان پروانے نے دیدی بے شعور اتنا تو تھا

ہو گئی دنیا پہ کمزوری نگاہوں کی عیاں
قصۂ برقِ جمال و کوہِ طور اتنا تو تھا

میں نے مانا کچھ نہ تھا بادہ کشی میں واعظو
دل میں اور آنکھوں میں تھا ہر دم سُرور اتنا تو تھا

اور اگر کوئی نہ تھی میرا خطا میرا قصور
عرصۂ محشر میں تھا میں بے قصور اتنا تو تھا

کیوں نہ ہوتا مستحقِ رحمتِ پروردگار
سر سے پا تک تھا میں تصویرِ قصور - اتنا تو تھا

وادیٔ ایمن میں آنا ہی پڑا آخر تجھے
میری آنکھوں کو ترا ارمانِ نور - اتنا تو تھا

اپنے دل پر وادیٔ ایمن کا رہتا تھا یقین
تیرے جلووں کا مرے دل میں ظہور - اتنا تو تھا

سب مجھے بھولے ہوئے تھے رنج و آلامِ جہاں
عشق میں تیرے مجھے - حاصل سرور اتنا تو تھا

کاش تو تھوڑی سی توفیق اور دیدیتا مجھے
چھوڑ دیتا میں زمانے کو - نفور اتنا تو تھا

ہمکو تیری بات ہی رکھنی تھی کوہِ طور پر
دیکھ سکتے تھے تجھے آنکھوں میں نور اتنا تو تھا

تھا کرم اُسکا نہ آئی آنچ مجھ پر ورنہ آج
میں بھی جل جاتا قریبِ کوہِ طور اتنا تو تھا

منتظر تھا میں ترا - بیشک یہ تھا میرا قصور
تو نہ آیا شب کو - تیرا بھی قصور اتنا تو تھا

خیر مانا میں نے نشتر کچھ نہ تھا میرا قصور
میں قصور اُنکا سمجھتا تھا - قصور اتنا تو تھا

مجھ کو پابندِ سوز و ساز کیا — کیوں نہ دونوں سے بے نیاز کیا
مُفتِ حیرانِ امتیاز کیا — کیوں مجھے مائلِ مجاز کیا
کچھ نہ تم نے کہا نہ کچھ ہم نے — کس نے پھر انکشافِ راز کیا
بیخودی ہم تجھے نہ بھولیں گے — تُو نے دُنیا سے بے نیاز کیا
موت اور عشق ایک تھے دونوں — ہم نے کیوں انہیں امتیاز کیا
جب تو دنیا کا حال تھا یا رب — کیوں نہ دُنیا سے بے نیاز کیا
موت بھی محترز رہی اُس سے — جس نے جینے سے احتراز کیا
فاش میرا نہ کوئی راز ہوا — میں نے جبتک نہ فاش راز کیا
عشق میں بیخودی کا قایل ہوں — جینے مرنے سے بے نیاز کیا
اک نہ اک رُک ہوئی ضرور ہمیں — جب کبھی عاشقی پہ ناز کیا
ہو مبارک وفا کے بندوں کو — حُسن نے عاشقی پہ ناز کیا
آدمی آدمی نہیں جس نے — مرنے جینے میں امتیاز کیا
جب چھپانے کی میں نے کوشش کی — فاش آنکھوں نے میرا راز کیا
جب کوئی اُسنے تازہ کی بیداد — ہم نے قسمت پر اپنی ناز کیا

٣٠ مہرِ محشر نے آخر اے نشتر
میری تر دامنی سے ساز کیا ١٥

ہوا ہوں بیتاب دیکھنے کو۔ میں جب رخِ بے حجاب تیرا

ہوائے شوقِ نظر نے میری اُلٹ دیا ہے نقاب تیرا
بلا کی حکمت۔ غضب کی قدرت۔ ستم کا یہ انتظامِ دُنیا
ہوا ہے کوئی جواب تیرا۔ نہ ہوگا کوئی جواب تیرا
رکھا ہے اے ہوش تو نے ظالم۔ نہ اِس جہاں کا نہ اُس جہاں کا
پھنسا دیا آفتوں میں مجھ کو۔ بُرا ہو خانہ خراب تیرا
بہت بھروسا تھا میرے دل کو۔ تری عنایت کا حشر کے دن
کہاں دیا آکے تو نے دھوکا۔ بُرا ہو چشمِ پُرآب تیرا
نہ چھوڑ واعظ تو وعظ اپنا۔ نہ چھوڑوں میں اپنی بادہ نوشی
زمانہ دیکھے گا حشر کے دن۔ عذاب میرا ثواب تیرا
نہ اِسکے پھندے میں پھنس تو اے دل۔ نہ اپنا ہو اک گھڑی بھی مائل
نہ یہ ہوا ہے کبھی کسی کا۔ نہ ہو جہانِ خراب تیرا
جو صبح سے بیقراریوں کا تری یہ عالم ہے قلبِ مضطر
ابھی تو دن بھر پڑا ہے ظالم۔ کریگا کیا اضطراب تیرا؟
نہ جانے کیا پیش آتی اے دل۔ تھا زندہ رہنا بھی تیرا مشکل
اگر نہ بٹ جاتا برق و سیماب میں غم و اضطراب تیرا
کسی کی خوشیوں کی حد نہیں ہے۔ کوئی مرا جا رہا ہے غم سے
ستم بھی ہے بے پناہ تیرا۔ کرم بھی ہے بے حساب تیرا

مجھے تو رہ رہ کے رونا آتا ہے تجھ پہ واعظ قسم خدا کی
یہ ہجو مے رات دن کی تیری۔ یہ دورِ عہدِ شباب تیرا
عجیب غمدوست کر دیا ہے۔ جفائیں کر کر کے۔ دلکو تو نے
ستم میں لطفِ ستم نہیں ہے۔ کرم ہے لیکن عتاب تیرا
اسی نے ممکن ہے لیلیا ہو۔ وہ ہی بتائے گا تجھکو اے دل
سوائے ضبطِ الم کے تھا کون۔ دشمنِ اضطراب تیرا
ہماری فہم و فراست اتنی کہاں کہ سمجھیں رموز تیرے
تمام یہ انتظامِ عالم، ہے اک مطول کتاب تیرا
مریضِ الفت کی نعش پر وہ۔ کسی کا بیتاب ہو کے کہنا
کہاں گیا آج مرنے والے۔ وہ عالمِ اضطراب تیرا
محبت اور عاشقی میں نشتر سکوں کو تو موت جانتا ہے
٣١ چھٹے گا شاید نہ تیرے ہاتھوں سے دامنِ اضطراب تیرا ١٥

کوئی ابھی ابھی ہمیں دیوانہ کر گیا — یہ بھی نہ دیکھ پائے کہ ظالم کدھر گیا
مانا یہ ہم نے جان سے اپنی گذر گیا — پروانہ عاشقی میں مگر نام کر گیا
تیرِ نگاہِ ناز جگر میں اتر گیا — اب دل بھی لاپتہ ہے نہ جانے کدھر گیا
پیری کی ہے نمود۔ دلِ بے خبر سنبھل — پانی کا بھی خیال ہے؟ سر سے گذر گیا
ہم اور سکونِ قلب کی خواہش کریں۔ غلط — انسان مر گیا ہے جہاں دل ٹھہر گیا

کس طرح گذرا عہدِ جوانی نہ پوچھئے
دریا تھا اک چڑھا ہوا آخر اُتر گیا

معلوم ہو تجھے تو بتا اے سکونِ قلب
وہ بیقراریوں کا زمانہ کدھر گیا؟

یارب عدم میں کونسی ایسی ہیں خوبیاں
آیا نہ بھول کر بھی اِدھر جو اُدھر گیا

ناکامیٔ کلیم کا افسوس کچھ نہیں
افسوس ہے تو یہ کہ یقینِ نظر گیا

کیا واردات سن کے کریں کوہِ طور کی
سو مرتبہ ہمیں پہ یہ قصہ گذر گیا

کم ہے شباب سے بھی زمانہ بہار کا
اس کا یہ حال ہے اِدھر آیا اُدھر گیا

اب تو بھی میرے دوست کی لاتی نہیں خبر
تیرا بھی اعتبار نسیمِ سحر گیا

اندھے ہیں جو تجھے نہ محیطِ جہاں کہیں
تو میری ہی نگاہ میں تھا میں جدھر گیا

ہوتی نہ کیوں زمانے کو مجھ سے موافقت
میں بھی اُدھر گیا ہوں زمانہ جدھر گیا

کمبخت بھولتے ہی نہیں واقعاتِ عشق
مدت گذر گئی ہے زمانہ گذر گیا

ساقی کی چشمِ مست نے کیا سحر کر دیا
وہ پاسِ پارسائی و توبہ کدھر گیا

جلوے ہیں اُنکے۔ طور ہے۔ اور ہم ہیں سامنے
اب کوئی اُن سے پوچھے کہ پردہ کدھر گیا؟

ابرِ سیاہ کو بھی ہے کچھ ہم سے دشمنی
سو بار آکے ہجر میں بے چین کر گیا

اللہ جانتا ہے جو حالت ہے ہجر میں
جب سے میری دعاؤں سے نشتر اثر گیا

٣٢ ١٩

واعظ سے ذکرِ ساقی، کیا لطف آرہا تھا
کس کو سنا رہا تھا اور کیا سنا رہا تھا

وہ وقت اور وہ عالم، ہر وقت ہے نظر میں
تم محوِ داستاں تھے اور میں سنا رہا تھا

ہے خوب یاد مجھ کو، جب تم ستا رہے تھے
ہر ذرہ اس زمیں کا مجھ کو ستا رہا تھا

تم خوب وقت پر کل آئے قسم خدا کی
ورنہ مریضِ غم میں باقی ہی کیا رہا تھا

کیا لطفِ زندگی تھا۔ کیا دن تھے زندگی کے
جب میں تڑپ رہا تھا۔ تو آزما رہا تھا

بھولوں خدا کو کیونکر، جب کوئی تھا نہ حامی
اُس وقت ساتھ میرے میرا خدا رہا تھا

جب سے ہے عشق تیرا۔ کوئی نہیں ہے میرا
ہاں دل ضرور کچھ دن دردِ آشنا رہا تھا

وہ کاوشِ شبِ غم، بھولی نہ مجھکو بھولے
تو یاد آ رہا تھا اور میں بھلا رہا تھا

یوں جادۂ وفا میں اک محویت تھی طاری
جس سمت جا رہا تھا۔ اُس سمت جا رہا تھا

کیا دیر سے غرض تھی۔ کیا واسطہ حرم سے
آغاز میں طلب کے، کچھ دن کو آ رہا تھا

اے ضبطِ عشق تو نے کیا کر دیا یہ جادو
کس لطف سے میں بیٹھا آنسو بہا رہا تھا

نادان کوئی مجھ سا، کیا عاشقی میں ہوگا
میں ظلم جانتا تھا وہ آزما رہا تھا

خالق پہ چھوڑنا تھا، بجز جہاں میں سب کچھ
میں ہاتھ پاؤں اپنے ناحق چلا رہا تھا

وہ انتشارِ فرقت، اب کیا بتاؤں نشتر
اک رنگ آ رہا تھا؛ اک رنگ جا رہا تھا

۳۳ 16

دھوکا اخیر وقت پہ ظالم نے کیا دیا
بدلہ تمام عمرِ وفا کا چکا دیا

رحمت کا مستحق مجھے اپنی بنا دیا
اچھا کیا جو تو نے مذاقِ خطا دیا

آنکھوں کو کس نے حسنِ دو عالم دکھا دیا
کس نے حجاب میری نظر سے اٹھا دیا

جب کچھ نہ بن پڑا تو انھیں جان سونپ دی
چلتے چلاتے اور ثبوتِ وفا دیا

انصاف کا یہی تھا تقاضا، تمہیں کہو — نظروں سے مجھ کو شک کی صورت گرا دیا
منزل کہاں کہ اب نہیں منزل کی فکر بھی — چاروں طرف کی دوڑ نے ہمکو تھکا دیا
مقدارِ غم کو دیکھ کے قدرت نے غالباً — جب کچھ نہ بن پڑا، دلِ عاشق بنا دیا
لی اُسنے بھول کر نہ ہماری کبھی خبر — جس کے لیے تمام جہاں کو بھلا دیا
پروائے موتِ زیست میں ہمنے کبھی نہ کی — رکھتا تھا جس کو یاد اُسی کو بھلا دیا
وعدے نے اُنکے، کیا کہیں، تسکین درکنار — کچھ انتشار اور ہمارا بڑھا دیا
بیمار کو خدا پہ مناسب تھا چھوڑنا — ہمدردیوں نے اور مرض کو بڑھا دیا
جلووں کا تیرے شکر کہاں تک ادا کریں — دل کو ہمارے اُدی امین بنا دیا
آمادہ فساد ہیں اشک آج، ضبطِ غم — تُو نے اگر انھیں نہ کہیں راستا دیا
اب مجھ سے بازپرسِ خطا کا سوال کیا — پہلے ہی تو نے کیوں مجھے ذوقِ خطا دیا
جن بیقراریوں سے کبھی تلخ تھی حیات — اُن بیقراریوں ہی نے آخر مزا دیا
پردہ نہیں اب انکا مرا، یہ خبر نہیں — میں نے اُٹھا دیا کہ اُنھوں نے اُٹھا دیا
ہم بیکسی کا شکر کہاں تک ادا کریں — محفل میں اُنکی رنگ ہمارا جما دیا

نشتر نگاہِ ناز نے اُس کو بھی لے لیا
۳۴ — دل رہ گیا تھا ایک گرہ میں لیا دیا — ۱۸

بیتابیٔ دل تو نے مجھ کو۔ ہر طرح سے رسوا کر نہ دیا
کمبخت محبت کو میری۔ دُنیا میں تماشا کر نہ دیا

اے چارہ گرو اب جاتے ہو۔ بالیں مریضِ غم سے کہاں
دعوےٰ تھا اچھا کرنیکا۔ پھر تم نے اچھا کر نہ دیا؟
اے حضرتِ دل بس دیکھ لیا۔ محشر ہی کا ایک بھروسا تھا
وہ نیچی نظریں دھوکا تھیں۔ کرنا تھا تو دعوےٰ کر نہ دیا
ہم کہتے نہ تھے ارمانِ وفا۔ دُنیا میں نہیں ہوتا اچھا
بربادیٔ دل کا سب ساماں ظالم نے مہیّا کر نہ دیا
ہم نے نہ کہا تھا دیکھ اے دل۔ انجامِ تمنّا ٹھیک نہیں
کر کر کے تمنّائیں تو نے، بربادِ تمنّا کر نہ دیا
اے یاس اسی دن کی خاطر۔ دن رات میں تجھ سے ڈرتا تھا
رفتہ رفتہ تو نے آخر۔ بیزارِ تمنّا کر نہ دیا
ہم کہتے نہ تھے اے چارہ گرو۔ یہ درد علاج پذیر نہیں
آخر تم نے ضد سے اپنی۔ درد اور زیادہ کر نہ دیا
کہتا ہی رہا میں روزِ ازل۔ مجبورِ تمنّا کر نہ مجھے
مجبورِ تمنّا کر کے مجھے۔ بربادِ تمنّا کر نہ دیا
ہر روز میں تم سے کہتا تھا۔ بیتاب نہ یوں ہر دم رکھو
اپنے کو رُسوا کر نہ لیا۔ آخر مجھے رُسوا کر نہ دیا
اے داغِ جگر سینے سے تجھے۔ ہر وقت لگائے رہتے تھے

تو نے بھی شبِ فرقت لیکن، دم بھر کو اُجالا کر نہ دیا

ہم کہتے نہ تھے اک روز یہی ہونا ہے محبت میں نشترؔ
تو نے نہ سُنی میری آخر - اپنوں کو پرایا کر نہ دیا ۱۱

۳۵

انقلابِ آسماں - جورِ زمیں ہوتا رہا
میری تنہا جان پر کیا کیا نہیں ہوتا رہا

اپنے رونے کا کسی شامِ غم کیا دیں ثبوت
جو گرا آنسو وہ جذبِ آستیں ہوتا رہا

درحقیقت میں اسی دھوکے میں تو مارا گیا
آپ جو کہتے رہے مجھ کو یقیں ہوتا رہا

دل ترا گھر تھا مگر تو نے نہ لی اسکی خبر
جو چلا آیا وہی اس میں مکیں ہوتا رہا

خوب کی چارہ گروں نے رات دن چارہ گری
درد تھا لیکن جہاں دل ہیں وہیں ہوتا رہا

تیرے عاشق کی جگہ خالی پڑی ہے آج تک
ورنہ ہر وحشی کا کوئی جانشیں ہوتا رہا

یہ ہماری سادگی تھی ابتدائے عشق میں
تجھکو خوش سمجھا کئے تو خشمگیں ہوتا رہا

ہوش مقتل کا ہمیں ہے بس تو اتنا ہی فقط
خوب شورِ آفریں صد آفریں ہوتا رہا

ہمنے وحشت میں نہ کی پروائے جیب و آستیں
جو ہوا وہ حالِ جیب و آستیں ہوتا رہا

تو شفا جس درد کو دیکر گیا تھا چارہ گر
وہ تو ظالم تیرے جانے پر وہیں ہوتا رہا

موت اچھی ہے کہ اب کرتے تو ہیں وہ مجھکو یاد
زندگانی میں تو اتنا بھی نہیں ہوتا رہا

سوچتا ہوں اب کہ دن اچھے وہی تھے عشق کے
جب تری ہر بات کا مجھکو یقیں ہوتا رہا

ہچکیاں آئیں تو آتی ہی رہیں پھر رات بھر
ہو نہ ہو چرچا ہمارا کل کہیں ہوتا رہا

۳۶ میرے اور اغیار کے سجدوں میں نشترؔ فرق تھا

میں نے جو سجدہ کیا نقشِ جبیں ہوتا رہا

کیا سمجھتے تھے، محبّت کا ہوا انجام کیا
اب ہماری رات کیا۔ دن کیا۔ سحر کیا۔ شام کیا

بیقراری سے غرض ہے۔ صبح کیا اور شام کیا
جان ہی لے لیگا میری اے دلِ ناکام کیا

ایکدن کی بات ہو تو شوق سے رہ بیقرار
پھر نہ رات آئیگی اے دل۔ پھر نہ ہوگی شام کیا؟

اے جنونِ عشق بے پروائے دُنیا کر مجھے
چار دن کی زندگی میں نام کیا۔ بدنام کیا

پھنس کے دنیا میں ہے تجھکو آرزوئے وصلِ دوست
یہ ہوس کیسی ہے اے دل۔ یہ خیالِ خام کیا

ہو اگر ہمت تو ہے ان پر بھی اپنا اختیار
گردشِ تقدیر کیسی۔ گردشِ ایام کیا

اب خدا حافظ ہے میرا ایمن آ و فرقت کی رات
صبر تو چلتا ہوا کہکر کہ میرا کام کیا

شام آئی تھی کہ بیمارِ محبّت چل بسا
موت ہی آئی مریضِ غم کی، آئی شام کیا

ہمکو لے چلنے پہ کیوں اصرار ناحق ہے تجھے
تیری بزمِ وعظ میں واعظ ہمارا کام کیا

بھول کر بھی پھر نہیں لیتے ہو تم میری خبر
بھول جاتے ہو یہاں سے اُٹھکے میرا نام کیا

کیوں نہ کرتا میں وفائیں۔ کیوں نہ وہ کرتے ستم
اور مجھکو کام کیا تھا اور اُنھیں تھا کام کیا

حشر میں حرفِ شکایت لب پر آکر رہ گیا
ہمنے سوچا سب کے آگے لیں کسی کا نام کیا!

روزِ فرقت روزِ محشر سے بڑھا جاتا ہے آج
حشر تک دن ہی رہیگا اب نہ ہوگی شام کیا

کوئی کہدیتا یہ خوشیوں سے کہ اپنی راہ لیں
آگیا دل میں غمِ جاناں اب انکا کام کیا

موت انساں کے لئے جب ہے یقینی ایکدن
مرگِ بے ہنگام کیا۔ اور مرگِ باہنگام کیا

دلکو ہوتی ہی نہیں سیری نگاہوں سے تری
جذب میخانے کا میخانہ کریگا جام کیا

تم کو آنا ہے تو آجاتے نہیں کیوں ایک روز
روز یہ امروز و فردا روز صبح و شام کیا

بک گئے جب عشق کے ہاتھوں تو یہ دنیا کہاں
آگئی جس دن اجل پھر زندگی کا کام کیا

کیوں نہیں ہوتیں دعائیں ہجر کی شب مستجاب
عاقبت میں آئیں گی کمبخت میرے کام کیا

زندگی جس طرح بھی کٹ جائے نشتر ٹھیک ہے
چار دن کی بات ہے تکلیف کیا آرام کیا

۳۷ ۲۰

شرابِ پی کے بھی مستِ شراب ہوسکا
رہینِ منتِ کیفِ شباب ہو نہ سکا

کبھی خیال کہیں تھا۔ کبھی خیال کہیں
شبِ فراق غرض محوِ خواب ہو نہ سکا

تمہارے دلکو جو پُر اضطراب کر دیتا
وہ اضطراب مرا اضطراب ہو نہ سکا

کسی کو خانہ خرابی کا رنج ہے اپنی
کسیکو غم کہ میں خانہ خراب ہو نہ سکا

جو بے حساب گناہوں کا مرتکب تھا میں
تو حشر میں کوئی اُنکا حساب ہو نہ سکا

ہزار حُسن کا پتلہ ہو ماہتاب ۔ مگر
تمہارے حُسن کا ابتک جواب ہو نہ سکا

ہے اصل میں وہ ہی خانہ خرابِ دنیا میں
جو تیری راہ میں خانہ خراب ہو نہ سکا

ہزار رنگ سے دنیا پہ ہو گیا ظاہر
جمالِ یار اسیرِ حجاب ہو نہ سکا

وہ عقل کیا جسے پینے سے اجتناب رہا
وہ ہوش کیا جو نثارِ شراب ہو نہ سکا

کس آرزو کو میں رکھوں کسے فنا کر دوں
تمام عمر کیا انتخاب ہو نہ سکا

جلوں نہ میں تو کروں کیا تمہاری محفل میں
پتنگے ہو گئے میں باریاب ہو نہ سکا

نہ اپنی جان دے اسکے لئے دلِ مضطر
کبھی کسیکا جہانِ خراب ہو نہ سکا

تمام مٹ گئے آآ کے انقلاب یہاں
تمہارے دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا

وفا بھی کر کے کوئی روز دیکھ لے ظالم
ترا ستم تو وفا کا جواب ہو نہ سکا

نہ جانے کیں شبِ غم میں نے حکمتیں کیا کیا
کسی طرح بھی تو کم اضطراب ہو نہ سکا

ہماری خواہشِ عصیاں پہ ایکدن غالب
خدا کا شکر ہے، خوفِ عذاب ہو نہ سکا

جوابِ خشک نہ دینا تھا مجھکو محشر میں
ذرا سا کام بھی چشمِ پُرآب ہو نہ سکا

ہماری نیچی نگاہوں نے لیلیا میدان
عتاب پر وہ تُلے بیٹھے عتاب ہو نہ سکا

ہمیں جو رنج اسیری میں ہے تو یہ نشتر
۳۸ کہ ایک روز بھی شغلِ شراب ہو نہ سکا 19

کب میں خوفِ باغباں و برقِ تاباں میں نہ تھا
امن کہتے ہیں جسے میرے گلستاں میں نہ تھا

آج کا مجھکو نہ سمجھے اس گلستاں میں کوئی
میں گلستاں میں تھا جب کوئی گلستاں میں نہ تھا

کر دیا کچھ اور ہی میری نگاہِ شوق نے
یہ مزہ پہلے نگاہِ نازِ جاناں میں نہ تھا

آشنائے باغ و صحرا اُس زمانے سے ہوں میں
جب چمن میں گل نہ تھے، کانٹا بیاباں میں نہ تھا

قید میں بھی باغ سے میرا تعلق تھا وہی
دل مرا گلشن میں تھا، گو میں گلستاں میں نہ تھا

فصلِ گُل کی تھیں تمنائیں، جب آئی فصلِ گل
خوبیٔ قسمت سے میں خود ہی گلستاں میں نہ تھا

یاد ہیں جوشِ جنوں کی وہ جنوں انگیزیاں
تار ثابت ایک بھی جیبِ گریباں میں نہ تھا

بوریے میں تھا فقیری کے فقیروں کو جو لطف
وہ سلیماں کو مزہ تختِ سلیماں میں نہ تھا

آشیانوں کی یہ حالت کیونکر آخر ہو گئی
جب گری بجلی تو کیا کوئی گلستاں میں نہ تھا؟

ہائے وہ ساقی کی نظریں اور وہ مینوشی مری — پی رہا تھا اور کوئی فرق ایماں میں نہ تھا
دن محبت کے نہ بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی — کفر وہ کیا تھا جو داخل مرے ایماں میں نہ تھا
ہے نشاطِ دو جہاں اب دردِ پنہاں پر نثار — اب کہاں وہ دن مزہ جب دردِ پنہاں میں نہ تھا
ہم ہوائے گلستاں کو بھی ترس کر مر گئے — سوئے گلشن ایک بھی سوراخ زنداں میں نہ تھا
فصلِ گل میں جوشِ وحشت جانے کیا ڈھاتا ستم — یہ غنیمت تھا کہ میں صحنِ گلستاں میں نہ تھا
آہ و نالہ میں نہ تھا۔ جو ضبطِ غم میں لطف تھا — جو مزہ تھا دردِ پنہاں میں نمایاں میں نہ تھا
رفتہ رفتہ ہو گیا جب خوگرِ قیدِ قفس — جو مزہ زنداں میں تھا پھر وہ گلستاں میں نہ تھا
کوئے جاناں کے نہ ملنے سے پتہ مجھ کو چلا — دل سے میں شاید سُراغِ کوئے جاناں میں نہ تھا
آرزوئے دیدِ جاناں کب ہوئی پوری مری — جب میں فکرِ آرزوئے دیدِ جاناں میں نہ تھا
قیدِ تنگ و بو سے بہتر تھی کہیں آوارگی — جو بیاباں میں مزہ تھا وہ گلستاں میں نہ تھا
جب رہا ہو کر میں آیا، اہلِ گلشن نے کہا — کچھ گلستاں میں نہ تھا جب تو گلستاں میں نہ تھا
اور سب مخلوق فطرت کے اشاروں پر چلی — جذبۂ انسانیت افسوس انساں میں نہ تھا

ماہِ تاباں سے شناسائی ہماری جب سے ہے
داغ بھی جس وقت نشتر ماہِ تاباں میں نہ تھا

۳۹ — ۲۲

کیا اُٹھائے لطف کوئی گلشنِ ایجاد کا — برق کا کھٹکا کبھی۔ کھٹکا کبھی صیاد کا
ہو نہ ہو کچھ ہو چلا اُس پر اثر فریاد کا — رنگ کچھ بدلا ہوا سا ہے مرے صیاد کا
ہم کو عادی کر دیا کمبخت نے فریاد کا — اب نہ مانیں گے کبھی کہنا دلِ ناشاد کا

بیوفاؤں کی ترقی ۔ باوفاؤں کا زوال
انتظام الٹا ہے اب کچھ عالم ایجاد کا

ہم نے سمجھا عمر بھر اپنا اسے ، اپنا مگر
ایک پتہ بھی نہ نکلا گلشن ایجاد کا

قید ہونے میں بھی ہے مجھکو خوشی اس بات کی
کوئی کھٹکا تو نہ اب باقی رہا صیاد کا

کس برے وقت آپ نے بیداد اپنی ختم کی
جب مزہ لینے لگا دل آپ کی بیداد کا

آج دیکھا میں نے اب تک عمر غفلت میں کٹی
ایک نقشہ دل میں بھی تھا عالم ایجاد کا

جب سے ہم آئے ، نہیں آئی ہوائے گلستاں
رخ کدھر بدلا ہوا ہے خانۂ صیاد کا

وہ مجھے بھولے ہوئے ہیں میں ہوں جنکی یاد میں
کاش میں بھی جانتا ہوتا بھلانا یاد کا

یہ طریقہ بھی ترا ہوتا تو ہو جاتی بسر
ایک دن لطف و کرم کا ایک دن بیداد کا

دیکھئے جس کو اسی کے دلمیں ہے اسکی جگہ
کیا مقدر ہے تمہارے خانماں برباد کا

قید میں رہنے کا تو کچھ غم نہیں مجھ کو مگر
منہ دکھا دیتا کوئی مجھ کو مرے صیاد کا

آج سنتے ہیں اسیر جور نے لی اپنی راہ
کون سا در کھل گیا تھا خانۂ صیاد کا

آگیا کیا قید ہو کر خود جہان رنگ و بو
آج ہے کچھ اور عالم خانۂ صیاد کا

آدمی ہوتا ہے جب زندان عالم میں اسیر
پوچھئے وہ کون موقع ہے مبارکباد کا

کہتے آتے ہیں ازل سے لوگ کہہ سکتے نہیں
کچھ ٹھکانہ ہے ہمارے عشق کی روداد کا

کیا بتائیں ہمنے کیوں کوشش رہائی کی نہ کی
کچھ طبیعت لگ گئی، کچھ پاس تھا صیاد کا

کوئی یہ صیاد سے کہدے رہے وہ ہوشیار
اب مری خاموشیوں میں رنگ ہے فریاد کا

اس طریقہ سے تو شنوائی نہ کچھ اے دل ہوئی
اب طریقہ اور ہونا چاہئے فریاد کا

وائے قسمت لگ گئی مُہرِ خموشی حشر میں — بعد مدت کے ملا تھا ایک دن فریاد کا
میں کہیں بھی ہوں مرا مسکن ہے شہرِ لکھنؤ — سامنے آنکھوں کے نقشہ ہے "امین آباد" کا

میں تو سو جاں سے کروں فریادِ نشتر رات دن
۴۰ سُننے والا بھی تو کوئی ہو مری فریاد کا ۲۳

وہ دیکھ تند و سیہ مست پھر سحاب اُٹھا — ابھی نہ سامنے سے ساغرِ شراب اُٹھا
سحر فروز جو مشرق سے آفتاب اُٹھا — گماں ہوا کہ رُخِ حسن سے نقاب اُٹھا
تمہارے عشق میں جو خانماں خراب اُٹھا — مرے خیال میں دُنیا سے کامیاب اُٹھا
نگاہِ مست کی ساقی اِدھر بھی ایک جھلک — نہیں تو بزم سے میں تشنۂ شراب اُٹھا
وہ ماہِ جا و ہم، وہ ہماری وصل کی رات — غروب چاند ہوا اور آفتاب اُٹھا
یہ کیا حجاب کہیں ہے، کہیں حجاب نہیں — ہے شوقِ جلوہ تو پابندیٔ حجاب اُٹھا
نہ پوچھ مجھ سے محبت کا میری افسانہ — مرا فسانہ ملے گا، کوئی کتاب اُٹھا
ہوا کے ایک تھپیڑے نے کر دیا معدوم — نہ جانے کتنی اُمنگوں سے تھا حباب اُٹھا
خدا کے واسطے رونے سے باز آ ظالم — قیامت آئی نہ لے دیدۂ پُر آب اُٹھا
بساطِ شمع ہوئی، ہم ہوئے کہ مسندِ ناز — اُٹھا جو آپ کی محفل سے وہ خراب اُٹھا
نہ آتے دیر لگی کچھ، نہ دیر کچھ جاتے — اُٹھا نہ یہ بھی کہ میں صورتِ حباب اُٹھا
شبِ فراق قیامت کی رات تھی ظالم — غروب چاند ہوا اور نہ آفتاب اُٹھا
گذر گئی جو گذرنی تھی طور او مجھ پہ — ہزار شکر ترا گوشۂ حجاب اُٹھا

نہیں ہے ہوتا ہی سب کچھ جہاں میں ای غافل — یہ لاکھ پردوں میں اک پردۂ حجاب اُٹھا
تڑپ کے تشنۂ دیدار مر نہ جائے کہیں — اُٹھا اُٹھا رُخِ پرنور سے نقاب اُٹھا
تمھاری جلوہ نمائی بھی اک قیامت تھی — نہ ماہتاب اُٹھا پھر نہ آفتاب اُٹھا

ہزار پردوں سے نشتر وہ آئیں گے باہر
جو شوق بن کے کبھی دشمنِ نقاب اُٹھا

۴۱ ۱۷

میں کب نہ گیا محفل میں تری، گو جب بھی گیا ناکام گیا
میں دن کو گیا، میں شب کو گیا، میں صبح گیا، میں شام گیا
ہم دل کے جانے میں اپنے، کیا دیر بتائیں اے ہمدم
"اب دل کا جانا ٹھہر گیا۔ یہ صبح گیا یا شام گیا"
دل صبر سے پا جاتا تھا سکوں، ہے آج سے وہ بھی منع ہمیں
آرام ذرا مل جاتا تھا، اب آج سے وہ آرام گیا
اے ضبط ترے آجانے سے، گریہ سے تو فرصت ہے لیکن
اشکوں کا نکلنا بند ہوا، تسکین گئی آرام گیا
محفل میں نہ جانا تھا تیری، دل لیکے مجھے ای دشمنِ دل،
اب سوچ یہی ہے شام و سحر، کیوں لیکے دلِ ناکام گیا
یہ بات محبت میں ہمدم۔ ہم نے بخدا اچھی دیکھی
جو کچھ بھی کیا اچھا کہ بُرا۔ سب عشق کے سر الزام گیا

دل عشق میں تم کو دے ہی چکا، اب جان کے لالے ہیں مجھ کو
نازل یہ ہوئی اک اور بلا، انعام گیا اکرام گیا

کیا تجھ سے کہوں ہمدم میں نے، کیا عشق و محبت میں پایا
دُنیا میں ہوئی رسوائی مری، ہاتھوں سے دلِ ناکام گیا

ہر وقت کسی کی یاد میں تھے، کیا لطف سے عشق میں کٹتی تھی
وہ قصہ روز و شب نہ رہا، وہ شغلِ صبح و شام گیا

اے واعظِ ناداں توبہ پر، ناحق ہے مری اصرار تجھے
اُس روز سمجھ لے میں بھی نہیں، جس روز یہ شغلِ جام گیا

یوں جانے کو سب جاتے ہیں، دنیا سے اچھے اور بُرے
ہے جانا اصل میں اُس کا ہی، جو لیکر تیرا نام گیا

اے عشق ترے سائے میں کبھی، تکلیف میں راحت ملتی تھی
جس دن سے مری تکلیف گئی، اُس دن سے مرا آرام گیا

جبتک سمجھا میں سب کچھ ہوں، سچ بات یہ ہے میں کچھ بھی نہ تھا
سب کچھ بخدا نکلا میں ہی، جس دن یہ خیالِ خام گیا

تقدیر سے شکوہ ہے نشتر، افسوس ہے نقصِ گردش پر
ہنگام وطن اجداد کا تھا، اور میں نہ کبھی "ہنگام" گیا

---

۵ قصبہ ہنگام ضلع رائے بریلی۔

یوں دُنیا جو سمجھے سمجھے، اپنا تو عقیدہ ہے نشتر
۴۲ ناکامِ محبت جو نہ گیا، دُنیا سے وہی ناکام گیا ۱۵

سوز بنکر دلمیں آ، یا ساز بنکر دل میں آ — تیری منزل ہے کسی صورت سے اِس منزل میں آ
دیکھ تو کیا دل کی حالت ہوگئی ہے، دل میں آ — پھر خدارا اپنی اِس اُجڑی ہوئی محفل میں آ
یوں تو وہ اس زندگی میں راستے پر آچکا — تو ہی اے منزل رہِ گُم کردۂ منزل میں آ
کیا کرے آخر خیالِ اُنکا بھی کیا قصور ہے — دیکھئے جبکو وہی کہتا ہے میرے دل میں آ
آرزوئیں گھٹ رہی ہیں دلمیں، اُن سے دے نجات — بن میرے احساس کی تسکین میرے دل میں آ
آرزوئیں پوچھ لے، اکدن، دلِ ناشاد کی — یا بلا محفل میں اپنی، یا مری محفل میں آ
ہیں یہاں دشواریاں، آسانیوں کی ذمہ دار — خواہشِ آسانی کی ہے تو نہجِ مشکل میں آ
کوئی مجھ سا بھی نہ ہوگا، رازِ دل سے بیخبر — جو مرے دلمیں ہے، اُس سے کہہ رہا ہوں دل میں آ
آمدِ پروانہ سوز و رفتنِ پروانہ وصل — تو بھی ایسے ہی بھری محفل سے جا، محفل میں آ
تیری لذت کوئی میرے دل سے پوچھے عشق میں — تجھ پہ دل قربان کر دوں اے بیقراریٔ دل میں آ
اے خیالِ یار یوں آنیکا میں قایل نہیں — نام جانے کا نہ لے، اسطرح میرے دل میں آ
وسعتیں اتنی کہاں پائیگا تو اے دردِ عشق — تجھکو آنا ہو تو میرے ہی جہانِ دل میں آ
اے غمِ جاناں حقیقت کیا کوئی سمجھے تری — میرے دل کو قدر ہے تیری، تو میرے دل میں آ
تیرے جلووں سے نگاہِ منتظر خیرہ نہ ہو — ہو سکے تو ایک دن اسطرح بھی محفل میں آ
تمنائے محبت میں ہیں سو سو لذتیں — کس سے میں کہدوں چلی جا، کس سے کہدوں دل میں آ

آج وہ شوقِ شہادت ہے کہ نشتر الاماں
۴۳ تیغِ قاتل سے کوئی کہدے کفِ قاتل میں آ ۱۶

لیجئے وہ نشتر آشفتہ حال آ ہی گیا ۔۔۔ لیکے اپنے ساتھ اک حشرِ خیال آ ہی گیا
آج اُنھیں پچھلی محبت کا خیال آ ہی گیا ۔۔۔ مجھکو محزوں دیکھکر آخر ملال آ ہی گیا
ہجر کی شب کٹ گئی روزِ وصال آ ہی گیا ۔۔۔ زخم ہائے دل کا وقتِ اندمال آ ہی گیا
لیجئے پھر آج ظالم کا خیال آ ہی گیا ۔۔۔ جسکے آنیکا تھا اکثر احتمال آ ہی گیا
ہے کمی ہونا بھی تکمیلِ محبت کی دلیل ۔۔۔ چاند جب پورا ہوا اسمیں زوال آ ہی گیا
دونوں کا اختلاطِ باہمی دیکھا جہاں ۔۔۔ اپنی رودادِ گذشتہ کا خیال آ ہی گیا
ہم سمجھتے تھے کہ اب واعظ نہ چھیڑیگا ہمیں ۔۔۔ آج پھر لیکن وہ توبہ کا سوال آ ہی گیا
کون کہتا ہے نہیں ہوتی ہے دلکو دل سے راہ ۔۔۔ میں تو جب تڑپا، مرا رنگیں جمال آ ہی گیا
اے محبت ہو نہ ہو تو ہے مری جزوِ حیات ۔۔۔ جب ہوئیں تنہائیاں، تیرا خیال آ ہی گیا
اب دنیا کیوں لیے جاتی ہے دھوکے راہزن ۔۔۔ اب تو نظروں میں مری اسکا مآل آ ہی گیا
تو کہاں سے آ گئی اے بدگمانی عشق میں ۔۔۔ دیکھے آئینے میں آخر ایک بال آ ہی گیا
بادہ خواری کو گھٹاؤں سے مفر رہے لگاؤ ۔۔۔ یہ جہاں آئیں کہ توبہ پر زوال آ ہی گیا
دے سکے کفارۂ عصیاں نہ بعدِ مرگ بھی ۔۔۔ آنکھ جھپکی تھی کہ روزِ انفصال آ ہی گیا
لفظِ نشتر نے چھپا رکھا تھا نشتر اپنا راز ۔۔۔ اِس میں میرا نام ”ہرگوبند دیال“ آ ہی گیا

عرصۂ محشر میں نشتر کون تھا اپنا شریک

۴۴ وہ تو یہ کہئے خیالِ انفعال آہی گیا ۱۵

جبتک یہ خراب غمِ جاناں نہ ہوا تھا — دل میرا غمِ عشق کے شایاں نہ ہوا تھا
اسطرح کبھی دل میرا ویراں نہ ہوا تھا — پہلے یہ کبھی رنگِ گلستاں نہ ہوا تھا
یہ عشق کی ہیں کس نئی منزل میں ہوں یارب — ابتک تو مرا حال پریشاں نہ ہوا تھا
جسطرح نگاہیں ہیں تری، جان کی طالب — اسطرح کوئی جان کا خواہاں نہ ہوا تھا
جبتک بھی تری چشمِ کرم ظرف پہ میرے — میں شاکیٔ کوتاہیٔ داماں نہ ہوا تھا
کیا عشق میں ارماں کبھی ہوتا کوئی پورا — ارمان کے مفہوم میں ارماں نہ ہوا تھا
اب آج جو حالت ہو مریضِ شبِ غم کی — کل تک تو کوئی فرق نمایاں نہ ہوا تھا
ہے خوب ہمیں یاد کہ جینا بھی تھا دوبھر — مرنا بھی کبھی عشق میں آساں نہ ہوا تھا
پھر مجھکو وہی دن ہوں عطا، عصمتِ فطرت — جب دل مرا آلودۂ عصیاں نہ ہوا تھا
افسوس اگر غم میں ترے کیف تھا اتنا — کیوں پہلے ترے غم کا میں خواہاں نہ ہوا تھا
جبتک مجھے بھولی ہوئی تھی یادِ گلستاں — زنداں کبھی میرے لئے زنداں نہ ہوا تھا
کیوں جاگے نہ سب قبر میں آرام سے سوتے — تھا کون جو دنیا میں پریشاں نہ ہوا تھا
اب داغِ غمِ عشق و محبت کی نہ پوچھو — پہلے یہ فسردہ تھا نمایاں نہ ہوا تھا
تھی موسمِ گل میں نہ ادا موسمِ گل کی — جس سال مرا چاک گریباں نہ ہوا تھا
کر ترکِ محبت کی نہ تلقیں مجھے ناصح — تھا عشق نہ جبتک مجھے انساں نہ ہوا تھا
تھا داغِ محبت کا گرے دل میں فروزاں — جبتک مہِ تاباں، مہِ تاباں نہ ہوا تھا

ذہنیتِ ناقص نے کیا مایلِ تخریب — انسان مکمل ابھی انساں نہ ہوا تھا
ہستی کا نہ تھا میری نظر میں کوئی مصرف — جبتک کہ میں خاکِ درِ جاناں نہ ہوا تھا
اے ضبط نہ آنسو ہیں، نہ اب آہ و فغاں ہے — اتنا میں کبھی بے سر و ساماں نہ ہوا تھا
اللہ محبت کی وہ میٹھی مری نیندیں — جب خواب مرا خوابِ پریشاں نہ ہوا تھا

اُسوقت سے ہمرازِ گل و لالہ ہوں **نشتر**
جس وقت گلستاں بھی گلستاں نہ ہوا تھا

۴۵ ۲۱

سلامت رہے چاکِ روزن کسیکا — نظر آگیا روئے روشن کسیکا
گھٹاؤں سے کہدو ذرا کھل کے برسیں — دھواں دے رہا ہے نشیمن کسیکا
زمیں کو نہ ٹھکرا کے چل چلنے والے — یہاں ہر قدم پر ہے مدفن کسیکا
کہے جائے دُنیا یہ میرا وہ میرا — نہ صحرا کسیکا نہ گلشن کسیکا
نہ کیوں واسطہ روز اک حشر سے ہو — سرِ راہِ قاتل ہے مدفن کسیکا
مری شام ہے شامِ گیسو کسی کی — مری صبح ہے روئے روشن کسیکا

مٹائیگا اپنا نشیمن بھی **نشتر**
جو ویراں کریگا نشیمن کسیکا

۴۶ ۷

قاتل بنا دیا کبھی بسمل بنا دیا — رنج و خوشی نے دلکو مرے دل بنا دیا
اُسکا بھی کچھ خیال جو بیٹھا ہے سرنگوں — محفل کو جس نے آپ کی محفل بنا دیا
آخر مری قناعت طوفاں فریب نے — ساحل کو بحر، بحر کو ساحل بنا دیا

بگڑا ہوا تھا خونِ محبت کا اعتدال
یہ کام تو نے خنجرِ قاتل بنا دیا

کیوں تیرے عکس و نقش کی قدر نہ ہو شیں
جب کچھ نہ بن پڑا مہِ کامل بنا دیا

کر دیگا میرے عشق کی تکمیل بھی وہی
جس نے ہلال کو مہِ کامل بنا دیا

اے ذوقِ جستجو، مجھے یوں چھوڑنا نہ تھا
منزل نہ تھی جسے میری منزل بنا دیا

گھیرے ہوئے ہے کیوں مجھے دنیائے آرزو
تنہائیوں کو کیوں میری محفل بنا دیا

اے چشم مستِ حسن وہی اک نگاہِ گرم
ہر موئے تن کو جس نے، مرا دل بنا دیا

دریائے عشق آپکا تھا بحرِ بیکراں
تقدیر نے عبور کے قابل بنا دیا

سنتا تھا کون حشر میں یہ اشکِ غم مری
تیرے کرم نے عفو کے قابل بنا دیا

پردے کی تمکو یوں بھی ضرورت نہیں کوئی
پھر اُس سے جس نے دید کے قابل بنا دیا

کیا یہ مآلِ شوقِ تجلائے حسن تھا
آیا جو وقتِ دید تو غافل بنا دیا

نشتر پہ یہ نگاہِ کرم تیری اے کریم
تو نے ہلال کو مہِ کامل بنا دیا

۴۷ ۱۴

اپنی نگاہِ ناز کا بسمل بنا دیا
یا سر سے پاؤں تک مجھے اک دل بنا دیا

لطف و کرم میں بات یہ ممکن نہ تھی کبھی
تم نے بگڑ بگڑ کے مرا دل بنا دیا

اے اشتیاقِ منزلِ مقصود المدد
ہر ہر قدم کو ضعف نے منزل بنا دیا

تم نے ستم کئے کہ جفا کی، گلہ نہیں
قصہ تو میرا کہنے کے قابل بنا دیا

آنکھوں کو تاب یوں بھی نہ تھی تھرتھرا گئی
اچھا کیا جو آپ نے غافل بنا دیا

اے ناخدائے بحرِ جہاں، تُو نے وقت پر — ساحل جہاں نہ تھا وہیں ساحل بنا دیا
محشر سے کم نہیں شبِ فرقت کسی کی یاد — مشکل کو ہم نے اور بھی مشکل بنا دیا
اے عشق تو نے کر کے فنا اپنی راہ میں — میری فنا کو زیست کا حاصل بنا دیا
کسطرح اُن کے جور کا نشتر گلہ کروں
۴۸ احسان ہے کہ جور کے قابل بنا دیا ۹

دل کے ویرانے میں اِک دوست تو پنہاں نکلا — ہم نے صحرا جسے سمجھا تھا گلستاں نکلا
باعثِ زیست ہمارا غمِ پنہاں نکلا — درد سمجھے تھے جسے درد کا درماں نکلا
جستجو جس کی رہی دیر و حرم میں مجھکو — صورتِ شوق وہ دل میں مرے پنہاں نکلا
ہم نے جس کو درِ جاناں نہ کبھی سمجھا تھا — چشمِ باطن سے جو دیکھا، درِ جاناں نکلا
میں تو انساں اُسی انساں کو ہمیشہ سمجھا — کام پڑنے پہ بھی انسان جو انساں نکلا
کیا کہیں کیسی کٹی جوشِ جنوں میں اپنی — جو رفو کر لیا دامن تو گریباں نکلا
رکھ ہی لی بات مری حشر میں اشکوں نے مرے — میں تو سمجھا تھا مرے ہاتھ سے میداں نکلا
تیری مرضی پہ ہے تو جس کو بنا دے جیسا — یہی انساں کبھی انساں کبھی شیطاں نکلا
ٹوٹتے اِسکو نہیں دیر ذرا بھی لگتی — میری توبہ سے بھی نازک ترا پیماں نکلا
تھی مجھے جان نکلنے میں کچھ ایسی راحت — میں یہ سمجھا کہ ترے تیر کا پیکاں نکلا
اُنکو بیمار نے دیکھا کہ ہوئیں آنکھیں بند — جان اِدھر نکلی، اُدھر دید کا ارماں نکلا
تھی وہ ہی بزم تری ایک، تو پھر آخر کیوں — کوئی گریاں کوئی خنداں کوئی حیراں نکلا

کس کی فرقت میں ہے یہ حضرتِ نشترؔ وحشت
۴۹ چاک داماں بھی ہوا اور گریباں نکلا ۱۳

کی یاد نہ اُس کی جیتے جی، اب حشر میں اے دل کیا ہوگا
جینے کا نتیجہ کچھ نہ ہوا، مرنے کا حاصل کیا ہوگا
اُن کے کہنے سے پی بھی لے، تھوڑی سی، اے دل کیا ہوگا
اصرار سے اُن کے پی لینا، پینے میں داخل کیا ہوگا
خود شوقِ شہادت ہے دل میں، پھر مرنا مشکل کیا ہوگا
کیا ہم کو ضرورت قاتل کی، اب خنجرِ قاتل کیا ہوگا
آئے ہیں کہاں سے علم نہیں، جائینگے کہاں معلوم نہیں
ہم سا بھی زمانے میں کوئی، بیگانۂ منزل کیا ہوگا
راحت نہ ملی مرنے پر بھی، یہ تنگیٔ لحد میں فکر رہی
جب محشر میں وہ بنکے جواں، آئیں گے مقابل کیا ہوگا
شرمندہ گناہوں پر اپنے ہرگز نہیں بلکہ نازاں ہوں
عصیاں سے رہا جو بے بہرہ، وہ عفو کے قابل کیا ہوگا
دُنیا سے غافل ہو جانا، ہے عین دلیل ہُشیاری
جو غافل اپنے سے نہ ہوا، دنیا سے غافل کیا ہوگا
کیا مجھ کو خبر تھی روزِ ازل، کمبخت قیامت ڈھائیگا

ورنہ میں ادب سے کہہ دیتا، دل مجھ کو نہ دو، دل کیا ہوگا
اس باغِ جہاں کے گُل بوٹے، دیکھے تو کوئی اللہ غنی!
جب محفل کا یہ ساماں ہے، تو صاحبِ محفل کیا ہوگا
جو منع مجھے عصیاں سے کریں، اتنا تو ذرا دل میں سوچیں
جو عفو کے ناقابل ہوگا، وہ عفو کے قابل کیا ہوگا
پردوں سے نگاہِ شوق کہیں، رُک کر عاجز رہ سکتی ہے
مجنوں کی نگاہوں کا پردہ، یہ پردۂ محمل کیا ہوگا
اُٹھتے ہی نہیں اب میرے قدم، اور شوق بھرا ہی رگ رگ میں
ایسے میں نہ پہونچا میں جو کہیں تو دوریٔ منزل کیا ہوگا
آغازِ محبت ہی میں جب، تو یوں سودا در داماں ہے
اور آگے چل کر حشر ترا، اے دیوانے دل کیا ہوگا
شک اُن کی محبت میں کرنا، اے دل ہے دلیلِ نادانی
جو خود نہ ہوا پہلے بسمل، وہ بعد میں قاتل کیا ہوگا
بچھڑا ہوا میں اس دنیا کا، جب تجھ سے ملونگا محشر میں
اُس وقت ترا دل کیا ہوگا، اُس وقت مرا دل کیا ہوگا
میں یوں ہی فراقِ جاناں میں، بیزار ہوں اپنے جینے سے
جب مجھ کو جینا مشکل ہے، مر جانا مشکل کیا ہوگا

یہ میرے نقائص ہی آخر، کر دینگے مری تکمیل اک دن
۵۰ جو آج نہیں ناقص **نشتر**، آئندہ کامل کیا ہوگا ۱۷

کچھ اور کہیں ظالم منہ سے نہ سنا دینا — آیا ہے تو اے قاصد پیغامِ وفا دینا
سوؤنگا تھکا ماندہ، شاید نہ اُٹھا جائے — جس روز قیامت ہو، تم آکے جگا دینا
روکو نہ ہمیں ہمتو دیدار کے طالب ہیں — کچھ اور اگر مانگیں، محفل سے اُٹھا دینا
تم وعدہ فراموشی، کرتے ہو کئے جاؤ — لیکن کہیں دل سے بھی ہمکو نہ بھلا دینا
کچھ ظرف کا اندازہ پینے میں نہیں رہتا — جھک جاؤں میں جب ساقی نظروں سے بتا دینا
افسوس ازل میں ہی وعدہ نہ لیا اُن سے — جینے سے جو تنگ آئیں فی الفور قضا دینا
کتنی ہی بار رکیں، کتنا ہی چھپائیں ہم — کمبخت نگاہوں کو، سب راز بتا دینا
ہم فرضِ محبت سے قاصر رہیں کیوں اپنے — تو سُن کہ نہ سُن ہم کو آواز لگا دینا
اے حضرتِ دل ناحق کیوں حشر سے ڈرتے ہو — کچھ شکل بنا لینا، کچھ اشک بہا دینا
حق ازلی تھا جب، یہ ذوقِ فنا میرا — کیوں بھول گیا مجھکو، تو ذوقِ فنا دینا
آغاز جب اچھا تھا، انجام بھی اچھا ہو — تھوڑی سی مدد مجھکو، ہنگامِ قضا دینا
ہم وار کو کیا جانیں، اوچھا ہے کہ پورا ہے — ہر وار پہ ہم کو تو، قاتل کو دُعا دینا

کیوں ہم کو شکایت ہو، کیوں ہمکو گلہ **نشتر**
۵۱ جو اُن کو ستم کرنا، وہ ہم کو بھلا دینا ۱۳

جبتک میں غمِ عشق سراپا نہ ہوا تھا — ہستی کا کوئی نقش ہویدا نہ ہوا تھا

گھبرا ہی گئے عرصۂ محشر میں ہم آخر
پہلے کا ہمارا کبھی دیکھا نہ ہوا تھا

کم ظرفی ہماری تھی کہ بیجا اسے سمجھے
ظلم آپ کا کوئی کبھی بیجا نہ ہوا تھا

اب آج جو حالت ہو مریضِ شبِ غم کی
کل تک تو سُنا یہ ہے کہ اچھا نہ ہوا تھا

کیا خاک سُراغ رہِ منزل مجھے ملتا
میں اپنی ہی ہستی سے نہ بیگانہ ہوا تھا

اے فصلِ خزاں تو نے دکھایا مجھے یہ دن
گلشن مجھے ہم معنیٔ صحرا نہ ہوا تھا

اب میری تمنّا کے نکلنے میں کہاں دیر
ابتک مجھے احساسِ تمنّا نہ ہوا تھا

اللہ رے تنہائیٔ شامِ شبِ فرقت
اتنا میں ابھی تک کبھی تنہا نہ ہوا تھا

جلوے ترے موجود تھے ہر سمت ہزاروں
میں خود ہی کبھی محوِ تماشا نہ ہوا تھا

لاکھوں سے میں اچھا تھا ہزاروں سے میں بہتر
جبتک مجھے احساسِ تمنّا نہ ہوا تھا

تھی لذّتِ دیدار میں محویّتِ کامل
بیہوش میں ہنگامِ تماشا نہ ہوا تھا

کہنا وہ مری عرضِ تمنّا پہ کسی کا
ایسا کبھی پہلے تجھے سودا نہ ہوا تھا

کس روز مجھے یاس نے گھیرا نہ شبِ غم
کس روز مرا خونِ تمنّا نہ ہوا تھا

افسوس مرے ہوش نے دھوکا دیا مجھ کو
اور میں ابھی مصروفِ تماشا نہ ہوا تھا

دلدادۂ صحرا تھے کبھی عشق میں ہم بھی
اک قیس ہی دیوانۂ صحرا نہ ہوا تھا

جب میں نے یہ سمجھا کہ ہوا ختم تماشا
اُسوقت تک آغازِ تماشا نہ ہوا تھا

جینا تھا اسی شخص کا، مرنا بھی اُسی کا
دُنیا میں جو وابستۂ دُنیا نہ ہوا تھا

تکمیلِ تمنّا کی مجھے عشق میں دُھن تھی
اور میں کبھی مجنونِ تمنّا نہ ہوا تھا

اب شدّتِ دردِ دلِ ناشاد نہ پوچھو — پہلے بھی ہوا تھا مگر اتنا نہ ہوا تھا
کیوں وعظ کی محفل میں اُٹھا لائے ہیں لوگ — جب تیز ابھی نشۂ صہبا نہ ہوا تھا
اب گورِ غریباں میں بھی دیکھیں ہی کیا رنگ — دُنیا میں تو کوئی بھی کسی کا نہ ہوا تھا
اللہ محبت کے وہ دن رات کہاں ہیں — تنہائی میں بھی میں کبھی تنہا نہ ہوا تھا
جس عشق پہ اب روز ستم ہیں تمہی لاکھوں — تجھکو بھی ہوا تھا مجھے تنہا نہ ہوا تھا
کیا خاک پہونچتا درِ جاناں پہ میں نشتر — در اصل ارادہ ہی ارادا نہ ہوا تھا

اُس وقت کے ہم خوگرِ بیداد ہیں نشتر
جب چرخِ ستمگار بھی پیدا نہ ہوا تھا

۵۲ — ۲۵

شمع پر پھر دے کے اپنی جان، پروانہ گیا — لیجئے پھر انجمن سے ایک دیوانہ گیا
جان سے جانا مقدر تھا تو پروانہ گیا — لاکھ روکا سب نے اپنی راہ دیوانہ گیا
ہمنے لاکھوں مرتبہ دیکھا ہے زاہد آنکھ سے — ابر مسجد کی طرف سے سوئے میخانہ گیا
عشق تک محدود تھا میرے فسانوں کا مزہ — اب وہ افسانے کہاں، وہ لُطفِ افسانہ گیا
جب سے ساقی کی نگاہوں سے نہیں ہے چھیڑ چھاڑ — لُطفِ مے نوشی گیا، وہ لُطفِ میخانہ گیا
تیری مسجد میں اگر کچھ بات تھی زاہد تو ابر — آج کیوں مسجد سے اُٹھکر سوئے میخانہ گیا
خم لگائے مُنہ سے، اب ساغر سہی ساقی، واسطہ! — مدتیں گذریں کہ وہ پینے کا پیمانہ گیا
جس کو سُننا ہو ابھی سُن لے وہ افسانہ مرا — ورنہ سُن رکھو کہ میرے ساتھ افسانہ گیا
ابتدا میں ہم گئے تھے دیر و کعبہ کی طرف — پھر ہمارے ساتھ کعبہ اور بُتخانہ گیا

شمع روشن ہونیکی بزمِ وفا میں دیر تھی
پھر تو اک پروانہ آیا ایک پروانہ گیا

دل کی بیتابی کی کوئی حد نہیں کچھ روز سے
اب ہمارے ہاتھ سے شاید یہ دیوانہ گیا

بڑھتے بڑھتے اُنکی نظریں میری جانب رُک گئیں
آتے آتے آج میرے ہاتھ پیمانہ گیا

موت ہی ہوتی ہے شاید آتشِ غم کا علاج
جان ہی کے ساتھ آخر سوزِ پروانہ گیا

ہے یہ دُنیا کا تعلق صرف کُنجِ گور تک
اس سے آگے ساتھ پھر اپنا نہ بیگانہ گیا

حضرتِ واعظ کو میخانے میں کیوں آنے دیا
آج میخانے کے باہر رازِ میخانہ گیا

کیوں نہ جاتا شمع پر اسمیں خطا اُسکی نہ تھی
اپنے سوزِ عشق سے مجبور، پروانہ گیا

میرے ہوتے اسکو جانسوزی کا حق حاصل نہیں
مار ہی ڈالوں گا محفل میں جو پروانہ گیا

جو یہاں آیا وہ لایا اِک فسانہ اپنے ساتھ
جو گیا وہ ساتھ لیکر ایک افسانہ گیا

اپنے دل سے اپنے دیوانے کو کیوں کرتے ہو دُور
دل سے دیوانہ گیا، دنیا سے دیوانہ گیا

پھر نہ جانے ایک دونوں ہوگئے یا کیا ہوا
شمع تک ہم نے بھی یہ دیکھا کہ پروانہ گیا

مجھ کو اُن کی بزم میں جانیکا یوں افسوس ہے
مثلِ پروانہ نہ لوٹا، مثلِ پروانہ گیا

اب کہاں نشتر وہ میری بادہ پیمائی کے دن
ساتھ اُن ہونٹوں کے میرا دورِ پیمانہ گیا

۵۳ ۲۲

بھیک کے خوگر ہیں پھر شرمائیں کیا
تیرے در سے ہاتھ خالی جائیں کیا

کیوں لئے لیتا ہے دلِ کمبخت جان
وہ نہیں آتے تو ہم مرجائیں کیا؟

آرزوئیں چھیڑتی ہیں کیوں ہمیں
ہم سراپا آرزو ہو جائیں کیا

منکشف جب ہوگیا دُنیا کا راز — اب اِسے خاطر میں اپنی لائیں کیا
راہ لے ناصح خدا کیواسطے — جو نہ سمجھے ہم اُسے سمجھائیں کیا
حشر میں محرومِ رحمت رہگیا — جس نے یہ سوچا کہ ہم شرمائیں کیا
یہ شبِ غم اور یہ دردِ فراق — کیا کریں مایوس اب ہوجائیں کیا؟
خود اُٹھائے لیتے ہیں ہم آشیاں — بجلیوں کو آئے دن تڑپائیں کیا
فطرتاً دونوں ہیں کچھ مجبور سے — وہ ہمیں یا ہم اُنھیں سمجھائیں کیا
دل ہماری عشق میں سُنتا نہیں — ایسے دیوانے کو ہم سمجھائیں کیا

عاشقی اور اُس میں عزمِ خودکشی
۵۴ کر رہا ہے تو یہ نشتر ہائیں کیا! ۱۱

اُس پھول کی طرح جو چمن سے نکل گیا — واپس نہ آئیگا جو وطن سے نکل گیا
دل رفتہ رفتہ رنج و محن سے نکل گیا — آکر گہن میں چاند گہن سے نکل گیا
کم قسمتیِ بادہ گساراں تو دیکھئے — بادل چمن پہ آکے چمن سے نکل گیا
ہونگے خوشی بھی جنکو ملی ہوگی عشق میں — اپنا تو کام رنج و محن سے نکل گیا
اب جسم ایک خاک کا تودہ ہے بعدِ مرگ — اللہ کون تھا جو بدن سے نکل گیا
وہ ابر جس کا ایک برس سے تھا انتظار — کترا کے آج صحنِ چمن سے نکل گیا
محفوظ ذہن میں ہے خیالِ وطن ہنوز — کیا ہوگیا اگر میں وطن سے نکل گیا
اللہ خاکساری میں کتنا عروج تھا — اونچا کہیں میں چرخِ کہن سے نکل گیا

پوشاک چاہیے تھی جنھیں روزِ اک نئی ... مرنے پہ اُنکا کام کفن سے نکل گیا
پھولوں کی بُو ہو، پھول ہوں، کلیاں ہوں کوئی ہو ... آیا نہ لوٹ کر جو چمن سے نکل گیا
ترکِ چمن پہ کیوں مجھے الزام دے کوئی ... میں کچھ نہ کچھ سمجھ کے وطن سے نکل گیا
رخصت سے میری کیوں ہے خلش اہلِ باغ کو ... کانٹا تھا میں چمن کا چمن سے نکل گیا
خطرے چمن کے خطرے نہ تھے میرے واسطے ... کترا کے میں فصیلِ چمن سے نکل گیا
کمہلا گئے ہیں باغ کے کیوں آج برگ و بار ... اللہ آج کون چمن سے نکل گیا
کیا موسمِ بہار کا تھا مختصر قیام ... بوئے چمن کیطرح چمن سے نکل گیا
اہلِ چمن نے بھی مجھے دل سے بھُلا دیا ... ہر اعتبار سے میں چمن سے نکل گیا
کیونکر چلا سکونگا اسے روزِ حشر تک ... روز ایک تار بھی جو کفن سے نکل گیا

خطرے ہزار طرح کے نشترؔ ہیں رات دن
۵۵
۱۸
اچھا رہا وہی جو چمن سے نکل گیا

نشترؔ مرا دل مائلِ میخانہ رہیگا ... پیمانہ ہے، ہم فطرتِ پیمانہ رہیگا
جبتک کرمِ ساقیٔ میخانہ رہیگا ... ہاتھوں میں چھلکتا ہوا پیمانہ رہیگا
پینے کا جو تیرے یہی پیمانہ رہیگا ... کیا تیرہ ٹھکانہ دلِ مستانہ رہیگا
پروانہ ہر اک حال میں پروانہ رہیگا ... جو ہوش سے آزاد ہے دیوانہ رہیگا
مانا کہ میں فانی ہوں ہونگا نہ ابد تک ... دُنیا کی زباں پر مگر افسانہ رہیگا
تحقیر سے میخانے کو یوں دیکھ نہ زاہد ... مسجد نہ رہیگی تری، میخانہ رہیگا

کتنا ہی مرے دلکو وہ سمجھائیں، یہ دل تو
دیوانہ تھا، دیوانہ ہے، دیوانہ رہیگا

لے راہ خدا کے لئے دل سے غمِ دنیا
اب آج سے اسمیں غمِ جانانہ رہیگا

یوں مجھکو غمِ دہر سے فرصت نہ ملیگی
اب آج سے مسکن مرا میخانہ رہیگا

عقل و خرد و ہوش سے کہدو کہ سدھاریں
اب ساتھ فقط یہ دلِ دیوانہ رہیگا

جادو بھی نگاہوں میں تمہاری ہے فسوں بھی
جو آئیگا اس پھیر میں دیوانہ رہیگا

ہوجائیگی رسوائی ترے سوز کی اے شمع
جلنے سے جو باقی پرِ پروانہ رہیگا

ارمان حسینونکے بھی اب دلمیں رہیں گے
کعبہ ہے جہاں پردہ میں بتخانہ رہیگا

افسانے میں ذکر انکی جفاؤں کا نہ آئے
احسان ترا کاتبِ افسانہ رہیگا

کیوں جاؤں نہ میخانے کو میں چھوڑ کے دنیا
دُنیا نہ رہیگی مرا میخانہ رہیگا

محفوظِ خزاں ڈھونڈ گلستاں کوئی اے دل
کب تک چمنِ دہر یہ دیوانہ رہیگا

اک روز وہ آئیگا کہ مٹ جائیگی دُنیا
باقی فقط افسانہ ہی افسانہ رہیگا

پھر شمع ہوئی ہے نئے انداز سے روشن
زندہ کوئی اب کاہیکو پروانہ رہیگا

دُہرا لو مرے سامنے تم اپنی زباں سے
یوں یاد نہ تم کو مرا افسانہ رہیگا

کیوں اہلِ چمن میرے بچھڑنیکا کریں غم
گو میں نہ رہونگا، مرا افسانہ رہیگا

آباد کہیں ہوتا ہے ٹوٹا ہوا دل بھی
ویرانہ جہاں ہو گیا ویرانہ رہیگا

وہ دن بھی کبھی ہونگے الٰہی کہ نہ ہونگے
جب دلمیں ہمارے غمِ جانانہ رہیگا

ہنستے ہیں جو دیوانے پہ وہ خوب سمجھ لیں
ہُشیار جو ہوگا وہی دیوانہ رہیگا

ہوجائیگی جل جانے سے تبدیلیٔ ہیئت،
باطن وہی پروانے کا، پروانہ رہیگا

انسان سمجھنے کو سمجھتا رہے کچھ بھی
افسانہ تھا، افسانہ ہے، افسانہ رہیگا

سچ پوچھئے مجھ سے تو فسانہ مرا اچھا
میں رہ نہیں سکتا مرا افسانہ رہیگا

کعبے میں بٹھاؤ کہ کلیسا میں بٹھاؤ
میخوار کا منہ، جانبِ میخانہ رہیگا

اے دل شبِ تاریک کا خوگر بھی کبھی ہو
کبتک شبِ مہتاب کا دیوانہ رہیگا

کیوں گرمیٔ محشر سے مجھے خوف ہو نشتر
جب سر پہ مرے دامنِ میخانہ رہیگا

یہ حد سے سوا بادہ کشی عیب ہے نشتر
۵۶ پینے کا بھی آخر کوئی پیمانہ رہیگا؟ ۳۰

ہم ڈھونڈ چکے خوب، ترا گھر نہیں ملتا
یہ اور مصیبت ہے کہ رہبر نہیں ملتا

جو گھر میں ہے آرام وہ باہر نہیں ملتا
کتنے ہی جتن کیجئے نشتر، نہیں ملتا

غافل حرم و دیر میں دلبر نہیں ملتا
جو گھر میں ہو موجود وہ باہر نہیں ملتا

جھیل اچھی طبیعت سے تکالیفِ شبِ غم
ہر شخص کو آرام برابر نہیں ملتا

گمراہی ہماری بھی ہے دُنیا سے نرالی
گھر سے کبھی نکلے نہیں اور گھر نہیں ملتا

کیا شعلۂ فریاد کو حاصل ہوئی معراج
کیوں آج سُراغِ مہ و اختر نہیں ملتا

ملتا جو نہیں وہ تو قصور اس میں ہے اپنا
اپنی غلطی ہی سے وہ اکثر نہیں ملتا

دل ہی نہیں ملتا تو خدا ہم کو ملے کیا
گھر والے کا کیا ذکر ہے جب گھر نہیں ملتا

اربابِ زمیں پر جو گذرتی ہے وہ جانیں
آرام تہِ چرخ تو دم بھر نہیں ملتا

اُس روز کے پینے کو سمجھتا ہوں میں پینا — میخانے سے جب چلکے مجھے گھر نہیں ملتا
انصاف کی اُمید کروں نیت میں کیونکر — بے جان دیئے عرصۂ محشر نہیں ملتا
یا ورجو کسی کا ہے اُسے وعدۂ باطل — پھر آج مزاجِ دلِ مضطر نہیں ملتا
سو جاتی ہیں دُنیا کی فضائیں بھی کسی وقت — کیوں تجھکو سکوں اے دلِ مضطر نہیں ملتا
دولت کے تونگر تو ہیں دُنیا میں ہزاروں — افسوس کوئی دل کا تونگر نہیں ملتا
کیوں درپئے آزار ہمارے، ہیں شب و روز — کیا اور کوئی چرخِ ستمگر نہیں ملتا

محرومیٔ قسمت نہ کہوں میں تو کہوں کیا
۵۷ وہ دل میں ہے لیکن مجھے نشتر نہیں ملتا ۱۶

یہ اپنی یاد بھی غفلت شعار لیتا جا — مجھے نہ دیگی گھڑی بھر قرار لیتا جا
خیالِ یار بھی زیرِ مزار لیتا جا — کہاں ملے گا وہاں غمگسار لیتا جا
تہِ مزار غمِ روزگار لیتا جا — چمن سے پھول لئے ہیں تو خار لیتا جا
خدا کیواسطے غم آشنا نہ چھوڑ اسے — دلِ حزیں ہے محبت شعار لیتا جا
جو بیقرار کیا ہے تو تکملہ کر دے — کچھ اور دل میں ہے باقی قرار لیتا جا
کسی کے پاس سے جاتا ہے یوں کوئی اُٹھکر — کہا تھا تجھ سے یہ کس نے قرار لیتا جا
سُنا ہے ان سے مذاقِ وفا بگڑتا ہے — خدا کیواسطے صبر و قرار لیتا جا
اُسی کا ذکر شبِ غم بچائے گا تجھ کو — اُسی کا نام شبِ انتظار لیتا جا
نہیں بہار قفس تک جو ساتھ جا سکتی — تو اپنے دل میں خیالِ بہار لیتا جا

بہار میں تو مناتے ہیں سب بہار اے دل | خزاں کی فصل میں لطفِ بہار لیتا جا
جو لطفِ بزم اٹھانا ہے تو نہ جا تنہا | جو راستے میں ملے بیقرار، لیتا جا
کسی کے منہ سے نہ نکلا یہ حیف و زارِ دل | کہ ایک اور دلِ بیقرار لیتا جا
جہاں قرار لیا ہے ہمارا اے ظالم | وہاں یہ دل بھی جو ہے بیقرار لیتا جا
جو تو نہیں ہے تو کیا مجھکو واسطہ ان سے | مرا سکوں، مرا ضبط و قرار لیتا جا

میں دلکو چھوڑ کے محفل میں چلدیا نشتر
۵۸ وہ لاکھ کہتے رہے بار بار لیتا جا ۱۵

رنجِ شکستگی سے تو بے نیاز ہو جا | جو ٹوٹنا نہ جانے اے دل وہ ساز ہو جا
دنیا کو ترک کر دے اور بے نیاز ہو جا | مستِ نیاز تو بھی محمودِ ناز ہو جا
جب ہر قدم پہ دنیا ہے بے نیاز تجھ سے | دنیا سے تو بھی اے دل اٹھ بے نیاز ہو جا
یہ کیا کہ درد دے کر کرتا ہے چارہ سازی | یا درد ہی مجھے دے یا چارہ ساز ہو جا
یا تاب دے نظر کو، یا اسقدر کرم کر | اے جلوۂ حقیقت تو بھی مجاز ہو جا
محشر میں منحصر ہے، دو آنسوؤں پہ سب کچھ | یا سرنگوں بنا رہ، یا سرفراز ہو جا
ہونا تھا تجھ کو خوگر جب بے نیازیوں کا | تجھ سے کہا تھا کس نے تصویرِ ناز ہو جا

کیا دیکھتا ہے نشتر موقع یہ کب ملیگا
۵۹ سر پائے دوست پہ رکھ اور سرفراز ہو جا ۸

کیوں چار دن کو دنیا کرنے خراب آیا | جب ساتھ چھوڑنا تھا پھر کیوں شباب آیا

بچپن کو روندتا جب عہدِ شباب آیا — انساں کی زندگی میں اک انقلاب آیا
پھر دل میں چٹکیاں سی لینے لگا ہے کوئی — شاید انھیں تبسم زیرِ نقاب آیا
جب وقت موت آیا زندہ رہا نہ کوئی — سونا ہے امر لازم جب وقتِ خواب آیا
جلووں سے اُسکے خالی دُنیا رہی نہ دم بھر — اک آفتاب ڈوبا اک ماہتاب آیا
سونے نہ پائے تھے ہم اک غل ہوا ایکایک — "روزِ حساب آیا" روزِ حساب آیا"
مرنیکے بعد وہ بھی سوتے ہیں کس مزے سے — دُنیا میں نام کو بھی جنکو نہ خواب آیا
لو مستیاں مُبارک، بدمستیاں مبارک — جامِ شراب لیکر کافر شباب آیا
محرومِ دید مانا قسمت سے رہگیا میں — تیری بھی یہ خطا تھی، کیوں بے حجاب آیا
دیتا ہے کیا زبانی دیکھیں پیام قاصد — صورت تو کہہ رہی ہے، ناکامیاب آیا
جب عشق تھا کسی سے ہمکو خبر کہاں تھی — کب آفتاب نکلا، کب ماہتاب آیا
غصے پہ اُنکے غصہ آئے مجھے نہ کیونکر — جب آئے وہ مرے گھر یہ ہمرکاب آیا

ہیں ملکِ عشق کی بھی نشتر عجیب باتیں
۶۰ جس نے شکست کھائی وہ فتحیاب آیا ۱۳

آپ نے کیوں مجھے بیہوش سرِ طُور کیا — پیار سے پاس بُلایا تھا تو کیوں دُور کیا؟
تجھ پہ مٹنے کے لئے کچھ تھی طبیعت مجبور — اور کچھ تیری اداؤں نے بھی مجبور کیا
دل سی شے نذر ہی کر دینی پڑی آخرِ کار — عشق نے زور دیا حسن نے مجبور کیا
تھا میں مجبورِ محبت یہ خبر کیا مجھ کو — کس نے مجبور کیا، کیوں مجھے مجبور کیا

روز حیلہ خفگی کا انھیں کچھ کر لینا
آج ناراض ہیں، کیوں تذکرۂ حور کیا

مے سے توبہ ترے کہنے سے میں کر لوں واعظ
اور اگر ابر نے آ کر مجھے مجبور کیا؟

عرضِ مطلب نہیں کرتا ہوں اس اندیشے سے
جانے انکار کیا اس نے کہ منظور کیا

سب خرابی تو محبت میں اسی بات کی تھی
دل نے جو مجھ سے کہا میں نے وہ منظور کیا

غم میں پیدا کیے آثار خوشی کے تو نے
رنج دے دے کے مجھے عشق میں مسرور کیا

آنکھ بھر کر کہیں دیکھو تو نہ جانے کیا ہو
اک نگاہِ غلط انداز نے مخمور کیا

بے نیازی تری بھولی ہے نہ بھولے گی کبھی
اس نے ہی زخمِ جگر کو مرے ناسور کیا

مجھکو ناکامِ محبت تجھے رکھنا تھا اگر
دل مرا پہلے ہی کیوں عشق سے معمور کیا

میں کہاں، اور کہاں عشق و محبت نشتر
اک نگاہِ غلط انداز نے مجبور کیا

۶۱ ۱۳

جب سے رہتا ہے تصور انکی محفل کے قریب
بستیاں آباد ہیں لاکھوں مرے دل کے قریب

کیا عجب سعیِ کشش آ جائے حاصل کے قریب
روز رکھ دیتا ہوں اپنا دل ترے دل کے قریب

چارہ گر جس درد کی تو نے ابھی کی تھی دوا
وہ تو پھر ہونے لگا ظالم وہیں دل کے قریب

ہو گئے ہیں تیرے ارماں دل سے مانوس اسقدر
جو نکلتے بھی ہیں، رہ جاتے ہیں وہ دل کے قریب

دل سے میرے دور ہونیکی نہ تم کوشش کرو
درد ہی بنکر رہو، لیکن رہو دل کے قریب

جب تڑپ میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے مجھے
اور کر لیتا ہوں اپنے درد کو دل کے قریب

رات یہ کیونکر بسر ہو گی الٰہی کیا کروں
شام ہی سے درد کے آثار ہیں دل کے قریب

ہوگئی تسکیں تو یہ سمجھو کہ ہم مر ہی گئے　　ہاتھ بھولے سے نہ رکھ دینا کہیں دل کے قریب
ناامیدی میں جہاں سو عیب ہیں، خوبی یہ ہے　　اسکے ہوتے حسرتیں آتی نہیں دل کے قریب
اللہ اللہ یہ ہجومِ صد ہزاراں آرزو　　ایک دنیا بس گئی گویا مرے دل کے قریب
رحم کر دونوں پہ یکساں دردِ دل بہرِ خدا　　چار دن کو رہ جگر میں، چار دن دل کے قریب
یہ تڑپ یہ درد یہ سوزِ مسلسل، الاماں　　کیا کئی دل اور پیدا ہو گئے دل کے قریب
ایک ہی تیرِ نگاہِ ناز کھایا تھا مگر　　دیکھتا ہوں زخم سے چار و طرف دل کے قریب
درد کا احساس اتنا بھی نہ اب باقی رہا　　دل میں ہوتا ہے کہ ہوتا ہے کہیں دل کے قریب
چارہ گر اب درد کی کثرت ہے گنجایش طلب　　ہو سکے تو اور دل رکھ دے مرے دل کے قریب
وہ دوا ہو یا کوئی مرہم کہ دستِ چارہ گر　　درد بن جاتا ہے جو آتا ہے اب دل کے قریب
کیا چمکنے کو ہے بجلی، کیا گھٹا اُٹھنے کو ہے　　بیٹھے بیٹھے پھر چمک ہونے لگی دل کے قریب

لاکھ ہو نظروں سے اوجھل، لاکھ ہو محوِ حجاب
۶۲　دُور اُسے کیونکر کہوں نشتر جو ہے دل کے قریب　۱۸

تیر سا محسوس ہوتا ہے رگِ دل کے قریب　　آ گیا اے شوق کیا میں کوئے قاتل کے قریب
چھوڑ کر آسانیاں رہتا ہوں مشکل کے قریب　　پست ہمت ہے جو رہنا چاہے ساحل کے قریب
داغ آخر کیوں نہ ہوں چاروں طرف دل کے قریب　　کچھ ستارے لازمی ہیں ماہِ کامل کے قریب
اپنی ہی منزل پہ سب آوارہ و آسودہ ہیں　　دُور منزل سے نہ کوئی ہے نہ منزل کے قریب
باریابِ منزلِ مقصود اتراتا ہے کیا　　تُو قدم اُٹھتے ہی پہونچا تھا نہ منزل کے قریب

تیغِ قاتل کے تصوّر سے میں ہوتا ہوں شہید
وہ شہادت کیا کہ سر ہو تیغِ قاتل کے قریب

وہمِ منزل پھر مجھے گمراہ کیوں کرتا ہے تو
دل گواہی دے رہا ہے میں ہوں منزل کے قریب

دیکھنا ہو جن کو انجامِ محبت، دیکھ لیں
نعشِ پروانہ پڑی ہے شمعِ محفل کے قریب

دل جگر کے پاس رکھ کر ہو گئی فطرت سے بھول
کوئی رکھتا ہے کہیں بسمل کو بسمل کے قریب

پاؤں اب آگے نہیں اُٹھتے نہ بڑھتی ہے نظر
ہو نہ ہو ہم ہیں کہیں اس وقت منزل کے قریب

منزلِ مقصود جب تک خود نہ مل جائے مجھے
کس کو سمجھوں دُور، سمجھوں کس کو منزل کے قریب

حیرتِ نظارہ ہیں کچھ آئینے کچھ بجلیاں
آگیا میں آج یارب کس کی محفل کے قریب

جو نہ ہو عاصی، وہ ہو حقدارِ رحمت کس طرح
جو نہ ہو گمراہ کیا پہونچے وہ منزل کے قریب

سوئے جادہ شوقِ منزل پھینک دیتا ہی مجھے
لوٹ جاتا ہوں میں، خود آ آ کے منزل کے قریب

ہے کبھی اُمید کا عالم، کبھی طوفانِ یاس
دُور ساحل سے کبھی ہوں، گاہ ساحل کے قریب

شوقِ بے پایانِ منزل، تو سلامت چاہیئے
دُور جتنا ہو گیا ہوں اُتنا ہی منزل کے قریب

گمرہی میری ہے منزل آشنائی کی دلیل
جب کبھی تھکا ہوں، آ نکلا ہوں منزل کے قریب

سایۂ دیوارِ محفل بھی نہیں رہتا وہاں
بیٹھ جاتا ہوں جہاں دیوارِ محفل کے قریب

مل ہی جائیگی کبھی منزل جو یہ رفتار ہے
ہر قدم لیجا رہا ہے مجھ کو منزل کے قریب

سیرِ طوفاں کر رہے ہیں، ورنہ ہم چاہیں اگر
ایک کشتی کیا ہے، بحر آجائے ساحل کے قریب

ایک ہی منزل کے سب راہرو ہیں، اتنا فرق ہے
دُور ہے منزل سے کوئی، کوئی منزل کے قریب

حضرتِ سیمابؔ میرا کیا کوئی ہوتا جواب
رہتے ہوتے آپ اگر گوبند منزل[۵] کے قریب

۵ مراد مکانِ مصنف سے ہے

اہلِ ساحل سے کہو نشتر نہ اترائیں بہت
۶۳ ایک دن ہم بھی پہونچ جائینگے ساحل کے قریب ۲۳

اپنے پہلو میں لیئے ہے کاروانِ اضطراب
دل کہوں میں اپنے دل کو یا جہانِ اضطراب

تھے نہ یہ جبتک نہ تھا نام و نشانِ اضطراب
درحقیقت ظلم ہی تیرے ہیں جانِ اضطراب

کون کہہ سکتا ہے میری داستانِ اضطراب
کہنے والے پہلے پیدا کر زبانِ اضطراب

بیقراری میں بھی رہتا تھا کبھی مجھکو سکوں
اب سکوں میں بھی مرے رہتی ہے شانِ اضطراب

میرے انکے دلمیں ہے فرقِ زمین و آسماں
ایک دُنیائے سکوں ہے اک جہانِ اضطراب

اے سکونِ قلب تجھکو میرے دل سے کیا غرض
تو کہاں پڑتا ہے ناحق درمیانِ اضطراب

جب گئے وہ لے گئے میرا سکوں میرا قرار
دے گئے بدلے میں مجھکو اک جہانِ اضطراب

کیا ہمارے دلکو تسکیں ہو نویدِ وصل سے
آج تک بیٹھے ہوئے ہیں نوحہ خوانِ اضطراب

ایک ہلچل سی جہانِ عشق میں پڑجائیگی
میں سُناؤنگا جب اپنی داستانِ اضطراب

اضطرابِ دلمیں گذری ہے جو ساری زندگی
اب سکوں بھی ہو تو ہوتا ہے گمانِ اضطراب

آنسوؤں سے حالِ دل آنکھیں بیاں کرنے لگیں
جب بیاں سے ہوگئی قاصر زبانِ اضطراب

انتظارِ یار کی راتوں کی کیفیت نہ پوچھ
ساتھ لائی ہیں یہ راتیں اک جہانِ اضطراب

فرق دونوں میں بہت سا، اور دونوں ایک ہیں
اضطرابِ دل مکیں ہے، دل مکانِ اضطراب

اک عجب انداز سے دونوں میں قایم ربط ہے
جانِ دل ہے اضطراب اور دل ہے جانِ اضطراب

رازِ بجلی کے تڑپنے کا مجھے معلوم ہے
کہہ رہی ہے وہ بھی اپنی داستانِ اضطراب

یہ زمین و آسماں عاشق کو کیا آئیں پسند
ہو زمینِ اضطراب اور آسمانِ اضطراب

بجلیاں بھری ہیں غم نے قلبِ مضطر میں مرے
بن گئی ہے ساری دنیا اک جہانِ اضطراب

کیوں شبِ غم کو نہ دیں ترجیح روزِ وصل پر
کیا کریں لیکر سکوں ہم بندگانِ اضطراب

اب سکون و ضبط سے کہدو مرے دل میں نہ آئیں
دشمنانِ قلب ہیں یہ دشمنانِ اضطراب

ایک بجلی تھی کہ تڑپی اور تڑپکر چھپ گئی
اب تو ہم ہیں اور لطفِ جاودانِ اضطراب

برق کی تخلیق سے اُنکا نہ تھا مقصد کچھ اور
صرف تھا منظور میرا امتحانِ اضطراب

بعد مر کے بھی عاشق سے یہ عذر و اجتناب
ابتو یاں آجا، اے او بدگمانِ اضطراب

دل میں رکھنا اضطرابِ دل ہے نشتر زندگی
موت کیا ہے صرف اک خوابِ گرانِ اضطراب

۶۴ ۲۳

کون جاتا ہے خزاں دیدہ گلستاں کے قریب
کہیں جاتے ہیں بشر پیکرِ بیجاں کے قریب

پھر بہار آگئی شاید چمنستاں کے قریب
چاک سے کچھ نظر آتے ہیں گریباں کے قریب

اہلِ گلشن کا تڑپنا کوئی دیکھے اُسوقت
برق جس وقت تڑپتی ہو گلستاں کے قریب

میری اُمیدِ رہائی کے کرشمے دیکھو
دُور رہکر ہوں گلستاں سے گلستاں کے قریب

مدت العمر اسیری کا نتیجہ، توبہ
لوٹ جاتا ہوں میں آ کے گلستاں کے قریب

ہمصفیرانِ چمن اب تو ارادہ یہ ہے
کہ کبھی بھول کے پھٹکیں نہ گلستاں کے قریب

کوندنے لگتی ہے جب چاہتی ہے برقِ تپاں
کیا ہمیں گھر ہے کہیں اسکا گلستاں کے قریب

لطف آجائے اگر برق کو ہو جائے یہ حکم
نہ گلستاں میں گرے اور نہ گلستاں کے قریب

کیا قیامت ہے مسلماں کو ہے ہندو سے گریز
اور ہندو نہیں جاتا ہے مسلماں کے قریب

کیا بُرا تھا جو تو اے برق وہاں گر پڑتی
اک بیاباں بھی تو تھا میری گلستاں کے قریب

وائے قسمت درِ جاناں نہیں ملتا مجھ کو
چاہتا ہوں کہ اماں لوں درِ جاناں کے قریب

آجتک صفحۂ دل سے نہیں مٹتا وہ خیال
ہو کے گذرے تھے کبھی صحنِ گلستاں کے قریب

دیکھکر رنگِ گلستاں، یہ روش ہے اپنی
دُور رہتے ہیں گلستاں سے بیاباں کے قریب

واقعی سہمے ہوئے دل سے بھی اللہ بچائے
اب بھی جاتا ہوا ڈرتا ہوں گلستاں کے قریب

اور کچھ دیر اگر آنکھ نہ کھلتی نشترؔ
میں پہونچ ہی تو گیا تھا درِ جاناں کے قریب

۶۵ ۱۴

کہاں سے دل میں چلے آئے غمِ خزاں کیطرح
غریب بھول رہا تھا یہ گلستاں کی طرح

زمیں جلنے لگی مجھ سے آسماں کی طرح
بہار مجھ کو ستانے لگی خزاں کی طرح

وہ اپنا سر نہ اُٹھائے جو خیریت چاہے
جو اُٹھا بیٹھ گیا گردِ کارواں کی طرح

غمِ فراق میں گذرا شباب کا عالم
بہارِ عمر بھی آئی مگر خزاں کی طرح

ہزار کوئی بھُلائے وہ آشیاں کے مزے
قفس میں رہ نہیں سکتا میں آشیاں کی طرح

مزہ یہ ہے کہ اثر اُن کے دل پہ ہو جائے
فغاں کا شوق ہے اے دل تو کر فغاں کی طرح

نہ جانے کیا یہ ہوا چل رہی ہے عالم میں
بہار باغ میں آتی ہے اب خزاں کی طرح

ہماری جان کو کیا کم تھے آسماں کے ستم
زمین کیوں کھچی جاتی ہے آسماں کی طرح

کبھی بلند خیالی نہ ترک کی ہم نے
رہے زمیں پہ لیکن ہم آسماں کی طرح

عجیب حال ہے دل کا تری محبت میں — کبھی بہار کی صورت، کبھی خزاں کی طرح
رموزِ عشق و محبت چھپائی جاتی ہیں — سُناتے پھرتے ہو کیا سب کو داستاں کی طرح
تو اس بہار پہ اے فائزِ بہار نہ پھول — کہ یہ بہار چلی جائیگی خزاں کی طرح
خدا کرے کہ خدا کا کسی پہ قہر نہ ہو — زمین پٹنے لگتی ہے آسماں کی طرح
زباں اُسی کی ہے بیشک زباں اسی کی ہے — زبان رکھ کے گذار ہو جو بے زباں کی طرح
عجیب حالِ محبت میں ہے مقدّر کا — کہ صبح و شام ہوں چکر میں آسماں کی طرح
خوشی میں غم ہے جو پنہاں، نظر نہیں آتا — بہار سے نہیں ڈرتا کوئی خزاں کی طرح
یہ آزمائشِ روزانہ، نامناسب ہے — جو امتحان مرا لو تو امتحاں کی طرح
بہت ستاتی ہے جب یادِ آشیاں ہمکو — قفس کو دیکھنے لگتے ہیں آشیاں کی طرح
اذیتوں سے نکلتا ہے صبر کا پہلو — قفس میں لگ گیا جی میرا آشیاں کی طرح
مجھے نکال رہا ہے قفس سے خود صیّاد — قفس میں رہنے لگا جب میں آشیاں کی طرح
غمِ بہار سے بچنے کا یہ طریقہ ہے — ہو سیرِ موسمِ گُل موسمِ خزاں کی طرح
قفس میں رنج اٹھائے ہیں آشیاں کے بہت — اب آشیاں کو نہ دیکھیں گے آشیاں کی طرح

میانہ رو رہے دُنیا میں عمر بھر نشتر
نہ ہم زمیں کی طرح تھے نہ آسماں کی طرح

٦٦ ٢٣

کون ہے آئینہ دارِ آرزو میری طرح — کون رہ سکتا ہے اپنے روبرو میری طرح؟
کون آنکھوں سے بہاتا ہے لہو میری طرح — کون ہے بزمِ وفا میں سرخرو میری طرح؟

میں کسی کی یاد میں بیتاب ہوں غرقِ بحرِ اشک
کون پڑھتا ہے نمازیں باوضو میری طرح؟

منزلِ مقصود یوں ملتی ہے دنیا میں کہیں
کوئی آوارہ ہو پہلے چار سو میری طرح

آرزو میری طرح کرنے سے ہی سب کو گریز
چاہتے سب ہیں کہ نکلے آرزو میری طرح

یوں تو ہونے کو ہوئے ہیں آرزو والے بہت
کس نے کھائے ہیں فریبِ آرزو میری طرح؟

تجھکو ہے فکرِ جفا ہر دم۔ مجھے فکرِ وفا
الغرض تیری طرح میں ہوں نہ تو میری طرح

ایک جاتی ہے تو دس موجود ہو جاتی ہیں اور
ہو نہ دشمن بھی شکارِ آرزو میری طرح

اک جہانِ آرزو ہر وقت میرے دل میں ہے
کون ہوگا آرزو ہی آرزو میری طرح؟

آرزو آئی جہاں دل میں مجھے آئی ہنسی
کون اڑائے گا مذاقِ آرزو میری طرح؟

روز دو آنسو ندامت کے بہا کر آنکھ سے
کون کر سکتا ہے دل کی شست و شو میری طرح؟

میری بیتابی کا کچھ اندازہ مل جائے تجھے
کاش میں تیری طرح ہو جاؤں تو میری طرح

بے سبب گردش میں کب ہیں آفتاب و ماہتاب
کر رہے ہیں یہ بھی تیری جستجو میری طرح

دشت گلشن بنگئے تقلیدِ رنگیں سے مری
جسکو دیکھو ہے اسیرِ رنگ و بو میری طرح

۶۷ پھر کرے رشکِ آرزوئے مری نشتر کوئی
پہلے ہو لے کامگارِ آرزو میری طرح ۱۵

بے نیازِ نالہ و آہ و فغاں ہونے کے بعد
لطف ملتا ہے گلے کا بے زباں ہونے کے بعد
فائدہ کیا حملۂ برقِ طپاں ہونے کے بعد

ساری دُنیا جمع ہو جائے دُھواں ہونے کے بعد!
خوگرِ مہر و وفا پہلے ہی تم نے کیوں کیا
ہے ستم نامہربانی، مہرباں ہونے کے بعد
میرے دل کا حال سب آنکھوں نے اُن سے کہدیا
نامناسب تھا یہ ان کو رازداں ہونے کے بعد
جور میں اُن کے کمی ہوتی نہیں ہے نام کو
یہ سلوک اور مجھ سے، لاکھوں امتحاں ہونے کے بعد
خوگرِ قیدِ قفس سے کیوں چھڑاتے ہیں قفس
وہ بھی قطعاً بے نیازِ آشیاں ہونے کے بعد
حشر تک روئیگی شبنم اُس چمن کے حال پر
جو بیاباں ہو گیا ہے گلستاں ہونے کے بعد
پہلے سو سو وسوسے آتے ہیں دل میں قدرتاً
دل کو ہوتا ہے یقیں وہم و گماں ہونے کے بعد
کیا یہی رسمِ وفا ہے، اے وفا دشمن بتا؟
اس قدر نامہربانی مہرباں ہونے کے بعد
آرزوئیں کم ہیں جبتک ہو رہی ہے روک ٹوک
لوٹتا ہے پھر کہیں پانی رواں ہونے کے بعد

آئیں گے مسجد بھی، میخانے سے اے واعظ نہ روک
ہم وہاں بھی جائیں گے لیکن یہاں ہونے کے بعد

کیوں مصیبت سے چرائے کوئی اس دنیا میں دل
پھولتا ہے باغ، بربادِ خزاں ہونے کے بعد

قابلِ افسوس ہے اُس رہروِ منزل کا خواب
جو اُٹھے بانگِ درائے کارواں ہونے کے بعد

اس تنِ خاکی سے کر لے خدمتِ اہلِ جہاں
پھر ہے کس مصرف کی مٹی، رائیگاں ہونے کے بعد

اور ہی نظروں میں ہو جاتی ہے قدرِ آشیاں
اک ذرا ٹیڑھی نگاہِ باغباں ہونے کے بعد

آرزوئیں لطف دیتی ہیں جہانِ عشق میں
کچھ جواں ہونے سے پہلے کچھ جواں ہونے کے بعد

آنکھ میں آنسو ہیں جبتک، ضبط کا امکان ہے
پھر کہیں تھمتے ہیں یہ ظالم رواں ہونے کے بعد

قہر ہے نشترؔ چمن کا چھوٹنا انسان سے
وہ بھی مانوسِ نشاطِ آشیاں ہونے کے بعد

۶۸ ۱۸

ہے نظر ہر شخص پہ ہر شخص کا دل دیکھکر
دم بخود ہوں محفل و اندازِ محفل دیکھکر

جانے کیا کیا اُن سے ہم کہنے گئے تھے بزم میں
مُنہ سے کچھ بھی تو نہ نکلا رنگِ محفل دیکھکر

باغباں برہم نہ ہو، ہم کو چمن سے کیا غرض
آ گئے تھے گرمئی شورِ عنادل دیکھکر

ہم ہی خود بیہوش ہو جائیں تو جلووں کا قصور!
کیا کرے دریا جو ہم لوٹ آئیں ساحل دیکھکر

ایک سازِ بے نوا ہے مجھکو ساری کائنات
آج یوں اُٹھا ہوں یارب کسکی محفل دیکھکر

اک ستمگر کو وفا پیرا بنانے کی ہے فکر
کام جو کرتا ہوں میں، کرتا ہوں مشکل دیکھکر

پتہ پتہ ہے چمن کا بے وفا و بے ثبات
آشیاں اپنا یہاں رکھیں عنادل دیکھکر

ہم تو دعوئے خون کا محشر میں کرنے سے رہے
تم نہ بول اُٹھنا کہیں تصویرِ بسمل دیکھکر

اب تو کچھ دل میں نظر آنے لگا ناصح ہمیں
لوٹئے منزل سے کیا آثارِ منزل دیکھکر

صورتِ انساں اک آئینہ ہے اُسکے قلب کا
قعرِ دریا ہم سمجھ لیتے ہیں، ساحل دیکھکر

یوں بھری محفل میں بیٹھا ہے کسی پر کوئی جان
دیکھ پروانے ذرا آدابِ محفل دیکھکر!

لے دل آرا، دو گھڑی کو محفلِ دل میں بھی آ
دنگ ہو جائیگا اب تو اپنی محفل دیکھکر

غم نہیں برباد ہو جانے کا راہِ شوق میں
خود سنبھالے گا کوئی بربادِ منزل دیکھکر

عرش بھی فرشِ زمیں سے پست آتا ہے نظر
آرہا ہوں آج میں یہ کسکی محفل دیکھکر

کچھ شکایت آپکے جورِ فراواں کی نہیں
ہے پریشانی مجھے کوتاہئ دل دیکھکر

فیض سے تیرے پہونچ جانا کوئی مشکل نہیں
استطاعت دے سمجھ لینے کی منزل دیکھکر

غم میں اپنے غرق رکھ لے بحرِ ناپیدا کنار
کشتئ دل بیٹھتی جاتی ہے ساحل دیکھکر

زیست سے بیزار تھا ہی موت سے بھی ہوں نفور
زندگی ہی زندگی مرنے کا حاصل دیکھکر

اے دلِ پُر شوق یہ ہے کوئے جاناں الوداع — کوئی لوٹا ہے کہ ہم لوٹیں گے محفل دیکھکر
مضطرب دل لیکے جاتا ہوں کیسی بزم میں — جذبِ محفل کاش میں ہو جاؤں محفل دیکھکر
منزلِ مقصود یوں ملنی بہت دشوار ہے — وہ مرا رہبر ہو جو آیا ہو منزل دیکھکر
میں نے آخر فکرِ منزل سے کنارہ کر لیا — گمرہی کی شورشیں منزل بہ منزل دیکھکر
شمع محفل بنکے پہلے تو جلا ڈالا ہمیں — اب کھڑے پچھتا رہے ہیں خاکِ محفل دیکھکر
اب[۱] وہ گوبند[۲] منزل ہے نہ وہ نشتر کا دل — آپ[۲] جب سے چل دیئے گوبند منزل دیکھکر

اپنی اپنی عافیت کی سب کو نشتر فکر ہے
اک کنارے ہو گیا دریا بھی ساحل دیکھکر

۶۹ ۲۵

اُسے پائے گا تو دیوانہ بنکر — وصال اُس کا ہوتا ہی بیگانہ بنکر
کہیں انجمن میں ہے شمعِ فروزاں — کہیں جل رہا ہے وہ پروانہ بنکر
جو ہشیار ہیں عاشقوں میں تمہارے — تمہیں دیکھ لیتے ہیں دیوانہ بنکر
یونہی وحشتِ دل جو بڑھتی رہیگی — رہیں گے کسی روز دیوانہ بنکر
نہ کردوں میں برہم جہاں کو تو کہنا — مکمل تو ہو میرا افسانہ بنکر
محبت سے اپنی نہ تھی یہ توقع — کہ رہ جائیگی ایک افسانہ بنکر
رہا ربط دل کا جو آنکھوں سے اُنکی — رہیگا یہ پیمانہ میخانہ بنکر

[۱]؎ مراد مکانِ مصنف سے ہے۔
[۲]؎ یہ اشارہ گوبند منزل میں حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی کی پہلی تشریف آوری کی طرف ہے۔

کہو عقل سے میرا دامن نہ پکڑے — کہ ہے لطف جینے کا دیوانہ بنکر
قسم ہے تجھے دودِ آہ مسلسل — ذرا چھا تو جا ابرِ میخانہ بنکر
میں اب حسن کے کام کا ہو گیا ہوں — محبت میں دنیا سے بیگانہ بنکر
میں صدقے تری مست نظروں کے ساقی — جہاں رہ گیا صرف میخانہ بنکر

شہادت کی دھن میں جو مرتے ہیں نشتر
وہ ہی لوٹ آتے ہیں پروانہ بنکر

۷ — ۱۲

پھر اس نے اک نظر بھی نہ ڈالی بہار پر — جس کی پڑی نگاہ دلِ داغدار پر
کھائیگا کون ترس مرے حالِ زار پر — تکیہ ہے صرف رحمتِ پروردگار پر
ہر وقت تاک میں ہے فلک بھی زمین بھی — کس کی نظر نہیں مری مشتِ غبار پر
آئے نہ ایک بار جو بھولے سے جیتے جی — بیٹھے ہیں سر جھکائے وہ لوحِ مزار پر
یہ بیکلی - یہ سوز نصیبی - یہ اضطراب — سو بجلیاں نثار دلِ بیقرار پر
وحشت میں رنگِ آبلہ پائی نہ پوچھئے — سو پھول کھل گئے تھے ہر اک نوکِ خار پر
صیاد بیکسی پہ مری کچھ تو رحم کر — کیا تیرے کام آئینگے میرے یہ "چار پر"
ایک ایک ذرہ اس کا ہے صد ماہ و صد سہا — اے آسمان جا مری مشتِ غبار پر
اب چاہے وہ بنائے مجھے یا کرے خراب — اب تو نگاہ جم ہی گئی چشمِ یار پر
سب کے لئے عروج ہے، ہو جلد یا بدیر — آتی ہے ایک روز خزاں بھی بہار پر
جو آجکل ہے امن کہاں تھا بہار میں — ترجیح دے رہا ہوں خزاں کو بہار پر

آثار کہہ رہے ہیں کہ ہے انحصارِ زیست — تیرے ستم پہ، میرے دلِ بیقرار پر
کیا کچھ بدل گیا ہے مزاجِ نسیمِ صبح — کچھ پھول دیکھتا ہوں میں اپنے مزار پر
اے آبروئے عشق یہ توہین ہے تری — وہ ہنس رہے ہیں گریۂ بے اختیار پر
تھا آج اہتمامِ تماشائے کائنات — لیکن نگاہ رُک گئی تصویرِ یار پر
دی تھی جو تُو نے جان، صلہ اُسکا مل گیا
نشترؔ وہ دیکھ آئے ہیں تیرے مزار پر ۱۶

۱۷

ڈر ہے کہ بن نہ جائے دلِ بیقرار پر — سو آفتیں ہیں ایک مری جانِ زار پر
تھا فرض توبہ توڑنا ہر بادہ خوار پر — بارِ شکست توبہ ہے ابرِ بہار پر
نیرنگِ موسمِ گل و لالہ نہ پوچھئے — گل در کنار، خار ہیں پوری بہار پر
آنکھوں میں دم ہے اور اُنھیں آنے میں عار ہے — ہر سانس بار ہے دلِ اُمیدوار پر
انساں خدا کا نام بھی لیتا ہے اسطرح — احسان جیسے کرتا ہو پروردگار پر
یارب مجھے نتیجۂ فریاد مل گیا — دلگیر ہیں وہ آج مرے حالِ زار پر
لکھّی تھی تو نے قیدِ ابد جب مرے لئے — پھر کیوں عطا کئے مجھے "پروردگار" پر
آتا ہے صبح و شام کوئی بہرِ فاتحہ — سو جنّتیں نثار ہمارے مزار پر
کیونکر گذر رہی ہے ہماری، مزار میں — کیا جانیں آنیوالے ہمارے مزار پر
انسان ہے تو خدمتِ انساں کرے بشر — ہے اسکو فوق خدمتِ پروردگار پر
اب ہم ہیں اور گوشہ نشینی و خامشی — وہ دن کہاں، کہ بند نہ تھے ہم ہزار پر

بھولا ہوا ہے موت کی ساعت کو یہ آدمی
اتنا غرور زندگیٔ مستعار پر

پروانے مجھکو یاد دلاتے ہیں ہمدم دوست
گرتے ہیں ٹوٹ ٹوٹ کے شمع مزار پر

پوچھے کوئی ہمارے دل بیقرار سے
جو کچھ گذر رہی ہے دل بیقرار پر

جن کو ہوا یقینِ محبت نہ جیتے جی
وہ سرنگوں کھڑے ہیں ہمارے مزار پر

یہ بیقراریاں تھیں شبِ وصل میں کہاں
دیتے ہیں ہم تو جان شبِ انتظار پر

میرا سکون خاک میں کس نے ملا دیا
کس نے یہ پھول رکھ دیئے میرے مزار پر

شاید یہ میرے آخری خط کا جواب ہو
کچھ لکھ گئے ہیں وہ مرے سنگِ مزار پر

نشتر نہ دیکھ داغِ جگر کی فسردگی
۷۲ آئیگا یہ چمن بھی کسی دن بہار پر ۱۹

فکرِ دنیا میں پڑا ہوں فکرِ عقبیٰ چھوڑ کر
تشنۂ یک قطرہ فانی ہوں دریا چھوڑ کر

اے دلِ نا آشنا محوِ تمنا چھوڑ کر
چل دیا ظالم کہاں تو مجھ کو تنہا چھوڑ کر

فکرِ کعبہ چھوڑ کر، فکرِ کلیسا چھوڑ کر
بیٹھ کوئی عافیت میں ساری دنیا چھوڑ کر

ہم تمہارے در پہ آ بیٹھے ہیں دنیا چھوڑ کر
ہم سے اک دن ہم سخن ہو جا پردا چھوڑ کر

ہائے غم کی آمد رک نہ جائے دلمیں اے صبر و شکیب
بیٹھنا پہلو میں لیکن غم کا رستا چھوڑ کر

دہرِ فانی کی حقیقت اُسکے دل سے پوچھئے
جا رہا ہو جب کوئی دنیا سے دنیا چھوڑ کر

کچھ تو ہے صحرا میں خوبی کچھ تو ہے گلشن میں عیب
برق گرتی ہے یہاں واں امانِ صحرا چھوڑ کر

چھوڑ دیگی تجھ کو یہ دنیا مقرر ایک دن
عقل ہو تجھ میں تو پہلے ہی تو بھی دنیا چھوڑ کر

یوں نہیں کھلتا فریبِ ہستی ناپائیدار
جسکی محتاجِ کرم دُنیا بھی ہے اور دین بھی

آرزومندِ نشاطِ دہر اس ڈر سے نہیں
عیشِ بے پایاں کا ہم رتبہ کہاں دُنیا کا عیش

ساتھ کیا کیا لے چلے اسکا نہیں ہمکو خیال
جو بھلا دے تمکو ایسا رنگ و بو کس کام کا

مستی و ہستی میں واعظ شاعرانہ ربط ہے
تُو نہ ہو اور اہلِ دُنیا جی سکیں ممکن نہیں

آپکے جاتے ہی سُنتے ہیں کہ آنکھیں پھیر لیں
شُستہ شوخیوں تو گنا ہو سکی نہ ہم سے ہو سکی

آپکے پیچھے یہ دُنیا دوڑتی ہے کس طرح
کوئی گھر اللہ دیکھیں اور نا اُمید ہاں

اے بھکاری مانگ کر اب تک تجھے کیا مل گیا
بعدِ مُردن اک جہانِ آرزو ہے میرے ساتھ

شامِ غم دل میں بسایا اُنکی زلفوں کا خیال
بھولکر اُسکو، لگاتا کیوں ہے جی دُنیا سے دل

ہر قدم پر اب نظر آنے لگے الجھاؤ سے

رنگ ہی دُنیا کا غافل دیکھ دُنیا چھوڑ کر
کیوں نہ ہو جاؤں اُسی کا دین و دُنیا چھوڑ کر
غم چلا جائے ترا، دلکو مبادا چھوڑ کر
آبِ بستہ کون لیگا آبِ دریا چھوڑ کر
ہے خیال اسکا چلے دُنیا سے کیا کیا چھوڑ کر
سوئے گلشن جائیں کیوں صحرائی صحرا چھوڑ کر
زندگی کچھ زندگی ہے جام و صہبا چھوڑ کر؟
مچھلیاں زندہ کہیں رہتی ہیں دریا چھوڑ کر
آپ جس بیمار کو آئے تھے اچھا چھوڑ کر
دیکھنا ہے اکدن آنکھوں سے دریا چھوڑ کر
آپ دیکھیں تو کبھی دامانِ دُنیا چھوڑ کر
یہ مرا پھولا پھلا باغِ تمنّا چھوڑ کر
دیکھ کچھ دن لعنتِ عرضِ تمنّا چھوڑ کر
ایک دُنیا لیچلا ہوں، ایک دُنیا چھوڑ کر
دوسرا سودا لیا سر، ایک سودا چھوڑ کر
زہر کیوں پیتا ہے غافل جامِ صہبا چھوڑ کر
پہلے کیا کیا خوش تھے ہم گلشن میں صحرا چھوڑ کر

پھر یہ ہم سے پوچھئے کیونکر گیا پہلو سے دل
پہلے رخ پر دیکھئے زلفِ چلیپا چھوڑ کر

قدرداں اپنا نظر آتا نہیں کوئی یہاں
اے جنونِ عشق ہم جاتے ہیں دنیا چھوڑ کر

چشمِ ظاہر بند کر لو چشمِ باطن کھول لو
اسکا جلوہ دیکھ لو جب چاہو پردا چھوڑ کر

کاش انساں چھوڑ دیتا زندگی ہی میں اسے
آخرِ کار ایک دن جانا ہے دنیا چھوڑ کر

ساری دنیا اسکی ہے، ساری خدائی اسکی ہے
بیٹھ جاتا ہے جو اک گوشے میں دنیا چھوڑ کر

آج راحت ہے یہاں تو کل مصیبت ہی یہاں
نشتر آسودہ کبھی ہو جا یہ دنیا چھوڑ کر

۷۳ ۳۱

سر تا قدم ملال کی تصویر دیکھ کر
دلگیر ہو گئے مجھے دلگیر دیکھ کر

آزاد فطرتا ہوں کچھ اسکا ہے لحاظ
پہنا ئینگا پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

قیدی تمہارے لطفِ اسیری میں ہیں اسیر
کرتے ہیں زور طاقتِ زنجیر دیکھ کر

نالے بھی وہ ملے ہیں بفضلِ خدا مجھے
جو بھاگتے ہیں صورتِ تاثیر دیکھ کر

اتنی جفائیں آپ کی اتنے قصور پر
تعزیر دیجئے مری تقصیر دیکھ کر

برباد خانماں ہوئے مدت گذر گئی
ڈرتے ہیں اب بھی برق کی تنویر دیکھ کر

کیونکر کوئی خطاؤں سے منہ اپنا موڑ لے
رحمت خدا کی لوٹ ہے تقصیر دیکھ کر

پوری جو آرزو ہو وہ کرتے ہیں آرزو
ہم دیکھتے ہیں خواب بھی تعبیر دیکھ کر

دھندلی سی ہے نظر میں شبیہ مہ تمام
اتری ہوئی سی آپکی تصویر دیکھ کر

تیرِ نظر کو دل میں نہ رکھ لوں تو کیا کروں
دل اختیار ہی میں نہیں تیر دیکھ کر

سب کی طرف نظر ہے، ہماری طرف بھی ہو — ہلکا سا اک ادھر بھی کوئی تیر دیکھ کر

جز ترکِ آرزو جو مجھے **نشتر** مفر نہ تھا
ہر آرزو کو پاؤں کی زنجیر دیکھ کر

۷۴ 12

کیا بات ہے کیا ہو گئی کچھ میری نظر اور — تم آئے تو اب کچھ نظر آنے لگا گھر اور

اتنا تو کرم مجھ پہ کرا ے دیدۂ تر اور — جو اُن کی نظر اب ہے وہ ہو جائے نظر اور

ہو جائے جو دل عشق سے مانوسِ اثر اور — ہو چشمِ تماشا میں یہ بام اور یہ دَر اور

قایم جو رہا حال یہ دو چار پہر اور — بیمار کا انجام پھر آتا ہے نظر اور

تم لاکھ یقیں مجھ کو محبت کا دلاؤ — آگاہ ہوں، ہوتی ہے محبت کی نظر اور

جس نے مجھے بیگانۂ کونین کیا تھا — ممکن ہو تو اک ویسی ہی دُزدیدہ نظر اور

کچھ اور تھا وہ اپنی محبت کا زمانہ — دن رات ہی وہ اور تھے، وہ شام و سحر اور

بندہ ہوں قناعت کا مجھے اُن سے نہیں کام — اب حرص و ہوا سے کہو دیکھیں کوئی گھر اور

سو بار کی بیتی ہوئی ہم کہتے ہیں اپنی — تھی تیری نظر اور تو تھی سب کی نظر اور

کافی نہیں اب درد کو دل ایک جگر ایک — مل جائیں الٰہی مجھے دل اور جگر اور

دُشمن کی عنایت ہو کہ ہو خوبیِ قسمت — کچھ روز سے ہم دیکھتے ہیں اُنکی نظر اور

تُو پاس ہے اور دیکھ نہیں سکتے تجھے ہم — ہو کاش میسّر ہمیں توسیعِ نظر اور

تم زخمِ جگر کے، نہ بہت غور سے دیکھو — گھبرے کہیں ہو جائیں نہ یہ زخمِ جگر اور

دل مانگ رہا ہے ترا درد اور زیادہ — آتی ہے جگر سے یہ صدا "دردِ جگر اور"

کچھ دن سے نظر اور نظر آتی ہے اُن کی — یا ہو گئی کمبخت ہماری ہی نظر اور
کیوں دیر و حرم میں تجھے تخصیص ہے اے دل — کیا کوئی اُدھر اور ہے ناداں اِدھر اور
کیا دیکھیے جذباتِ شہادت کا ہو انجام — قاتل کی نظر اور ہے بسمل کی نظر اور
اب ہجر کی شب اس کی دُعا بھی نہ کرینگے — ہم جتنی کشش کرتے ہیں کھنچتی ہے سحر اور
گو میں یہ سمجھتا ہوں ابھی دل ہے مع الخیر — دیتے ہیں مگر خون بھرے اشک خبر اور
اُس بزم سے اُٹھنے کو طبیعت نہیں ہوتی — جی چاہتا ہے دیکھ لوں پھر ایک نظر اور
کافر ہو جو عاجز ہو غمِ عشق سے نشتر — ہم اور بھی لیلیں، ہو غمِ عشق اگر اور

۲۱

جور کرتے نہیں وہ جور کے قابل ہو کر — قتل کرنا نہیں آتا انھیں قاتل ہو کر
جب بھی آئے ہیں تری بزم میں شامل ہو کر — سر سے پا تک بخدا آئے ہیں ہم دل ہو کر
لوٹ آنا تو روا ہی نہیں اُس محفل سے — بزم میں جائیے پروانۂ محفل ہو کر
یک بہ یک منزلِ مقصود کہیں ملتی ہے — بحر کا ملتا ہے رستہ سرِ ساحل ہو کر
طور کیطرح نہیں، ہوش میں رکھکر مجھکو — مجھ سے اک بات کسی روز مقابل ہو کر
نہ ملی منزلِ مقصود تو غم کیا اسکا — ابھی نکلے ہیں کہاں طالبِ منزل ہو کر
ماہِ نو کے یہی تیور ہیں اگر کچھ دن اور — دیکھ لینا یہ رہیگا مہِ کامل ہو کر
چھوڑتے ہی نہیں رنج و غمِ فرقت مجھکو — رہ گئے ہیں مری تقدیر میں شامل ہو کر
اللہ اللہ یہ دردِ دل و آلامِ فراق — زندگی رہ گئی ہے موت کا حاصل ہو کر

ہو گیا ناز کے قابل دلِ صد چاک مرا — اُن کے تیرِ نگہِ ناز سے بسمل ہو کر
چھوڑ کر کون تری یاد کو دُنیا میں پھنسے — کون ہو جائے ستارہ مہِ کامل ہو کر
پھینک دوں دل کو کہیں چیر کے پہلو نشتر
۷۶ کام میرے نہیں آتا یہ مرا دل ہو کر ۱۳

تاریک و تنگ ہے مرا دل ترے بغیر — یہ آسماں ہے، بے مہِ کامل ترے بغیر
چلتا نہیں ہے کام کچھ اے دل ترے بغیر — کچھ بھی نہیں ہے عشق کا حاصل ترے بغیر
مٹی پلید تھی مری اے دل ترے بغیر — ہوتا ہی کون عشق کے قابل ترے بغیر
تڑپا کیا ہے رات کو قاتل ترے بغیر — کرتا ہے کون پرسشِ بسمل ترے بغیر
للہ آ کہ ہجر میں جینا تو درکنار — مرنا محال ہے مجھے قاتل ترے بغیر
منجدھار میں بھی تو ہی بچائے تو بچ سکوں — ممکن نہیں رسائیِ ساحل ترے بغیر
قربان تیری قدرتِ کامل کے اے خدا — قائم ہے کس طرح تری محفل ترے بغیر
طوفاں سے پار ہو گئے سب لے کے تیرا نام — ہم رہ گئے کھڑے سرِ ساحل ترے بغیر
محفل وہی ہے، بیٹھنے والے بھی ہیں وہی — لیکن نہیں وہ رونقِ محفل ترے بغیر
اے جذبِ شوقِ منزلِ مقصود، المدد — مشکل ہے کامیابیِ منزل ترے بغیر
جنّت کو بھی سلام، اگر تو نہ ہو وہاں — جنّت میں بھی نہ ہم تو ہوں داخل ترے بغیر
اے حسنِ بے نیاز، تغافل کی حد بھی ہے — سُونی پڑی ہے عشق کی محفل ترے بغیر
اے عشق تو نہ ہو تو گلوں کو کھلائے کون — نغمے کہاں سے پائیں عنادل ترے بغیر

تو آ گیا خدا کی قسم خیر ہو گئی
تھا بے قرار آج بہت دل ترے بغیر

کیا کچھ نہیں ہے دید کے قابل یہاں، مگر
کچھ بھی نہیں ہے دید کے قابل ترے بغیر

وابستہ حسن و عشق سے ہیں سرفروشیاں
میرے بغیر کچھ ہے نہ قاتل ترے بغیر

بہلائیں کس طرح دلِ وحشی کو کیا کریں
لگتا نہیں ہے آج کہیں دل ترے بغیر

سو سو طرح کے ہیں دلِ مضطر کو وسوسے
تنہائیاں بھی ہیں مجھے محفل ترے بغیر

چرخِ کہن میں تو نے لگائے ہیں چار چاند
تھا ورنہ اُسمیں کیا مہِ کامل ترے بغیر

تجھ پر مرے نہ سارا زمانہ تو کیا کرے
جینے کا لطف ہی نہیں قاتل ترے بغیر

ہمت کہاں تھی کہ نکلتا تلاش میں
آئی گئی ہوئی مری منزل ترے بغیر

تھا یہ ترا کرم، مجھے اپنا بنا لیا
ہوتا نہیں کبھی ترے قابل ترے بغیر

رنج و الم بھی پیار کے قابل ہیں تیرے ساتھ
خوشیاں بھی احتراز کے قابل ترے بغیر

اے عشق تو نہ ہو تو نظامِ جہاں کہاں
یکجا نہ ہو سکے کبھی دو دل ترے بغیر

تو بھی تو آ، کہ تیرے لئے مر رہا ہوں میں
خنجر کریگا کیا مرے قاتل ترے بغیر

سوگند ہے جو آنکھ اُٹھائی ہو اُس طرف
آیا تھا رات کو مہِ کامل ترے بغیر

ہر چیز میں خلش ہے اگر تو نہ ساتھ ہو
خنجر سے کم نہیں مہِ کامل ترے بغیر

محفل کا حال کیا ہو جو موجود تو بھی ہو
جب اس قدر ہے رونقِ محفل ترے بغیر

ہر جرعۂ شراب میں ہیں تلخیاں ہنوز
آبِ حیات ہے سمِ قاتل ترے بغیر

نشتر پہ بھی نگاہِ کرم ہو کسی طرح

۳۰

"ہے اُس کا بیقرار بہت دل ترے بغیر"

ماسوا کی فکر سے خالی نہیں ہے دل ہنوز
تیرا گھر اور تیرے رہنے کے نہیں قابل ہنوز

کب سے ہے شوقِ شہادت اور نہیں بسمل ہنوز
جس کو قاتل کہہ رہا ہوں وہ کہاں قاتل ہنوز

ہے محبت میں وہی بیچارگیِ دل ہنوز
سخت مشکل ہے کہ ہے مشکل مری مشکل ہنوز

خاک اُڑاتا میں بھی آیا ہوں رہِ عشق کی
اُڑ کے بیٹھی تک نہیں گردِ رہِ منزل ہنوز

ایک مدت ہوگئی دل جب سے اپنا دل نہیں
ہم کہے جاتے ہیں لیکن دل کو اپنے دل ہنوز

جستجوئے منزلِ مقصود اک مدت سے ہے
ہے وہی صبر آزما، گمراہیِ منزل ہنوز

آپکی مشکل کشائی کی زمانے میں ہے دھوم
سخت حیرت ہے کہ ہے مشکل مری مشکل ہنوز

روح ہے بیتاب، دل کی دھڑکنیں پُرشور ہیں
اور ہم پہونچے نہیں ہیں تا درِ محفل ہنوز

ایک ہی کر دے انھیں اے لذتِ آزادِ عشق
متصل سی اک خلش ہے فرقِ دردِ دل ہنوز

اب جو منزل ہی ترس کھائے تو بن سکتی ہے بات
دور ہے منزل سے اپنی طالبِ منزل ہنوز

خاکِ پروانہ کہاں ہے، نقشِ پروانہ کہاں
رنگِ محفل میں نہیں ہے، گرمیِ محفل ہنوز

راہرو کی سرپھری سے نہیں مانوس میں
دل کو گرمائے ہوئے ہے حسرتِ منزل ہنوز

کس قیامت کی نظر تھی آپ کی پہلی نظر
ہو رہا ہے درد رہ رہ کر قریبِ دل ہنوز

جانتے ہیں اُنکے دل پر ہو نہیں سکتا اثر
ہم کئے جاتے ہیں لیکن آہِ لاحاصل ہنوز

تیری محفل سے مجھے آئے زمانہ ہو گیا
سامنے نظروں کے ہے لیکن تری محفل ہنوز

موت پروانے کی ہے دراصل اس کی زندگی
خاک میں مل کر بھی وہ ہے زینتِ محفل ہنوز

ہاں پلائے جا یونہی ان مست آنکھوں سے شراب — ہوش ہے کچھ کچھ مجھے ساقیٔ دریا دل ہنوز
پھر نہ لوٹی وہ جوانی، وہ مرا عہدِ شباب — ایک دن ہر ماہ آتا ہے مہِ کامل ہنوز
دیکھیے ہو کشتیٔ و طوفان کا کب تک فیصلہ — بحر ابھی پُر شور ہے، خاموش ہے ساحل ہنوز
حُسن کو مدِ نظر ہے خیر مقدم عشق کا — آتے ہیں لینے وہ مجھ کو تا درِ محفل ہنوز
ہم گئے تو پھر نہ قسمت لائی محفل میں تری — بار یابِ بزم ہے، پروانۂ محفل ہنوز
دیکھتے ہی دیکھتے برخاست محفل ہو گئی — دیکھنے پائے نہ تھے ہم رونقِ محفل ہنوز
ڈھونڈنے والے کہیں ملتی ہے منزل اس طرح — تو کہاں ہے سرگرانِ کاوشِ منزل ہنوز
آرزوئے دیدِ جاناں کیا کروں کیونکر کروں — دل یہ کہتا ہے کہ میں اسکے نہیں قابل ہنوز
آپکی جانب سے کچھ تو ہے جفاؤں میں کمی — جس کو دل کہنے لگے دُنیا، کہاں وہ دل ہنوز

ہو چکا ہے کون نشتر غرقِ گردابِ فنا
موج ٹکراتی ہے سر اپنا لبِ ساحل ہنوز

۲۶

ماند ہے تجھ سے ماہتاب ہنوز — نہیں ممکن ترا جواب ہنوز
ایک تو ہے کہ مستِ خواب ہنوز — ایک میں ہوں کہ ہوں خراب ہنوز
رُخِ انور ہے آفتاب ہنوز — آنکھ ہے ساغرِ شراب ہنوز
عمر بھر میں بس اک دُعا کی تھی — نہ ہوئی وہ بھی مستجاب ہنوز
کب ہوئی تھی شبِ فراق کی شام — نہیں آثارِ آفتاب ہنوز
اُن کے آنے کی کچھ اُمید نہیں — ہے مگر نیند اپنی خواب ہنوز

داغِ دل ہو گئے فسردہ کیوں — ہے جوانی پہ آفتاب ہنوز
شکریہ آرزو و نصیبی کا — دل میں ہے گرمیٔ شباب ہنوز
ایک وہ بوند ازل میں پی لی تھی — دل میں ہے مستیٔ شراب ہنوز
غش میں اب تک ہیں حضرتِ موسیٰ — کیا وہ ظالم ہے بے نقاب ہنوز
تھا جو بے مثل و لاجواب کبھی — ہے وہ بے مثل و لاجواب ہنوز
بعدِ محفل بھی سامنے ہیں مرے — ساقی و محفل و شراب ہنوز
کچھ اضافہ قیام میں نہ ہوا — زیست انساں کی ہے حباب ہنوز
رنگِ عالم بدل چکا ہے بہت — چاہیے ایک انقلاب ہنوز
ہوئی طوفانِ نوحؑ کو مدت — کتنی دنیا ہے زیرِ آب ہنوز
سفرِ بحرِ عشق کب سے ہے — ہیں مگر ہم کنارِ آب ہنوز
جس کے ملنے پہ انحصارِ زیست — اُسکا ملنا خیال و خواب ہنوز
میں نے قربان جان تک کر دی — اُس کو مجھ سے ہے اجتناب ہنوز
کب سے آراستہ ہے بزمِ شراب — کیوں نہیں چرخ پر سحاب ہنوز

نشتر آئے وہ اور چلے بھی گئے
ہے وہ ہی دل میں اضطراب ہنوز

۶۹ — ۲۰

رات دن تھا گُل فشاں ابرِ بہار اب کے برس — خوب برسی رحمتِ پروردگار اب کے برس
آئی ہے کس رنگ سے فصلِ بہار اب کے برس — رنگ پھولوں کا لئے ہے خار خار اب کے برس

ایک ساعت بھی نہیں دل کو قرار اب کے برس — جانے کیسے آئے ہیں لیل و نہار اب کے برس
دل لیں ساقی ہے بہت کیف بہار اب کے برس — ایک ساغر کی جگہ ہوں چار چار اب کے برس
آگئی صیاد کے گھر بھی بہار اب کے برس — کیسے گذریگی مرے پروردگار اب کے برس
کچھ مزہ دیتی نہیں فصل بہار اب کے برس — بدمزہ سی ہے شراب خوشگوار اب کے برس
باغ میں آتی ہے یا غم خانۂ صیاد میں — دیکھیں آتی ہے کہاں فصل بہار اب کے برس
فصل گل تو ہر برس آتی تھی صحن باغ میں — دل ہوا جاتا ہے کیوں بے اختیار اب کے برس
ساقیا میں تیری چشم مست و میگوں کے نثار — یونہی اڑجائیگی کیا فصل بہار اب کے برس
بھولجائیں آپ شاید، ہو رہا ہے سال ختم — آئیے ہوجائیں پھر قول و قرار اب کے برس
فیض ساقی کی بدولت کچھ نہ واعظ کی چلی — سال بھر پوری رہی ہم بادہ خوار اب کے برس
کوئی دیکھے تو ذرا میری جنوں سامانیاں — پھر نہ جیتے آئیگی آکر بہار اب کے برس
پچھلے برسوں کیطرح دھوکا نہ کھائیں اہل باغ — اپنے اپنے آشیاں سے ہوشیار اب کے برس
ہم اسیری میں خدا معلوم تڑپیں کس قدر — کاش ٹل جائے کہیں فصل بہار اب کے برس
چاک ہی پر اکتفا اب کے نہ ہو دست جنوں — بات جب ہے ہو گریباں تار تار اب کے برس

ایک دن بھی جا سکے نشتر نہ ہم سوئے چمن
۸۰ کس بری ساعت سے آئی تھی بہار اب کے برس ۱۶

جو بلا آتی ہے آتی ہے گلستاں کیطرف — جی میں آتا ہے نکل جائیں بیاباں کیطرف
ہے وہی گلشن، وہی گلشن کے پتے پھول پھل — جی نہیں ہوتا کہ اب دیکھیں گلستاں کیطرف

حضرتِ موسیٰؑ پہ ہے الزامِ ناکامی فضول
تاب کس کی ہے کہ دیکھے برقِ عریاں کیطرف

حسن ظاہر پر رہا کرتی ہے دُنیا کی نظر
کس کی جاتی ہے نظر اسرارِ پنہاں کیطرف

میکشو آؤ چلو پھر بادہ نوشی کی ٹھنے
پھر گھٹا اُونچی چڑھائی ہے گلستاں کیطرف

ہمصفیرانِ چمن کو منع کر دیتا کوئی
بیٹھتے ہیں کیوں ہوائیں میرے زنداں کیطرف

دل بہت اپنا جو گھبراتا ہے زنداں میں کبھی
آنکھ اُٹھا کر دیکھ لیتے ہیں گلستاں کیطرف

فصلِ گُل آتے ہی تحریکِ جنوں پیدا ہوئی
ہاتھ پھر جانے لگے جیب و گریباں کیطرف

ہو گئے زنداں میں دن اتنے کہ ہم تو اکطرف
اب تصوّر بھی نہیں جاتا گلستاں کیطرف

کچھ ہمارے دل کا بھی لازم ہے زنداں میں لحاظ
ہم سے کہکر کیوں کوئی جائے گلستاں کیطرف

آدمی کو ہو نہ احساس اس کا ہے یہ بات اور
کھنچ رہے ہیں سب مگر گورِ غریباں کیطرف

آؤ واعظ خلد کی جانب چلیں کچھ دُور ساتھ
تم چلے جانا اُدھر، ہم کوئے جاناں کیطرف

جن کو اپنے حسن و رعنائی پہ نشترؔ ہو غرور
روز ہو آیا کریں گورِ غریباں کیطرف

۷۱ ۱۳

نہیں آتی ہے اُٹے آج میری چشمِ گریاں تک
گناہوں پر مجھے ہونے نہیں دیتی پشیماں تک

رہیں گے چاک کیا محدود اب کے جیب و داماں تک
پہونچتا کیوں نہیں دستِ جنوں آخر گریباں تک

اسیری میں کہاں ممکن کہ پہونچیں ہم گلستاں تک
خرامِ بیکسی محدود ہے دیوارِ زنداں تک

محبت پھولتی پھلتی انھیں کی ہم نے دیکھی ہے
نہیں ہوتا ہے پاداشِ وفا کا جنکو ارماں تک

نہ ہو ہم کو خبر لیکن لگا ہے تار بجلی کا،
ہماری منزلِ اوّل سے زمینِ کوئے جاناں تک

اُجاڑے کس لئے دیتی ہے اے بادِ خزاں اسکو
گلستاں میری دُنیا ہے، مری دُنیا گلستاں تک

زمانے پر نہ جا ای دل، خدا پر رکھ نظر اپنی
زمانہ ساتھ جائیگا فقط گورِ غریباں تک

ٹھہر جائینگی جس دن اپنی نظریں، پھر کہاں جلوے
یہ جلوے ہیں ستمگر ظالم، ہماری چشمِ حیراں تک

سلامت چاہیے دل، اور دل میں جذبہِ اُلفت
پہونچ ہی جائینگے اکدن زمینِ کوئے جاناں تک

نہ جانے ہمصفیرانِ چمن کس حال میں ہونگے
نہ وہ آتے ہیں زنداں تک نہ ہم جاتے ہیں نیستاں تک

ستم ڈھاے چلے جاتے ہیں آنسو آج تو یارب
چلے آتے ہیں آنکھوں سے بہے جاتے ہیں داماں تک

وہاں کیوں عیش اور آرام ہی کی حکمرانی ہے
نہیں دستِ فلک شاید، رسا ایوانِ جاناں تک

گلستاں کو گلستاں ہم نے جس دن سے نہیں سمجھا
گلستاں کا مزہ دینے لگے دشت و بیاباں تک

اسیری میں ستاتی ہے بہت جب یادِ گلشن کی
چلے جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے، دیوارِ زنداں تک

نشاط و غم کی قدرت نے حدیں کیا خوب رکھی ہیں
گلستاں سے بیاباں تک، بیاباں سے گلستاں تک

مرے مرتے ہی دُنیا کیوں چلی مُنہ موڑ کر مجھ سے
ابھی تو ساتھ ہے اُسکا مرا، شہرِ خموشاں تک

خوشی انساں کو کس طرح من مانی ملے نشتر
۲۶ نہیں ملتے یہاں جب حسبِ خواہش رنج و حرماں تک ۱۷

سرِ فرشِ زمیں سے لامکاں تک
مری دنیا کہاں سے ہے کہاں تک

نہیں محفوظ اس سے لامکاں تک
صدائے دل پہنچتی ہے کہاں تک

عجب بد قسمتی سے واسطہ ہے
وہ سو جاتے ہیں ختمِ داستاں تک

مجھے کہنی ہیں وہ باتیں جو تم سے
کسی دن کاش آجائیں زباں تک

مری گمراہیاں ہیں خضرِ منزل
کبھی پہنچونگا تیرے آستاں تک

جو لے چلنا ہے اے صیاد مجھکو
بچھا دے گُل قفس سے آشیاں تک

نہ پوچھو مجھ سے میعادِ اسیری
نہیں اب تو خیالِ آشیاں تک

پتہ مجھ کو ملے شاید نہ صیاد
کسی کو ساتھ کر دے آشیاں تک

کرے تلقین نہ کوئی ضبطِ غم کی
رہے میری زندگی میری فغاں تک

نہ جانے رازِ دل کیوں کر ہوا فاش
قسم لے لو جو آیا ہو زباں تک

نہ کر اے باغباں ٹیڑھی نگاہیں
میری دُنیا ہے میرے آشیاں تک

نہیں سُنتی ابھی میری زمیں بھی
کبھی میری سُنیں گے آسماں تک

مری غربت کی کوئی حد ہے نشتر
نہیں معلوم اپنا آشیاں تک

۳ے ۱۳

چمن کے چار پھولوں پر یہ زعم اے باغباں کبتک
یہ بوئے گلستاں کبتک، یہ رنگِ گلستاں کبتک

نشاطِ چند روزہ میں رہیں گے غم نہاں کبتک
رہینگی سایۂ ابرِ سیہ میں بجلیاں کبتک

اجازت اب تو ہو اے ضبطِ غم فریاد کرنے کی
زباں رکتے ہوئے آخر مری خاموشیاں کبتک

قضا بیمارِ غم کی جان لیتی ہے کوئی دم میں
نہ جانے گھر سے چلکر آپ پہونچیں گے یہاں کبتک

ابھی تک دن محبت کے ہمیں یاد آئے جاتے ہیں
نہ جانے اِس بجھے شعلے سے اُٹھیگا دھواں کبتک

خدا کیواسطے اے ضبطِ غم، تو راہ لے اپنی
فغاں کرنے کو ترسے آرزو مندِ فغاں کبتک

نہ جانے تفرقہ کس وقت اِن دونوں میں پڑ جائے
ارے او بے خبر یہ اتحادِ جسم و جاں کبتک

نہ پڑ اے باغباں للہ پیچھے چار تنکوں کے — یہ میرا آشیاں کب تک، یہ تیرا گلستاں کب تک
تھی بے زبانی کو عطا کر لطفِ گویائی — رہیگی گفتگوئے عشق، محتاجِ زباں کب تک
کبھی ہم کارواں سے اپنے آخر مل ہی جائینگے — نہیں آتا نظر دیکھیں غبارِ کارواں کب تک
ذرا روزِ ازل کو دیکھئے اور آج کے دن کو — یہ آخر عاشقوں کے امتحاں پر امتحاں کب تک
مجھے ہر ذرّے میں دے لطفِ سنگِ آستاں یارب — رہے میری جبیں محدودِ سنگِ آستاں کب تک
اسے او محوِ باطل دل۔ خدا سے۔ اور یوں غافل — مذاقِ حق بھی اب کچھ دن مذاقِ این و آں کب تک
قفس میں بیٹھکر باتیں قفس کی زیب دیتی ہیں — یہ ذکرِ گلستاں کب تک، یہ فکرِ آشیاں کب تک
جو قصے ہو رہے ہیں آجکل وہ دیکھ اے غافل — یہ آدم اور حوّا کی پرانی داستاں کب تک
تمنائے چمن دل میں جو صادق ہے تو زنداں میں — نہیں آتی ہے ہم دیکھیں ہوائے گلستاں کب تک
رہیگی ایک دن مٹ کر، جو میرا عشق قایم ہے — خودی رہتی ہے دیکھوں میرے انکے درمیاں کب تک
ہماری بے زبانی کی بھی تجھ کو قدر لازم ہے — کرم تیرا رہیگا حاصلِ آہ و فغاں کب تک
ازل سے کہتے آئے ہیں، ابد تک کہتے جائینگے — نہیں سنتے ہیں وہ دیکھیں ہماری داستاں کب تک
ہمیں احساسِ لطفِ غم کی بھی توفیق دے یارب — نشاطِ خندہ روزہ پہ منائیں شادیاں کب تک
مری قسمت مجھے صرفِ خیالِ یار کر دیتی — نماز و روزہ و سجدہ کی یہ پابندیاں کب تک

گیا دورِ شباب، اب عہدِ پیری آگیا اختر
۲۴ خدا کیواسطے جاگو بھی، یہ خوابِ گراں کب تک ۲۲

ہے بیدرد جس پر فدا ہو گئے ہم — یہ کس روگ میں مبتلا ہو گئے ہم

ہمیں دیکھئے کیا سے کیا ہو گئے ہم ۔۔۔ خودی جب سے چھوڑی، خدا ہو گئے ہم
حسیں کوئی دیکھا فدا ہو گئے ہم ۔۔۔ بلاؤں میں خود مبتلا ہو گئے ہم
تری راہ میں جب فنا ہو گئے ہم ۔۔۔ غمِ دو جہاں سے رہا ہو گئے ہم
نہ تھا مدعا وہ، ہوا جو نہ حاصل ۔۔۔ جہاں سے بسر مدعا ہو گئے ہم
کوئی محفلِ وعظ میں ہم کو دیکھے ۔۔۔ تو سمجھے بڑے پارسا ہو گئے ہم
جفا کرتے کرتے جفا بن گئے وہ ۔۔۔ وفا کرتے کرتے وفا ہو گئے ہم
اُدھر تم نے پھیری نگاہِ محبت ۔۔۔ اِدھر زندگی سے خفا ہو گئے ہم
تجھے کچھ خبر ہے، تصور کے رستے ۔۔۔ تری بزم میں بارہا ہو گئے ہم
ہوئی بھول یہ بھی محبت میں ہم سے ۔۔۔ کہ اُمیدوارِ وفا ہو گئے ہم
رہینگی نہ باقی جفائیں تمہاری ۔۔۔ کسی دن جو محوِ دُعا ہو گئے ہم
اُنھیں ماننی ہی پڑی بات آخر ۔۔۔ سراپا جہاں التجا ہو گئے ہم
یہ فیضِ محبت ہوا ہم کو حاصل ۔۔۔ زمانے کے درد آشنا ہو گئے ہم
تمہاری نگاہوں میں کیا شعبدے تھے ۔۔۔ یہ کیا کر دیا تم نے، کیا ہو گئے ہم
پلائیں وہ خود تو پھر انکار کیسا ۔۔۔ کہاں کے بڑے پارسا ہو گئے ہم

حیاتِ انتہا اپنی رکھتی تھی نشتر
فنا ہو کے لا انتہا ہو گئے ہم

۵، ۱۶

جو مستغنیِ ماسوا ہو گئے ہم ۔۔۔ خدا جانتا ہے خدا ہو گئے ہم

گرفتارِ حرص و ہوا ہو گئے ہم — تھا ہونا تو کیا اور کیا ہو گئے ہم
جہاں اُن سے غافل ذرا ہو گئے ہم — سزاوارِ جرم و خطا ہو گئے ہم
قناعت بھی اپنا، ندامت ہی ہمکو — کہ احسان مندِ قضا ہو گئے ہم
بڑھالی کبھی زندگی اپنی ہم نے — کبھی آپ اپنی قضا ہو گئے ہم
ہمارے خلاف اُس نے مانگی دُعا جب — تو بڑھکر شریکِ دُعا ہو گئے ہم
نہ بھولیگی وہ سیرِ کوئے محبت — چلے اور بادِ صبا ہو گئے ہم
محبت کی باتیں، محبت کی گھاتیں — وہ ناخوش ہوئے تو خفا ہو گئے ہم
یہ کیا کر دیا اسے نگاہِ محبت — ستم دوست غم آشنا ہو گئے ہم
خدا جانتا ہے جو مجبوریاں تھیں — خوشی سے کہاں پارسا ہو گئے ہم

٧٦ پسِ مرگ چھیڑا کئے ہم کو **نشتر**
وہ سمجھے کہ شاید خفا ہو گئے ہم ١١

ہے یہ کوئی تبسّم، یہ کیا ہوا تبسّم — ہلکا سا ایک۔ وہ بھی جھجکا ہوا تبسّم
فرقت میں کیا بتائیں ہم کیا ہوا تبسّم — اب ہے کہاں تبسّم جلتا ہوا تبسّم
بے کیف ہو رہا ہوں، اس وقت سر سے پا تک — ایسے میں ایک ظالم مچلا ہوا تبسّم
قلب و جگر پہ میرے سو بجلیاں گراتا — یہ کون آرہا ہے، کرتا ہوا تبسّم
سچ پوچھئے تو غم سے پیدائشِ خوشی ہے — جس وقت ٹک گیا غم، پیدا ہوا تبسّم
کیوں فرق کر رہا ہے، موسیٰ ہیں اور ہم ہیں — پھر کیوں نہیں دکھاتا۔ دیکھا ہوا تبسّم

اظہارِ ناخوشی تم کیوں مفت کر رہے ہو
کیا کہہ رہا ہے دیکھو رُکتا ہوا تبسم

دیکھا تھا جو تبسم، موسیٰ نے تیرا اک دن
اک بار پھر اُسی سے ملتا ہوا تبسم

کیا بات میں نے ایسی ناراضگی کی کہہ دی
کیوں جارہا ہے واپس آیا ہوا تبسم

دن ہو کہ رات ظالم، ہٹتا نہیں نظر سے
انداز میں وہ تیرا ڈوبا ہوا تبسم

سو بجلیاں گرا دیں، سو آفتیں بپا کیں
تو جس طرف سے گذرا کرتا ہوا تبسم

آثارِ ناخوشی کے سب ہو رہے ہیں رخصت
ہونٹوں پہ آرہا ہے ہنستا ہوا تبسم

کمبخت دل کو، اب تک بجلی سے کم نہیں ہے
سو بار کا ہمارا دیکھا ہوا تبسم

روتا ہوا ہر انساں آتا ہے اس جہاں میں
ہے لُطف جب کہ جائے کرتا ہوا تبسم

جانے کہاں کی خوشیاں، کس کس طرح کی خوشیاں
لاتا ہے ساتھ اپنے، آتا ہوا تبسم

اللہ مر نہ جائے کون اس ادا پہ تیری
آئینے کے مقابل جھجکا ہوا تبسم

سارے جہاں پہ نشترؔ برسا رہا ہے خوشیاں
سارے جہاں پہ اُس کا چھایا ہوا تبسم

۱۷ ''

یہ کس غضب میں ہیں یارب نگاہِ یار سے ہم
قرار ہم سے جُدا ہو گیا قرار سے ہم

چمن میں رہتے تھے مل کر گلوں سے، خار سے ہم
گذارتے تھے دن اپنے بڑی بہار سے ہم

ملے کہیں تو یہ پوچھیں نگاہِ یار سے ہم
پھریں کہاں تک اسی طرح دلفگار سے ہم

بسے ہوئے اثرِ زلفِ مشکبار سے ہم
ابھی ابھی چلے آتے ہیں بزمِ یار سے ہم

نہ دشمنی ہے کسی سے، نہ بغض ہے، نہ حسد
ہیں پاسدارِ محبت ہر اعتبار سے ہم

دعائے وصل کہاں، شکوۂ فراق کہاں
کہ اب تو مست ہیں کیفِ خیالِ یار سے ہم

الٰہی خیر، دلِ غم نصیب کی اپنے
نظر بچرانے لگے آج بیقرار سے ہم

بہار میں بھی اسیری سے ہیں خزاں دیدہ
خزاں میں رہتے تھے مسرورِ کسِ بہار سے ہم

تمام عمر کے شکوے شکایتیں لیکر
قیامت آئیگی نکلیں گے جب مزار سے ہم

قفس سے چھوٹ کے آئے تھے جب گلستاں میں
لپٹ کے روتے تھے ہر برگ و شاخسار سے ہم

خمارِ مست نگاہی کے تیری اے ساقی
نہیں ہیں کم کسی بد مست بادہ خوار سے ہم

کہیں گناہ نہ رحمت سے انکی کم رہجائیں
ہوں نیکیاں تو بدل لیں گناہگار سے ہم

ترے لئے کہیں بجلی بنے کہیں سیماب
پھرا کئے یونہی دنیا میں بیقرار سے ہم

مزے بہار کے پاتے تھے جو کبھی یارب
وہ لطف کیوں نہیں پاتے ہیں اب بہار سے ہم

نہ بھول سکتی ہے وہ ہم کو اور نہ ہم اسکو
نگاہِ یار ہے ہم سے، نگاہِ یار سے ہم

ہمارے پاس قناعت ہے، اُسکے پاس کہاں
کہیں زیادہ ہیں تب میں تاجدار سے ہم

دل اک لطیف سی شے ہے سوز کی بارش
الٰہی دیکھ رہے ہیں کیا شرار سے ہم

خبر کسے ہے کہ یہ فیضِ چشمِ ساقی ہے
دکھائی دیتے ہیں سبکو شرابخوار سے ہم

مزہ جو ہجر میں تھا، وصل میں نصیب کہاں
نہ بیقرار ہے وہ ہیں، نہ بیقرار سے ہم

پکارتے ہیں وہ دیوانہ کہہ کے جب ہم کو
۶۸ جواب دیتے ہیں نشترؔ کس افتخار سے ہم ۲۰

اگر ہم زمیں ہیں تو عرشِ بریں تم
بھلا کیا ٹھکانہ، کہیں ہم کہیں تم

وہ حالت ہماری ہے جب سے نہیں تم
کہ سُنکر کروگے بمشکل یقیں تم

کبھی یوں بھی مل جاؤ ہم کو کہیں تم
جہاں اور کوئی نہ ہو، ہوں ہمیں تم

نگاہوں میں رہنا دمِ واپسیں تم
بُرے وقت دھوکا نہ دینا کہیں تم

نہ دُنیا رہی ہے، نہ دُنیا رہے گی
رہے ہیں ہمیں تم، رہیں گے ہمیں تم

نچوڑا اسمیں سب ہے تمہارے ستم کا
کسی روز دیکھو مری آستیں تم

فراموش کر کر کے روز اپنے وعدے
ہمیں بھول جانا نہ یوں ہی کہیں تم

خبر بھی ہے تم کو جو گذری شبِ غم
نچوڑو تو میری ذرا آستیں تم

کہاں تک یہ عشاق کا قتل آخر
رہو گے زمانے میں کیا اب تمہیں تم

ہے دُنیا اندھیری، خدا جانتا ہے
مری آنکھ کے سامنے جب نہیں تم

تمہارے لئے ہم نے چھوڑا تھا سب کو
مگر سب کے ہوا اور ہمارے نہیں تم

نبھی جب نہ مجھ سے تو کس سے نبھے گی
کسی کے نہیں تم جو میرے نہیں تم

مری آہ و زاری کا عالم نہ پوچھو
ذرا دیکھ لو دامن و آستین تم

خدا جانے ہو جائے کیا حالِ دُنیا
جو ہو جاؤ کچھ دیر کو خشمگیں تم

بہت آسرا تھا قیامت کے دن کا
نہ مل پائے گو تھے وہیں ہم وہیں تم

بُرا حال ہے آج قلب و جگر کا
مریں ایسے میں ہوتے کہیں تم

خدا کی قسم واقعہ ہے یہ نشتر
بناتے ہو گلشن غزل کی زمیں تم

ڈھونڈیں تو نہیں ملتے ہو ڈھونڈے سے کہیں تم
اور پھر یہ تماشا کہ جہاں ہم ہیں وہیں تم

اک ماہِ مبیں چرخ پہ اک ماہِ مبیں تم
سرتاجِ فلک وہ ہے تو سرتاجِ زمیں تم

جب دل میں سمائے مرے رہتے ہو ہر وقت مکیں تم
بیگانہ ہو کتنے ہی، بیگانہ نہیں تم

ہو جاؤ پھر اک بار کبھی طور نشیں تم
دُنیا یہ سمجھتی ہے کہیں ہو ہی نہیں تم

بن جاؤ مری آنکھ میں اس طرح کہیں تم
جس سمت نظر جائے، نظر آؤ تمہیں تم

کرنے کو کرو سارا جہاں زیرِ نگیں تم
گر درد نہیں دل میں تو انسان نہیں تم

ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جہاں تم نہیں ہوتے
اور پھر یہ شکایت ہے کہ ملتے ہی نہیں تم

کچھ آج دلِ زار کا ہوتا نہیں احساس
رکھنا تو ذرا ہاتھ مرے دل کے قریں تم

جس روز ستم کرتے ہو تازہ کوئی دل پر
اُس روز زیادہ نظر آتے ہو حسیں تم

رکھتی ہیں وہ دل چھید کے تیر ملی نگاہیں
اور دیکھنے کو دیکھتے ہو سوئے زمیں تم

سجدوں کا اگر شوق رہا سر میں سلامت
ایک روز سراپا مجھے دیکھو گے جبیں تم

کافر ہیں ادائیں بھی، نگاہیں بھی ہیں کافر
ایمان کی پوچھو تو ہو غارت گرِ دیں تم

پروانے کی مانند کہیں سوزِ مجسم
ہو شمع صفت جلوۂ خاموش کہیں تم

۸۰ یوں اُس سے ملاقات کا ہونا نہیں ممکن ۱۴
نشتر ابھی کچھ روز رہو گوشہ نشیں تم

تیری محفل میں چلے آتے ہیں بے باکانہ ہم
جاں سے ڈرتے نہیں ہیں صورتِ پروانہ ہم

سر سے پا تک بن گئے ہیں آج تو پیمانہ ہم
چھوٹنے والے نہیں اب عمر بھر میخانہ ہم

آج یوں محفل میں پہونچے اُسکی بیباکانہ ہم شمع وہ تھا اور بیتابی سے تھے پروانہ ہم

اس توقع پر کہ ہو جائیگی کم، دل کی بھڑاس سب سے کہتے پھرتے ہیں گذرا ہوا افسانہ ہم

ہے ہمیں اپنا بنانے کی اُنھیں دن رات فکر اپنی ہستی سے مگر ہوتے نہیں بیگانہ ہم

کیا محبت ہے تری، کیا چاہنے والے ترے سنتے آتے ہیں ازل سے ایک ہی افسانہ ہم

ہو گئی دیر آج بزمِ وعظ میں واعظ ہمیں اب خدا ہی ہے اگر پائیں کھلا میخانہ ہم

سوزِ فرقت میں جلے جاتے ہیں جسکی رات دن کاش سمجھے جائیں اُسکی بزم کا پروانہ ہم

خیریت توبہ کی پھر ہمکو نظر آتی نہیں آج بادل دیکھتے ہیں پھر سرِ میخانہ ہم

کیا کسی سے اپنا افسانہ کہیں اور کیوں کہیں چار دن کے بعد خود ہو جائینگے افسانہ ہم

دل کی حالت اور ہے قدموں کی حالت اور ہے کیا پہونچنے کو ہیں نزدیکِ درِ جانانہ ہم

رات دن رکھنے کو انجامِ محبت سامنے کل اُٹھا لائے ہیں کچھ خاکسترِ پروانہ ہم

رنگِ عالم اور ہے، رنگِ فضا کچھ اور ہے آج شاید آ گئے نزدِ درِ میخانہ ہم

کیا تری محفل نشینی کا یہی انجام ہے دیکھتے ہیں ہر طرف خاکسترِ پروانہ ہم

بیعتِ ساقی کسی دن ہو گی واعظ کو ضرور دیکھتے ہیں روز اسکو حاضرِ میخانہ ہم

خود بھی وحشی بن گئے ہیں دل لگانا تھا مگر یوں کئے جائینگے کبتک خاطرِ دیوانہ ہم

کیوں کسی سے دل لگائیں، کیوں کسی پر جان دیں دارِ فانی کو سمجھتے ہیں مسافر خانہ ہم

فیضِ چشمِ مستِ ساقی کیا کریں نشتر بیاں
دیکھتے ہیں ہر طرف موجود اک میخانہ ہم

راستے میں راستہ پھر بھول جائیں تا نہ ہم ساتھ ہی رکھیں گے اب کے بادہ و پیمانہ ہم

جا رہے ہیں جان دینے صورتِ پروانہ ہم
کون جاتا ہے، چلے ہیں جیسے بیباکانہ ہم

دل میں رکھتے ہیں خیالِ جلوۂ مستانہ ہم
دیکھتے ہیں سامنے آنکھوں کے اک میخانہ ہم

کیوں کریں آخر طوافِ کعبہ و بتخانہ ہم
اپنے دل میں دیکھتے ہیں جلوۂ جانانہ ہم

اپنے افسانے کے لکھنے کا تو ہمکو ہے خیال
سوچتے یہ ہیں کہ دیں کیا سرخیِ افسانہ ہم

لغزشیں محمولِ گستاخی پر اے ساقی نہ کر
ہیں ابھی ناواقفِ رسم و رہِ میخانہ ہم

سامنے آنکھوں کے آجاتا ہے محفل کا سماں
دیکھ لیتے ہیں جہاں بکھرے پرِ پروانہ ہم

کل قفس میں آگیا تھا اڑ کے اک تنکا کہیں
خوب روئے یاد کرکے اپنا غربت خانہ ہم

حور، ہم کو چاہیے واعظ، نہ جنت چاہیے
آرزو یہ ہے کہ ہوں خاکِ درِ میخانہ ہم

چاہئیں کچھ اشک، اور کچھ خاکِ محفل چاہیے
پھر مرتب کر رہے ہیں عشق کا افسانہ ہم

دیکھکر یہ دورِ عشرت، رنگِ محفل، بزمِ مے
کیا چلے جائیں یوں ہی اے ساقیٔ میخانہ ہم

بیعتِ ساقی کسی دن ہو گی واعظ کو ضرور
ساتھ لیجانے لگے ہیں تا درِ مے خانہ ہم

ساکنِ میخانہ ہیں ہم، موت کا کیا ہمکو خوف
جانتے ہیں موت کو اک لغزشِ مستانہ ہم

روز محفل میں تری جا کر یہ ہوتا ہے خیال
کیوں نہ لے آئے ازل سے فطرتِ پروانہ ہم

کیا بتائیں کاٹتے ہیں کسطرح فرقت کی رات
رات بھر کہتے ہیں دل سے آپکا افسانہ ہم

ایک ہی ڈھب پر ہیں قائم وارداتِ حسن و عشق
سنتے آتے ہیں ازل سے ایک ہی افسانہ ہم

تو کہ انسانی چرا از سر فروشی قاصری
جان قرباں میکند در بزمِ او پروانہ ہم

کاش ہو جائے کہیں اسطرح نشتر اتفاق

۸۲ بانٹ لے دُنیا خوشی، لے لیں غمِ جاناں نہ ہم ۱۸

لذت جو ہجر میں ہے کہاں ہے وصال میں
اللہ یہ نشاطِ تصورِ ملال میں!

اب فرق کیا بتاؤں فراق و وصال میں
وہ سامنے نہیں ہیں، مگر ہیں خیال میں

ذکرِ فراق میں، کوئی فکرِ وصال میں
دیکھو جسے وہ مست ہے اپنے خیال میں

اُس کو بُلا رہا ہوں قیودِ وصال میں
جو وہم میں نہ آئے، نہ آئے خیال میں

دعویٰ تھا جس نگاہ کو تنقیدِ حُسن کا
گم ہو کے رہ گئی ترے حسن و جمال میں

شکوہ پہ میرے مجھ سے نہ برہم ہو اس قدر
اک بات تھی نکل گئی منہ سے ملال میں

تدبیرِ وصلِ یار نہ پوری ہوئی ہنوز
ہم کس خیال میں ہیں فلک کس خیال میں

حُسن و وفا میں وحدتِ مشرب یہی تو ہے
میں اُنکے ذہن میں ہوں وہ میرے خیال میں

اے دل یہ ہے خلاصۂ صبر و رضائے عشق؟
تسکین کا ہو رنگ ہجومِ ملال میں

محشر میں اور کوئی نہ جب آسرا رہا
میں غرق ہو گیا عرقِ انفعال میں

پردے کا یہ لحاظ، یہ عصمت کا بند و بست
آئے نہ بے نقاب وہ میرے خیال میں

انسان کو چاہیے کہ نہ سوچے بُری کبھی
رہتی ہے ہو کے بات جو آئی خیال میں

دُنیا میں اہلِ دردِ محبت کے ہیں وہی
جنکو خوشی کا لطف ہے حاصل ملال میں

جنکو نصیبِ عشرتِ دُنیا نہیں ہوئی
دیکھیں شریک ہو کے ہمارے ملال میں

اب سوچتا ہوں کیوں نہ میں قدموں پہ گر پڑا
اتنی سی بات اور نہ آئی خیال میں

محفل میں اُنکی بار نہیں ہے مجھے تو کیا
وہ خود ہیں جلوہ گر مری بزمِ خیال میں

۸۳ نشتر وہ رو دیئے مرے اظہارِ حال پر ۱۷
کوئی تو بات تھی مرے اظہارِ حال میں

اُنھیں عذر خواہِ ستم دیکھتے ہیں / الٰہی یہ کیا آج ہم دیکھتے ہیں
خوشی کو بہ اندازِ غم دیکھتے ہیں / عجب دیکھنا ہے جو ہم دیکھتے ہیں
ستم دیکھتے ہیں، کرم دیکھتے ہیں / جو قسمت دکھاتی ہے، ہم دیکھتے ہیں
نہیں کوئی تخصیصِ دیر و کلیسا / بہ ہر سُو جمالِ صنم دیکھتے ہیں
جفائیں مسلسل، وفائیں مسلسل / نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں
وہ ہیں زینت افروز کاشانۂ غم / حقیقت ہے یا خواب ہم دیکھتے ہیں
تڑپتے ہیں کیا کیا، خدا جانتا ہے / سکوں اپنے دل میں جو ہم دیکھتے ہیں
ہٹالی نظر جب سے دُنیا سے ہمنے / نظر بند دُنیا کو ہم دیکھتے ہیں
جہاں دیکھتے تھے جمالِ صنم ہم / وہیں ہم جمالِ صنم دیکھتے ہیں
کہاں تونے پہونچا دیا اے محبت / کہاں اپنا سر آج خم دیکھتے ہیں
جو اوروں پہ کرتے ہیں ظلم و تشدد / وہی چار دن بعد ہم دیکھتے ہیں
نہ دیکھیں وہ محفل میں ہمکو، نہ دیکھیں / یہ کیا کم ہے اُن کو تو ہم دیکھتے ہیں
نظر فی الحقیقت نظر ہے انھیں کی / جو دُنیا کو دُنیائے غم دیکھتے ہیں
یہ آہِ سحر کا نتیجہ ہے شاید / محیط آج ابرِ کرم دیکھتے ہیں
اُٹھا کر نظر دیکھتے ہیں جہاں تک / محبت کی دُنیا میں غم دیکھتے ہیں

اب آ گئے رہِ عشق جو کچھ دکھائے
ابھی تک تو ثابت قدم دیکھتے ہیں

یہی مرکزِ عیش تھا دل ہمارا
جسے آپ بربادِ غم دیکھتے ہیں

فریبِ اُمیدِ سحر دے نہ ہم کو
کہیں صبحِ بیمارِ غم دیکھتے ہیں

ہم آلودۂ معصیت ہو کے نشتر
کسی کی نگاہِ کرم دیکھتے ہیں

۸۴ ۱۹

وفا و ناز کے مارے جلائے جاتے ہیں
تمام عمر کے روٹھے منائے جاتے ہیں

خلافِ غیر کچھ اُن سے لگائے جاتے ہیں
جمیں وہ یا نہ جمیں ہم جمائے جاتے ہیں

وہ اپنے جور و ستم روک لیں، کرم یہ نہیں
کرم یہ ہے کہ مسلسل ستائے جاتے ہیں

وہ آ رہے ہیں صبا سے کہو ذرا ٹھہرے
چراغ قبر کے سب جھلملائے جاتے ہیں

تسلیاں بھی نہیں دیتے تمام شب گذری
ٹھہر ٹھہر دلِ مضطر وہ آئے جاتے ہیں

وہ سیر کر کے چمن سے چلے گئے کب کے
چمن کے پھول ابھی مسکرائے جاتے ہیں

ٹھہر ٹھہر کے ذرا مجھ کو ذبح کر صیّاد
تمام پھول لہو میں نہائے جاتے ہیں

جو ہو تو ڈوب مرے آنسوؤ نہیں غیرتِ عشق
ہمارے رونے پہ وہ مسکرائے جاتے ہیں

پلا دے اور ابھی دو چار جام ہی ساقی
نہیں تو ہوش میں ہم اپنے آئے جاتے ہیں

وہ چھیڑے جاتے ہیں اپنی نظر سے ہنس ہنس کر
ہمارے زخمِ جگر مسکرائے جاتے ہیں

فریبِ حسن میں لانے کا یہ طریقہ ہے
نہیں ہے اور محبت جتائے جاتے ہیں

انھیں ہے روز طلب مجھ سے اک نئے دل کی
بتاؤ میرے بنائے بنائے جاتے ہیں؟

کہیں وہاں بھی نہ ہو رنجِ رشک، ڈر یہ ہے — تمام حشر میں اپنے پرائے جاتے ہیں
بھلائے کوئی محبت کے واقعے کیونکر — بھلا رہا ہوں مگر یاد آئے جاتے ہیں
عجیب حال ہے اُنکا، نظر نہیں آتے — مگر نگاہ میں، دلمیں سمائے جاتے ہیں

ہماری سادگیٔ عشق اور فریبِ جمال
نبھائے جاتے ہیں نشتر نبھائے جاتے ہیں

۸۵ ۱۶

چھوڑ کر جائیں تری محفل کہاں — آئے تھے جس دل سے اب وہ دل کہاں
اب کہاں وہ رنگ وہ محفل کہاں — جاکے بہلائیں ہم اپنا دل کہاں
کون اُٹھا بزم سے کہتا ہوا — دل کہاں ہے، دل کہاں ہے، دل کہاں!
ہنس رہے ہیں سن کے وہ رودادِ دل — سو گئی ظالم زبانِ دل کہاں
ہیں جبیں کے سجدے کو دیر و حرم — لیکن انہیں سجدہ گاہِ دل کہاں
باغ سے نفرت ہے صحرا سے گریز — دیکھیں لیجائے جنونِ دل کہاں
کیا نبھے، کبتک نبھے، کیونکر نبھے — جو ہمارا دل ہے، اُنکا دل کہاں
ڈھونڈتے ہو میرے سینے میں کسے — دل مجسم درد ہے اب دل کہاں
لیجئے وہ آرہے ہیں دل بدست — خالی جاتی ہے فغانِ دل کہاں
درد دینے والے تو ہیں سینکڑوں — ہے مگر درد آشنائے دل کہاں
جب سے دیکھی ہے کسی کی بزمِ ناز — کچھ نہ پوچھو ہم کہاں ہیں دل کہاں
حضرتِ ناصح سُنے کون آپ کی — ایسی باتوں کو یہاں اب دل کہاں

اب تمنا کس کی، کیسی آرزو — دل نہیں پھر آرزوئے دل کہاں

کیا کروں نشتر علاجِ دردِ دل
اب مجھے دل پر یقینِ دل کہاں

۸۶ ۱۴

لیکے پہونچا اضطرابِ دل کہاں — میں کہاں اُس شوخ کی محفل کہاں

لیچلا تو اے دلِ بسمل کہاں — کوچۂ قاتل کہاں، قاتل کہاں

اُن کے جلووں میں فنا ہونا محال — قسمتِ پروانۂ محفل کہاں

چل پڑا ہوں میں تو راہِ عشق میں — فکر یہ کب تک کہ ہے منزل کہاں

کیوں نہ خود ہی ختم قصہ کیجئے — ڈھونڈتے پھرئیے درِ قاتل کہاں

انتہائے غمِ محبت میں ہو کیوں — اس سمندر کا کہیں ساحل کہاں

اہلِ دُنیا کو بھی ہونگی مشکلیں — جو مجھے مشکل ہے، وہ مشکل کہاں

میں تصور میں شہیدِ ناز ہوں — سرگرانِ منتِ قاتل کہاں

رات دن اس فکر میں درماندہ ہوں — میں کہاں ہوں، ہے مری منزل کہاں

ہے ابھی سے کیوں مری فکرِ زوال — میں ابھی اے آسماں کامل کہاں

اہلِ محفل دو گھڑی کی بات ہے — صبح ہوتے ہم کہاں، محفل کہاں

ہوا بُرا کمبخت میرے ہوش کا — رہنے دیتا ہے مجھے غافل کہاں

اے مسافر کیا ملے منزل تجھے — دل ترا وابستۂ منزل کہاں

دفعتاً طوفان سے تھے ہمکنا — کہنے پائے کچھ لبِ ساحل کہاں

ذرّہ ذرّہ اسکا تھا دنیائے عشق — پھینکدی خاکسترِ محفل کہاں

میں ہوں اور ہے رات دن کا اضطراب
۸۷ اب سکوں نشتر مجھے حاصل کہاں ۱۶

دار و رسن کی قائم بنیاد کر رہے ہیں — بھولے ہوئے سبق ہم پھر یاد کر رہے ہیں

اب وہ مجھے بھلا کر، کیوں یاد کر رہے ہیں — ناحق سکونِ دل کو برباد کر رہے ہیں

جو خوگرِ قفس کو آزاد کر رہے ہیں — گویا وہ بے پری پر بیداد کر رہے ہیں

چُپکے پڑے، خدا کو ہم یاد کر رہے ہیں — فریاد کرنیوالے فریاد کر رہے ہیں

اندھیر کیا یہ ظالم صیاد کر رہے ہیں — جب لطفِ قید آیا، آزاد کر رہے ہیں

برباد کر رہے ہیں کچھ اسطرح وہ دل کو — دیکھے تو کوئی سمجھے آباد کر رہے ہیں

اِک ہم کہ بعدِ مُردن بھولا ہمیں زمانہ — اک وہ کہ جنکو ابتک سب یاد کر رہے ہیں

بیکار ہو چکے جب، سب بال و پر ہمارے — اب قید کرنیوالے آزاد کر رہے ہیں

فریاد کا مزہ ہے لب پر رہے خموشی — صورت یہ کہہ رہی ہو، فریاد کر رہے ہیں

یہ زندگی چمن کی کیا خاک زندگی ہے — ہر وقت انتظارِ صیاد کر رہے ہیں

یارب یاد آئے اُن کو مری اسیری — وہ آج قیدیوں کو آزاد کر رہے ہیں

ہے مائلِ تغیر، شاید نظامِ گلشن — آپس میں مشورے کچھ صیاد کر رہے ہیں

وہ دیر آشنا ہے، وہ دشمنِ وفا ہے — یاد آ نہیں رہا ہے، ہم یاد کر رہے ہیں

سچ ہے کہ قدر انساں ہوتی ہے بعدِ مُردن — ہم کو بھلانے والے اب یاد کر رہے ہیں

پتّوں کا کھڑ کھڑانا ہے ماتم بہاراں
گویا چمن کے پتّے فریاد کر رہے ہیں

مدّت ہوئی قفس میں بچھڑے ہوئے چمن سے
ابتک مزے چمن کے ہم یاد کر رہے ہیں

دُنیا سمجھ رہی ہے ہم کو خموش نشتر
ہم یوں بیان اپنی روداد کر رہے ہیں

۸۸ ۱۷

قبول ہو جو نہ بھولے سے وہ دُعا ہوں میں
کسی کی آہ بھی ہو جو نہیں تو نارسا ہوں میں

سمجھ میں جو نہیں آتا ہے میرا کیا ہوں میں
عجیب چیز محبت میں ہو گیا ہوں میں

جو کہہ رہا ہے مرا دل، وہ کہہ رہا ہوں میں
دل ایک ساز ہے اور ساز کی صدا ہوں میں

نگاہ پھیر لی مڑتے ہی میری جانب سے
خطا معاف، تم اب بیوفا ہوئے یا ہوں میں

مری نگاہ میں کچھ اہمیت قضا کی نہیں
ہزار بار یونہی مر کے جی چکا ہوں میں

تمہارے ہاتھ ہی ہے میری شرم بندہ نواز
تمہارا بندہ ہوں جیسا برا بھلا ہوں میں

ہزار میں نے نہ کی ہو کبھی خطا کوئی
خطا ہی منہ سے یہ کہنا کہ بے خطا ہوں میں

جو درد دل میں مرے ہے کسی کے کیا ہوگا
کسی کو رنج ہو آفت میں مبتلا ہوں میں

یہ میری گم شدگی ہے عجیب گم شدگی
پہونچکے دامنِ منزل تک کھو گیا ہوں میں

جہاں خلافِ ادب ہے گمان کا بھی گذر
خیال میں اُدھر اکثر نکل گیا ہوں میں

مجھے نہ خوفِ قضا ہے نہ کاہشِ انجام
کہ ابتدا ہی سے جویائے انتہا ہوں میں

ہوں آج رشک کے قابل جو دیکھئے مجھ کو
نہ مدعی ہوں کسی کا نہ مدعا ہوں میں

حد آشنا ہی نہیں ذوقِ منزلِ مقصود
کبھی کبھی تو کچھ آگے نکل گیا ہوں میں

خدا کیواسطے اب چھیڑ پھر نہ اے ناصح — کہ بارہا ترے دھوکے میں آ چکا ہوں میں
فلک کا خوف نہ اب ہے نہ اسکی چالوں کا — محیطِ کوچۂ جاناں میں آ گیا ہوں میں

سُنے نہ آج زمانہ تو غم نہیں نشتر
سُنیں گے سب جسے اک دن وہ صدا ہوں میں

۸۹ ۱۶

کمی کچھ ہو سکے تو کیجئے میرے ستانے میں — کہیں ایسا نہ ہو دل ٹوٹ جائے آزمانے میں
مصیبت سی مصیبت ہے الٰہی دل لگانے میں — وہ اب آنکھوں کے آگے ہیں جو سُنتے تھے فسانے میں
تصور لیکے پھرتا ہے مجھے سارے زمانے میں — مری آزادیاں تو کوئی دیکھے قید خانے میں
غنیمت ہے سکوں اتنا بھی ملنا اس زمانے میں — چمن میں آشیاں ہے اور ہم ہیں آشیانے میں
تجھے اے برق کیا ملجائیگا اس کے جلانے میں — سوا تنکوں کے کیا رکھا ہے میرے آشیانے میں
کبھی صیاد کا کھٹکا۔ کبھی بجلی کا اندیشہ — جہاں آرام ہے تکلیف بھی ہے آشیانے میں
تہیدستانِ قسمت پر بھی ہو جائے کرم اک دن — الٰہی کیا کمی ہو جائیگی تیرے خزانے میں
گئے وہ دن ہوا کرتی تھی بارش تازہ پھولوں کی — اب اکثر بجلیاں رہتی ہیں میرے آشیانے میں
قفس اور آشیاں میں فرق اگر کچھ ہے تو اتنا ہے — کبھی ہے آشیاں ہم میں کبھی ہم آشیانے میں
بجائے خود بہت بے کیف ہے، مجنوں کا افسانہ — یہ ٹکڑا جوڑ دے کوئی مری غم کے فسانے میں
ہمیں تو ایک لمحہ زندگی کا بھی قیامت ہے — جئے کس طرح اربابِ وفا اگلے زمانے میں
کسی سے راز کہنا، راز کی تشہیر کرنا ہے — جہاں منہ سے نکالی بات اور پھیلی زمانے میں
چھڑانا آشیاں کا ہم سے اے صیاد مشکل ہے — نہیں ہم آشیانے میں، تو دل ہے آشیانے میں

نکال لے باغباں ہمکو سمجھ کر آشیانے سے
جبھی تک باغ بھی ہے، ہم ہیں جبتک آشیانے میں

تصور کو خدا رکھے، تخیل کو خدا رکھے
یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہیں آشیانے میں

ہمیں قیدِ قفس سے کیا کہ ہم آزادِ گلشن ہیں
وہ ہی تو قید ہونگے، جو رہیں گے آشیانے میں

ذرا کہدے کوئی ان بجلیوں سے کیوں تڑپتی ہیں
فقط اب آشیاں ہے، ہم نہیں ہیں آشیانے میں

جو باہر آشیاں کے تھے خس و خاشاک سے بدتر
وہ نکلے اب رگِ گل سے سوا ہیں آشیانے میں

یہی خواہش اگر قائم ہے دل میں آشیانے کی
تو پھر اکدن مجھے سب دیکھ لیں گے آشیانے میں

دل جلوۂ طلب، چل دولتِ دیدار لے آئیں
کوئی پھر بن سنور کر آگیا آئینہ خانے میں

نہ آزادِ محبت ہو، نہ پابندِ محبت ہو
سکوں کی آخری تدبیر اک یہ ہے زمانے میں

قفس والوں کو اچھا جانتا ہوں اُن سے میں نشترؔ
جو ہیں صیاد کے گھر میں نہ اپنے آشیانے میں

۹۰ ۲۲

سب کے آگے شکوہ بیداد اُن سے کیا کریں
کیوں مذاقِ عشق اپنا مفت میں رسوا کریں

سوچتے ہیں کیا کسی پر خون کا دعویٰ کریں
کیوں قیامت میں قیامت اک نئی پیدا کریں

خود سکھا دیتی ہے فطرت حسن کو ناز و ادا
گیسوؤں سے کون کہتا ہے کہ بل کھایا کریں

منحصر جن کی عیادت پر تھی اُمیدِ شفا
آج وہ بھی کہہ گئے بیمار سے "ہم کیا کریں!"

ہجر کی شب صبح کرنے کا ہو کچھ تو مشغلہ
چاکِ دل پر رشتۂ اُمید سے بخیا کریں

دلدہی کا سلسلہ یا رب یونہی جاری رہے
روز دیدیں ایک دل، روز ایک دل پیدا کریں

دل سے گر نکلے تو اک اشکِ ندامت ہو بہت
فائدہ کیا اپنی آنکھوں کو جو ہم دریا کریں

جب بہار آئیگی اس کی خیریت ممکن نہیں
جب یہ صورت ہو تو پھر توبہ کی ہمت کیا کریں

اب تکلف برطرف، کر دو کچھ ایسا انتظام
تم رہو نظروں سے پنہاں، ہم تمھیں دیکھا کریں

حدِ ممکن تک رہا محدود نظارہ تو کیا
بات تو جب ہے کہ ہم ہر سو تمھیں دیکھا کریں

پھر کسی سے دل لگائیں، پھر کسی پہ جان دیں
زندگی کی پھر نئی صورت کوئی پیدا کریں

ڈوب مر اے غیرتِ سوزِ محبت ڈوب مر
جل کے مر جائیں پتنگے، ہم کھڑے دیکھا کریں

اشک ہائے خوں سے دامن کو بنائیں پر بہار
"موسمِ گل آ گیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں"

بحرِ ہستی سے مریضِ غم گذرنے ہی کو تھا
یہ نہ سوچا تم نے ایسے میں کنارہ کیا کریں

حسرتیں ہوں، غم ہوں، اُمیدیں ہوں، یا ارماں ہوں
کاش یہ سب دل میں آ کر درد بن جایا کریں

یہ بھی کیا انصاف ہے، آئیں نہ اک دن سامنے
اور تصور میں ہمارے رات دن گھوما کریں

حسن کی فطرت جفا ہے، عشق کی فطرت وفا
دونوں ہی مجبور ہیں، تم کیا کرو ہم کیا کریں

رات کی تاریکیوں میں سو رہی ہو جب فضا
کوئی بھی ہم کو نہ دیکھے، ہم تمھیں دیکھا کریں

حسرتِ دل راز ہے، ناقابلِ اظہار ہے
وہ نہ سمجھیں خود تو اظہارِ تمنا کیا کریں

کوئی کہہ دے اُن سے پھر آنے لگا ہے مجھکو ہوش
پھر مجھے بیخود بنا کر سب سے بیگانا کریں

اہلِ دُنیا کو اگر خواہش ہے تیرے عشق کی
پہلے دل پیدا کریں، پہلے جگر پیدا کریں

ظلم ہوں چاہے ستم، عاشق کو خاموشی ہی خوب
عاشقی اس کو نہیں کہتے کہ واویلا کریں

کٹ گئی ہنس کر کہ رو کر چار دن کی زندگی
عارضی ہے جب یہ دُنیا کیوں غمِ دُنیا کریں

ہم جو بیخود رہتے ہیں نشتر تو یہ کیا جرم ہے

۹۱ وہ نہیں آتے تو ہم آپے میں آکر کیا کریں ۲۴

سرائے دہر میں اے دل کیا قیام کہاں — تجھے خبر نہیں کیا؟ ہے ترا مقام کہاں

کسی کے حسن سے کیا حسنِ حور کو نسبت — یہ مہ تمام کہاں، ماہِ ناتمام کہاں

خدا کے واسطے مجھ سے اُلجھ نہ اے زاہد — تجھے خبر بھی ہے کچھ، ہے مرا مقام کہاں

جدھر ہے میکدہ اُس سمت روز حضرتِ شیخ — نہ جانے جاتے ہیں دو بار صبح و شام کہاں

یہ ہے وہ فرض جو آداب سے مبرّا ہے — نمازِ عشق میں سجدہ کہاں سلام کہاں

نگاہ بدلی ہوئی دیر سے ہے ساقی کی — سُبو سُبو وہ کہاں اب، وہ جام جام کہاں

کہاں ہے کوئی زمانے میں بے غم و بے فکر — جو شاد کام ہے، وہ بھی ہے شاد کام کہاں

چمن میں کیا کوئی پھر حادثہ ہوا تازہ — یہ لوگ جاتے ہیں دوڑے ہوئے تمام کہاں

ملی ہے موت کے بعد اور اک حیات نئی — ابھی فسانہ ہوا ہے مرا تمام کہاں

میں انتقامِ ستم اُن سے لوں نہیں ممکن — کہ ہے سیاستِ اُلفت میں انتقام کہاں

ہم آج قیدِ عناصر سے ہوئے ہیں رہا — خوشی کا وقت ہے یہ رنج کا مقام کہاں

ہمارا اور عدو کا مقابلہ کیسا — شہیدِ عشق کہاں، حرص کا غلام کہاں

خدا کے واسطے اے دردؔ اور کر تکلیف — ہوا ہے رات کا سونا ابھی حرام کہاں

۹۲ قضا ہے اصل میں آغازِ زندگی نشترؔ ۱۴
شروع قصہ ہے قصے کا اختتام کہاں

فنا ہوئے بھی تو ہے رنج کا مقام کہاں — ابھی فسانۂ عقبیٰ کا اختتام کہاں

جو زلفِ شام ہے اُسکی، تو صبح روئے حسیں
سوائے اسکے محبت میں صبح و شام کہاں

ہماری آنکھوں میں بیٹھو نظر سے پوشیدہ
کہ بہتر اس سے ہے پردے کا انتظام کہاں

کسے خبر تھی، کہ انجام کار یہ ہوگا
ہوئی ہی صبح محبت کی میری، شام کہاں

میں اپنی زیست کے انجام کی کروں کیونکر فکر
جب ابتدا نہیں میری، تو اختتام کہاں

ہزار بار اگر اب ہو صبح و شام تو کیا
وہ صبح و شام کہاں لطفِ صبح و شام کہاں

ہے راہِ عشق کلہ گوشۂ زمیں جنت
سمجھ میں تو نہیں آتا کروں مقام کہاں

جو دل میں آتی ہے اپنے وہ کر گذرتے ہیں
جنوں میں فرق ہے فرقِ طبیعت کی روک تھام کہاں

لہو کے گھونٹ ہیں اور ہم ہیں ہجرِ ساقی میں
کہاں وہ بزمِ نشاط اور دورِ جام کہاں

ہماری طرح ہوں سب عشق آشنا نشتر
ابھی وہ خاص طریقہ ہوا ہے عام کہاں

۹۳ ۱۰

نظر کو جلوۂ جرأت شکن کی تاب نہیں
یہ خیریت ہے کہ حسن انکا بے حجاب نہیں

کچھ اور چیز ہے یہ خورشید و ماہتاب نہیں
کبھی عتاب انھیں ہے کبھی عتاب نہیں

نگاہِ حسن نہیں، اضطراب پر میرے
جو ہونا چاہیے شاید وہ اضطراب نہیں

میں اور پینے سے ہو جاؤں مست کش توبہ
صدا نہ آئے یہ جبتک کہ اب شراب نہیں

نگاہِ مست کے صدقے، یونہی رہے تا دیر
خراب حالِ محبت، ابھی خراب نہیں

قفس کی زندگیِ غم، ارے معاذ اللہ
عجیب دور ہے یہ جسمیں انقلاب نہیں

یہ فصلِ گل، یہ نشاط و بہار کا عالم
نہیں قبول، اگر ساغرِ شراب نہیں

نماز روزے کا منکر نہیں ہوں میں زاہد
مگر یہ مشغلہ عالمِ شباب نہیں

عنایتوں کی کوئی اُن سے کیا امید کرے
عتاب جنکے یہاں داخلِ عتاب نہیں

سلامت اُنکا تصور، سلامت اُنکا خیال
یہ مستیاں مری منت کشِ شراب نہیں

طلوعِ صبح کی اُمید کیا کروں اے دل
شبِ فراق کی قسمت میں آفتاب نہیں

نہیں ہے شرم گناہوں سے کچھ مجھے ایسی
ہے شرم یہ کہ ندامت سے آب آب نہیں

نہ اُنکے سامنے شرمندہ کر مجھے اے درد
یہ کیا کہ ہاتھ وہ رکھیں تو اضطراب نہیں

ہیں صبح و شام اُسی ایک رُخ کے دو جلوے
کبھی نقاب ہی مُنہ پر، کبھی نقاب نہیں

میں اس سکون کی کیوں شامِ غم دعا مانگوں
اگر سکون وہی ہے جو اضطراب نہیں

ہماری بادہ کشی ٹلتی آرہی ہے یونہی
کبھی بہار نہیں ہے، کبھی شراب نہیں

جدھر خطاب کریں گے اُدھر نہ دیکھیں گے
جدھر نگاہ کرینگے، اُدھر خطاب نہیں

ہزار آتے رہیں انقلاب کیا حاصل
جو اُنکا دل نہ بدل دے وہ انقلاب نہیں

کریں خرابیٔ عالم کا کیا گلہ نشترؔ
جو ہم خراب نہیں ہیں کوئی خراب نہیں

۹۴ ۱۹

حیاتِ دہر ہے بے کیف اگر شباب نہیں
اگر شراب میں مستی نہیں، شراب نہیں

کوئی سکون کو روتا ہے اور مجھے یہ گلہ
مری سکون کی دُنیا میں اضطراب نہیں

سکونِ وصل سے دل سرد ہو گیا ہے مرا
تھی جس سے روح میں گرمی وہ اضطراب نہیں

بغیرِ وجہ نہیں ہے یہ خامشی اُن کی
مرے سوال کا شاید کوئی جواب نہیں

ازل کے روز کو دیکھو اور آج کو دیکھو
تلاشِ یار میں اب تک میں کامیاب نہیں

مجھے شراب سے توبہ میں عذر کیا واعظ
یہ چیز میرے لئے مانعِ شراب نہیں

میں اضطراب کا خوگر ہوں، یہ سمجھتا ہوں
جو دلمیں تیرے نہ میرے وہ اضطراب نہیں

جو آنے جانے لگے ہیں وہ خواب میں اکثر
تو سیر کیجئے آنکھوں میں میری خواب نہیں

تمہارے دورِ جدائی سے بھی خدا سمجھے
عجیب دور ہے یہ جسمیں انقلاب نہیں

ستم ہزار کرے چرخ، ظلم لاکھ کرے
تمہارے ظلم و ستم کا کوئی جواب نہیں

کبھی مرے دلِ مضطر کا حال دیکھ اے برق
یہ اضطراب ترا کچھ بھی اضطراب نہیں

مرے سوالِ محبت پہ یہ تبسمِ ناز
جواب وہ ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں

سوالِ حشر میں انکی طرف سے ہیں لاکھوں
ہمارے پاس کسی بات کا جواب نہیں

بتائیں کیا تمھیں ہم تیرگیٔ شامِ فراق
یہ ہے وہ رات جہاں ذکرِ ماہتاب نہیں

زمانہ خواب ہے، اور خواب اسکی باتیں ہیں
دکھائی دیتی ہیں ایسی کہ جیسے خواب نہیں

خدا سے رکھتی ہے انساں کو کامیابی دور
وہ کامیاب ہے نشتر جو کامیاب نہیں

۹۵ ۱۶

رکھ دیا یاروں نے گورستان میں
اب کہیں جان آئی نشتر جان میں

جلوہ گر ہو، گر نہ تو انسان میں
فرق کیا انسان اور حیوان میں

بادہ نوشی کفر ہو جائے نہ ہو
اب تو داخل ہے مرے ایمان میں

کر دیا کیا دل کو تو نے سوزِ غم
اب تو یہ آتا نہیں پہچان میں

عرصۂ محشر میں ہے چھپنا فضول — آؤ دو باتیں کرو میدان میں
چپکے چپکے چھپ کے واعظ خوب پی — آ بھی جا اب ایک دن میدان میں
مذہبِ انساں ہے صرف انسانیت — کیا رکھا ہے کفر اور ایمان میں
اہلِ دُنیا چپ رہیں سُننے بھی دیں — ایک آواز آ رہی ہے کان میں
جن پہ دُنیا بھر کی موسیقی نثار — وہ صدائیں آ رہی ہیں کان میں
وائے عبرت کیسے کیسے تاجدار — سو رہے ہیں آج گورستان میں
عزم سے اور حوصلے سے کام لے — عالمِ امکاں ہے سب امکان میں
مانئے تو ہے اسی میں کائنات — دیکھئے تو کچھ نہیں انسان میں
خواب میں آنا بھی آتا ہے کوئی — یہ کوئی احسان ہے احسان میں
کر گئی یہ کیا کسی کی چشمِ مست — ہو گیا یا رب یہ کیا ایک آن میں
عشق نے دردِ مجسم کر دیا — درد ہے دل میں جگر میں جان میں
آدمیت کو ہیں سب بھولے ہوئے — آدمیت کیوں نہیں انسان میں
ہے ترا ارمان اس دُنیا کی جان — ساری دُنیا ہے ترے ارمان میں
رات دن اب یہ سماں ہے سامنے — جیسے تم کچھ کہہ رہے ہو کان میں

ہے نہ سُننے والے کا نشتر قصور
دل کی آواز آ رہی ہے کان میں

٩٦ — ١٩

پھر اچھے دن خدا کے فضل سے گلشن کے آتے ہیں — گھٹائیں جھوم کر اُٹھی ہیں، دن ساون کے آتے ہیں

ہمارے دل میں جلوے جو رخِ روشن کے آتے ہیں
خیالوں میں چلا پا کر، نظر میں چھن کے آتے ہیں

گذاریں زندگی قیدِ قفس میں کس طرح اپنی
تصوّر اب بھی اُٹھتے بیٹھتے گلشن کے آتے ہیں

ٹھہر اے داورِ محشر ذرا ہم سانس تو لے لیں
ابھی تو حشر میں ہارے تھکے مدفن کے آتے ہیں

قریبِ باغ ہے اپنا قفس یہ بھی غنیمت ہے
نہیں گلشن، تو جھونکے نکہتِ گلشن کے آتے ہیں

کوئی کیسے انھیں جانے، کوئی کس طرح پہچانے
کبھی کچھ بن کے آتے ہیں کبھی کچھ بن کے آتے ہیں

نہیں ملتا نکلنے کو انھیں جب راستہ کوئی
مرے ارمان باہر دل سے آنسو بن کے آتے ہیں

ہرے ہوتے ہیں پھر سوکھے ہوئے زخمِ جگر میرے
قیامت سر پہ آتی ہے کہ دن ساون کے آتے ہیں

تہریکِ حالِ انساں چاہیے چشمِ کرم اُسکی
وہ ہو کر دوست جاتے ہیں، جو دشمن بن کے آتے ہیں

یہاں بھی جوشِ وحشت اب ہمیں شاید رہنے دے
نظر صحرا میں بھی آثار کچھ گلشن کے آتے ہیں

مچل جاتے ہیں جب انکار دل دینے سے کرتا ہوں
جوانی میں بھی یاد انداز اُنھیں بچپن کے آتے ہیں

خدا شاہد ہے پس جاتے ہیں ہم احسان سے اُن کے
کبھی وہ بھولے بھٹکے پاس اگر مدفن کے آتے ہیں

الٰہی خیر ہو میرے دلِ مشتاقِ جلوہ کی
سُنا ہے پھر وہ بزمِ ناز میں بن ٹھن کے آتے ہیں

نظر اُنکی بظاہر کس قدر معصوم و سادہ ہے
مگر ظالم کو سارے ہتھکنڈے رہزن کے آتے ہیں

کریں جس کام کی ہمت وہ پورا کیوں نہ ہو نشترؔ
۹۶ ہمارے ہی ارادے تو مقدر بن کے آتے ہیں 15

باغ رکھیں کہ دلِ زار کو صحرا کر دیں
جو سمجھتے ہوں مرے حق میں وہ اچھا کر دیں

ظلم سے باز نہ آئیں تو وہ اتنا کر دیں
بہ تصرف مرا پتھر کا کلیجا کر دیں

کیوں نہ ہم جان، نثارِ رُخِ زیبا کردیں
ہو چکا کھیل، بس اب ختم تماشا کردیں

فیصلہ جو انھیں کرنا ہو وفا کا کردیں
کم نہ ہوتی ہوں جفائیں، تو زیادہ کردیں

وصل اور ہجر کے بازیچوں سے ہم باز آئے
آپ دُنیا کو ہمارے لئے دنیا کردیں

ضبط نے حشر میں بھی خوب سنبھالا ہم کو
ورنہ ہم آپ سے مجبور کہ دعویٰ کردیں

نہ ہو پوری، تو تمنا کا تسلسل ہے فضول
جی میں آتا ہے کہ اب ترک تمنا کردیں

روک لے ضبط، جو ممکن ہو، یہ آنسو میرے
کہیں ایسا نہ ہو ظالم مجھے رسوا کردیں

راہ لیں اپنی غمِ ہجر و تمنائے وصال
جیسی دُنیا تھی مری، پھر وہی دُنیا کردیں

کاوشِ ضبط کی آخر یہ کشاکش کبتک؟
جی میں آتا ہے کہ اب عرضِ تمنا کردیں

ہم سے پوچھے نہ کوئی دردِ محبت کی حدیں
ساری دُنیا کو کہو درد کی دُنیا کردیں

کیسی کیسی چلی آتی ہیں گھٹائیں گھنگھور
کہئے کس طرح نہ قربانئ تقویٰ کردیں

محفلِ وعظ نہیں یہ کہ جہاں جی نہ لگے
بزمِ ساقی میں تو ہم روز سویرا کردیں

حضرتِ دل بھی عجب چیز ہیں ماشا اللہ
دفعتاً چاہیں تو گلزار کو صحرا کردیں

آرزوؤں کو اکٹھا نہ کر اتنا دل میں
ہیر از مہ جو کبھی حشر نہ برپا کردیں

عشق کی بے سر و سامانیاں اللہ اللہ
لوگ قربان نہ کیوں دولتِ دنیا کردیں

ہو فرشتوں سے بھی انسان کہیں بڑھ چڑھ کر
خواہشیں اسکی اگر اس کو نہ اندھا کردیں

ظرف بھی دیکھ لیں، ورنہ رنگ بھی میخوشوں کا
کہیں واعظ، تو ہم اک دعوتِ صہبا کردیں

جو پذیرائے کرم ہوں وہ کہاں ہیں آنسو
یوں کہو ورنہ رواں آنکھ سے دریا کردیں

بات یہ ہے کہ ترے غم کا ابھی لُطف نہیں — ورنہ دوری کی یہ خوشیاں مجھے اندوہ کردیں
متضاد اُنکی نگاہوں میں عجب ہے تاثیر — خود ہی بیمار کریں خود ہی مدا وا کردیں
چارہ گر شوق سے آئیں مرے سر آنکھوں پر — ہاں! اگر درد مرا اور زیادا کردیں
اُن سے کہدو جو کئے ہیں تو کئے جائیں ستم — بے محل ہی نہ کہیں ختم تماشا کردیں
روز یا یوسیاں رہتی ہیں، مجھے ڈر یہ ہے — کہیں پھیکا نہ مرا رنگِ تمنا کردیں
جان دیدینگے، مگر اُف نہ کرینگے نشتر
ہم بھلا اور غمِ عشق کو رسوا کردیں

۹۸ ۲۵

ہنگامہ جہاں میں سکون و اماں کہاں — جس چیز کی تلاش مجھے ہے یہاں کہاں
ہم آج تو پہونچ ہی گئے اُنکی بزم میں — دربان تکتے رہ گئے "ہاں ہاں" "کہاں کہاں"!
جُھک جائیگی جبینِ نیاز اپنی خود بخود — کیوں پوچھتے پھریں، ہے ترا آستاں کہاں
آنے میں اتنی دیر لگانی نہ تھی تمہیں — پہونچا مرا خیال نہ جانے کہاں کہاں
اک عمر ہوگئی کہ اسیرِ قفس ہیں ہم — اب ہمکو امتیازِ بہار و خزاں کہاں
اُن کے فراق نے مری دنیا ہی لُوٹ لی — اب وہ زمیں کہاں وہ مرا آسماں کہاں
پھر خدا کیواسطے نزدیک و دُور کیا — ہوتا ہے آشیانہ کہاں بجلیاں کہاں
قیدِ تعلقات ہے دُنیا میں وجہِ غم — گر آشیاں نہ ہو تو غمِ آشیاں کہاں
ہم نے تو دل کا حال کہا تھا بطورِ راز — کِس کِس سے تمنے کہدیا جانے کہاں کہاں
خاموش ہیں جو ہم تو یہ سمجھو کہ جبر ہے — یعنی ہمیں اجازتِ آہ و فغاں کہاں

کعبے نہیں گئے کہ کلیسا نہیں گئے
ڈھونڈا ہے ہم نے تجھکو نہ جانے کہاں کہاں
آخر جنونِ عشق نے آزاد کر دیا
اب عقل اور خرد کی وہ پابندیاں کہاں
دل لیکے کل وہ دشمنِ جاں ہوگیا وداع
ہم کہتے رہ گئے ارے ظالم کہاں کہاں
گویا ہمارا حق ہی نہیں میکدے پہ کچھ
ہر شخص کہہ رہا ہے کہ نشتر یہاں کہاں!

۹۹ ۱۴

اسکے کہنے کے لئے جبتک زباں دل نہیں
داستاں دل ہو لیکن داستانِ دل نہیں
جو نہ چپ کر دے زمانے کو، زبانِ دل نہیں
جس سے تاثیر نہ ٹپکیں، وہ فغانِ دل نہیں
جب سے اے رشکِ قمر تو میہمانِ دل نہیں
چاند تاروں سے منور آسمانِ دل نہیں
تو اگر بد قسمتی سے، باغبانِ دل نہیں
گلستاں کہنے کے قابل، گلستانِ دل نہیں
اسطرح ہنس ہنس کے سنتے آپ، توبہ کیجئے
داستانِ قیس مری داستانِ دل نہیں
داستانِ دل کوئی اس بیوفا سے کیا کہے
جو نہ سنے اسطرح، جیسے داستانِ دل نہیں
آرزوئیں گر نہ ہوتیں، زندگی بے کیف تھی
کون ہے وہ آرزو، جو آج جانِ دل نہیں
امتحانِ دل کہیں اسطرح لیتا ہے کوئی
موت کہتے ہیں اسے یہ امتحانِ دل نہیں
چارہ گر درمانِ دردِ دل کروں کیونکر قبول
جان ہے میری، مرادردِ نہانِ دل نہیں
کر دیا کیا تو نے اے دردِ نہانِ دل اسے
تھا جہانِ دل، اب ہاں نام و نشانِ دل نہیں
نغمۂ ساز، اور مطرب کی صدائیں سوز کیا
وہ زبانِ دل نہیں ہے، یہ فغانِ دل نہیں
مٹ چکا جب دل تو آئے ہو تسلی کے لئے
دل کا تو اب ذکر کیا، نام و نشانِ دل نہیں

رہ سکے جس میں نہ اندوہِ خزاں، کیفِ بہار / اس قدر بھی تنگ میرا گلستانِ دل نہیں
ہاتھ رکھتا ہی کہاں اے چارہ گر بہرِ علاج / مدتیں گذریں کہ اب نام و نشانِ دل نہیں
جمع کر لینے دو سب ٹکڑے دلِ صد پارہ کے / ہم سے ممکن یوں تو شرحِ داستانِ دل نہیں
یاسِ پیہم اور غم کی چیرہ دستی دیکھیے / ہے بظاہر دل وہی لیکن وہ شانِ دل نہیں
دل جسے کہتے ہیں وہ دل تو خزاں پروردہ ہے / جو خزاں میں ہو فسردہ، گلستانِ دل نہیں
ہے ہماری داستانِ عشق، وجہِ انقلاب / داستاں کہنے کو قابو میں زبانِ دل نہیں
توڑ کر دل، دفعتاً اُٹھتے ہو پہلو سے مرے / اور کیا ہے یہ جو مرگِ ناگہانِ دل نہیں
کون کہتا ہے جہانِ عشق میں عنقا ہے دل / دل تو ہے موجود، لیکن قدردانِ دل نہیں
۱۰۰ جس کو سُن کر سُننے والے دل نہ اپنا تھام لیں / اور وہ جو کچھ ہو نشتر داستانِ دل نہیں ۳۱

آپ تو میری جان لیتے ہیں / یوں کہیں امتحان لیتے ہیں!
ہم جو توبہ کی ٹھان لیتے ہیں / یاد دل آ آ کے جان لیتے ہیں
اور ہم سے جنوں میں کیا ہوتا / خاکِ صحرا کی چھان لیتے ہیں
سوچتے ہیں ہاں دیں کہ نہ دیں / وہ ہماری زبان لیتے ہیں
ہے جفا بھی ستم، وفا بھی ستم / ہر طرح میری جان لیتے ہیں
نزع میں ہے گریز آنے سے / آخری امتحان لیتے ہیں
عشق والے کبھی نہیں مرتے / موت کو زیست مان لیتے ہیں

کیسے شکوے شکایتیں اے دل — وہ ترا امتحان لیتے ہیں
ہے جو نالوں کا کچھ فزوں تر رنگ — ایک دن آسمان لیتے ہیں
ضد حسینوں کی ہے سرشت مگر — کبھی کہنا بھی مان لیتے ہیں
بڑھکے آگے، کرینگے کیا نالے — جب ابھی آسمان لیتے ہیں
کاش ہو جائیں، نذرِ مایوسی — حوصلے اور جان لیتے ہیں
میں تو یہ جانتا ہوں، شادی و غم — سب مرا امتحان لیتے ہیں
آسماں کچھ پرے سرک جائے — گاتے گاتے، وہ تان لیتے ہیں
دل آج یورش ہے یاس و حسرت کی — سب تمھارا امکان لیتے ہیں
کس کو ملتی ہے منزلِ مقصود — خاک رستے کی چھان لیتے ہیں
جب سماتا نہیں ہے غم دلمیں — اور کچھ کھینچ تان لیتے ہیں

کیوں نہ ہنس ہنس کے جان دیں نشتر
جب وہ ہنس ہنس کے جان لیتے ہیں

۱۰۱ ۱۷

دیکھکر تجھ کو کسی اور کو اب کیا دیکھوں — جب نظر آنکھ اُٹھاؤں، ترا جلوا دیکھوں
کیوں ہوس دیتی ہے ترغیب، کہ دُنیا دیکھوں — دیکھنے کی جو نہیں چیز، اُسے کیا دیکھوں
نہ نکل جاؤں خزاں میں، تو کروں کیا آخر — کس طرح آنکھ سے گلزار کو صحرا دیکھوں
جس کے ملنے کے لئے چھوڑ دیا دُنیا کو — وہ بھی ملتا ہے کہ مجھکو نہیں ملتا، دیکھوں
اب تو وہ درد عطا کر، مرے دلکو یارب — جب نظر آنکھ اُٹھے، درد کی دُنیا دیکھوں

کیا اسی دن کے لئے، مجھ کو تمنّا دی تھی؟
آنکھ سے ہوتے ہوئے خونِ تمنّا دیکھوں

بھولتا ہے، نہ کبھی بھول سکیگا، بیدرد
دردِ دل سُنکے ہمارا، ترا کہنا دیکھوں

کیا کیا تو نے دکھا کر مجھے جلوہ اپنا
جی نہیں چاہتا اب جانبِ دُنیا دیکھوں

دین کا تُو نے نہ رکھا، نہ مجھے دُنیا کا
مُنہ ترا کاش نہ اے خواہشِ دُنیا دیکھوں

کان اور آنکھ دئیے ہیں تو یہ توفیق بھی دے
تیری آواز سنوں، اور ترا جلوہ دیکھوں

آرزوؤں نے کہیں کا بھی نہ رکھا مجھکو
اب کہاں تاب کہ انجامِ تمنّا دیکھوں

دل میں جب مجھ کو میسّر ہے کسی کا جلوہ
کعبہ کیوں جاؤں میں کیوں دیر و کلیسا دیکھوں

لُطفِ پستی کا بلندی میں کہاں ہے نشتر
۱۰۲ کیوں بلندی کی ہوس کر کے میں نیچا دیکھوں ۱۳

ستانے کو اے آسماں اور بھی ہیں
ہمیں تو نہیں ہیں جواں اور بھی ہیں

مٹائے ہوئے قلب و جاں اور بھی ہیں
مری طرح محوِ فغاں اور بھی ہیں

ہمیں ایک شاکی نہیں ہیں تمہارے
ہمارے کئی ہمزباں اور بھی ہیں

ہمیں کیوں نکلجائیں گلشن سے تنہا
چمن میں ترے باغباں اور بھی ہیں

نہیں آسماں، آسماں مجھ کو تنہا
مری جان کو آسماں اور بھی ہیں

ہمیں آپ کیوں انجمن سے نکالیں
وہاں ایک ہم ہی، جہاں اور بھی ہیں

قسم تم کو جور و ستم کی، بتادو
ہماری طرح بے زباں اور بھی ہیں؟

جو وہ دے رہے ہیں تسلّی تشفّی
تو کمبخت آنسو رواں اور بھی ہیں

مرے آشیاں ہی سے بجلی کو ضد ہے — کہوں کس طرح آشیاں اور بھی ہیں
جو اک آسماں آہ ڈھا دے، نتیجہ؟ — سُنا ہے کئی آسماں اور بھی ہیں
تری چتونیں ہی نہیں صرف قاتل — ادائیں کئی دلستاں اور بھی ہیں
جو کی بدگمانی مٹانے کی کوشش — تو کچھ دن سے وہ بدگماں اور بھی ہیں
خودی ہی نہیں مجھ میں اور تجھ میں حائل — حجابات کچھ درمیاں اور بھی ہیں
سرِ طور پھر ایک بار اپنا جلوہ — حریفِ کلیم اب یہاں اور بھی ہیں
نہیں برق تنہا، میں کس کس کو رووں — مرے دشمنِ آشیاں اور بھی ہیں
خدا جانے کیا ظلم ہوں اور آگے — ابھی تو کئی آسماں اور بھی ہیں
مرے دل میں ہے حسرتوں کی کمی کیا — ابھی ولولے باقی ہیں ہاں اور بھی ہیں
ہے وابستگی اپنی صرف ایک گل سے — ہمیں کیا اگر گلستاں اور بھی ہیں
ہمارا فسانہ بھی گڑھ لیگی دُنیا — ہزاروں فسانے جہاں اور بھی ہیں
فغاں کا نتیجہ جو دیکھے ہوئے ہیں — تو ہم بے نیازِ فغاں اور بھی ہیں
ہمیں کیا خبر تھی وفا کے علاوہ — محبت میں پابندیاں اور بھی ہیں
نہیں ہیں ہمیں خوابِ غفلت میں تنہا — یہاں محوِ خوابِ گراں اور بھی ہیں

نہ سمجھو کہ مرتے ہی چھٹی ہے نشتر
ابھی تو کئی امتحاں اور بھی ہیں

۱۰۳ ۲۳

ظلم میں تیرے اب انداز نہیں ہوتے ہیں — یہ ستم عشق میں برداشت کہیں ہوتے ہیں

غیر ہمدم کبھی بھولے سے نہیں ہوتے ہیں
کام آتے ہیں جو تیرے وہ ہمیں ہوتے ہیں

جانے کس قسم کے ظالم یہ حسیں ہوتے ہیں
نہیں ہوتے جو کسی کے تو نہیں ہوتے ہیں

اپنے مطلب سے خبردار، حسیں ہوتے ہیں
جتنے معصوم یہ بنتے ہیں، نہیں ہوتے ہیں

کون کہتا ہے وفادار حسیں ہوتے ہیں
یہ بھی ہوتا ہے جو دو ایک کہیں ہوتے ہیں

دیکھئے مجھ کو کسی روز اگر ممکن ہو
آپ جس وقت مرے پاس نہیں ہوتے ہیں

عشق صادق جسے ہوتا ہے سمجھتا ہے وہی
ظلم، در اصل ترے ظلم نہیں ہوتے ہیں

سوچ اے عہدِ شکن، ایک دن اپنے دل میں
توڑنے کے لئے اقرار نہیں ہوتے ہیں

عشق والوں کو غمِ عشق بھی اک نعمت ہے
رنج و غم سہتے ہیں مغموم نہیں ہوتے ہیں

نسبتاً زیرِ زمیں کچھ تو ہے آرام ضرور
جان سب دیکھے جو پیوندِ زمیں ہوتے ہیں

رات دن یا کبھی ہم اور درِ میخانہ تھا
اب تو جانے کے ارادے بھی نہیں ہوتے ہیں

جو مزے تیری جفاؤں میں ملے ہیں دل کو
وہ مزے تیری وفاؤں میں نہیں ہوتے ہیں

جو نکلتے نہیں ارمان محبت میں کبھی
اور کچھ ہوتے ہیں، ارماں نہیں ہوتے ہیں

ہو گئے ہیں جنھیں سجدوں کے طریقے معلوم
اور اُن لوگوں کے اندازِ جبیں ہوتے ہیں

بعد مرنے کے نہ دوزخ ہے نہ جنت ہے کہیں
میرے نزدیک تو یہ دونوں یہیں ہوتے ہیں

جن کی ممنون کبھی میری جبیں ہوتی تھی
اب وہ سجدے مرے ممنونِ جبیں ہوتے ہیں

موسمِ گل کی خطا ہے کہ نہ جانے اپنی
ہم بہاروں میں بھی دیوانے نہیں ہوتے ہیں

وہ جو ہمدرد نہیں ہیں، تو تعجب کیا ہے
ہیں جو بیدرد وہ ہمدرد کہیں ہوتے ہیں

ہوش لے لیتے ہیں آتے ہی ہمارے نشتر — جبتک آپے میں ہم آئیں وہ نہیں ہوتے ہیں

زلزلے اِس کے سوا اور نہیں کچھ نشتر

۱۰۳ بیقرار اہلِ زمیں، زیرِ زمیں ہوتے ہیں ۲۰

غمِ عشق میں مبتلا جا رہا ہوں — بتائے کوئی کیا بُرا جا رہا ہوں
میں بے عزم و بے مدعا جا رہا ہوں — جدھر دل میں آئی چلا جا رہا ہوں
مجھے کیا، کیے جائیں وہ جور پیہم — کہ میں محوِ راہِ وفا جا رہا ہوں
سمجھتا یہ ہوں، زندگی بڑھ رہی ہے — حقیقت میں سوئے فنا جا رہا ہوں
کبھی تو مرے حال پر بھی نوازش — تری بزم میں کب سے آ جا رہا ہوں
محبت کا رستہ بھی کیا بے خطر ہے — نہ ساتھی نہ رہبر، چلا جا رہا ہوں
بتایا ہے جو راستہ میرے دل نے — اُسی راستے پر چلا جا رہا ہوں
رہِ رسمِ منزل سے واقف نہیں ہوں — قدم اُٹھ رہے ہیں، چلا جا رہا ہوں
نہ عقبیٰ میں رہنا نہ دُنیا میں رہنا — اسی طرح مدت سے آ جا رہا ہوں
یہ کیا کر دیا اے نگاہِ حقیقت — میں نظروں سے اپنی گرا جا رہا ہوں
حقیقت سمجھتا ہوں میں زندگی کی — مگر پھر بھی اِس پر مرا جا رہا ہوں
گرفتارِ موجِ ہوا ہو گیا ہوں — جدھر بہہ رہا ہوں بہا جا رہا ہوں
کبھی مل ہی جائیگی منزل مجھے بھی — خدا پر نظر ہے، چلا جا رہا ہوں

پھر اُس بزم میں آج تنگ آ کے دل سے

۱۰۵ بُرا ہو کہ نشتر بھلا، جا رہا ہوں ۱۴

راتدن سر پہ محبت میں بلائیں آئیں
ہمنے ہر چند یہ چاہا کہ نہ آئیں، آئیں

لاکھ پہلو سے محبت میں بلائیں آئیں
ہم نے دائیں سے ہٹایا بھی تو بائیں آئیں

راس آئیں نہ دوائیں نہ دعائیں آئیں
کام اگر عشق میں آئیں تو وفائیں آئیں

نئے انداز سے کیوں آج ہوائیں آئیں
لیکے شاید رُخِ زیبا کی بلائیں آئیں

کچھ تعلق ہے جوانی کو جفاؤں سے ضرور
یہ جہاں آئی حسینوں کو جفائیں آئیں

جان دینے کی جو ٹھہرائی ترے عاشق نے
خُلد سے لینے کو معصوم ہوائیں آئیں

سچ کہا ہے کہ مصیبت نہیں تنہا آتی
اک بلا آئی جہاں، لاکھ بلائیں آئیں

مترادف ہیں بلا اور محبت شاید
دل کسی پر کہیں آیا کہ بلائیں آئیں

ان حسینوں کی جفاؤں میں تو یہ لذت ہے
مارے ہی ڈالیں گے اِنکو جو وفائیں آئیں

نہ سُنیں غور سے نادان نے آخر نہ سُنیں
عمر بھر کان میں ناصح کی صدائیں آئیں

ہم کو راحت نہ محبت میں میسر آئی
آئیں خوشیاں بھی تو بن بن کے بلائیں آئیں

چھوڑ دینے پہ مگر آج ہے مائل صیاد
وہ مرے لینے کو گلشن سے ہوائیں آئیں

ایسی خوشیوں کو کہو لیکے کرے کیا کوئی
پیٹھ پھیری نہ اِنھوں نے کہ بلائیں آئیں

شکوہ یہ ہے کہ سلیقے کی کوئی بات نہیں
نہ جفائیں تمھیں آئیں نہ وفائیں آئیں

عشق میں پڑ کے بلاؤں سے نہ گھبرا اے دل
تو نے خود ہی تو یہ چاہا تھا کہ آئیں آئیں

کِس زباں سے ہو ادا شکرِ یہ رحمتِ حق
کسی گنتی میں ہماری نہ خطائیں آئیں

پاکبازوں سے مخاطب ہوئی رحمتِ حق — کام گر حشر میں آئیں تو خطائیں آئیں

کتنے ہی ظلم کسی شوخ ستمگر نے کیے — جب زباں پر مرے آئیں تو دعائیں آئیں

مہرباں ہو کے نہ جانے وہ ستم کیا کرتے — یہ بھی اچھا ہوا اُن کو نہ وفائیں آئیں

اُنکو آتی ہیں وفائیں تو ابھی آجائیں — فائدہ کیا جو مرے بعد وفائیں آئیں

ہجر میں شور یہ کیا ہے کہ اُٹھی ہیں یا دل — لیجئے اور یہ بے وقت بلائیں آئیں

ایک دن بھی ہوئے نادم نہ خطائیں کر کے — ہمکو کرنی ہی نہ در اصل خطائیں آئیں

خلق عاجز ہے جفاؤں سے، مجھے شکوہ ہے — کیوں گھٹتے ہیں مرے اور جفائیں آئیں

میری تقدیر کہاں اور کہاں رحمتِ حق — وہ تو آڑے مرے محشر میں خطائیں آئیں

فیضِ میخانہ فراموش نہ ہوگا دل سے — ہاتھ میں جام لیا تھا کہ گھٹائیں آئیں

ہمکو یکسوئی سے وہ خوش نہیں رہنے دیتے — برق بھی ساتھ ہی آئی جو گھٹائیں آئیں

پھر کہاں رہتی ہے تاریکیٔ ناامیدی — دل میں اُمید کی جو وقت ضیائیں آئیں

۱۰۶ وائے بر حالِ مریضِ غمِ فرقت نشتر ۲۸

در پہ وہ آئے کہ ماتم کی صدائیں آئیں

میں کہاں محفلِ جمال کہاں — لیجا مجھ کو اے خیال کہاں

ایک دن مجھ کو ایک سال کہاں — زندگانی ابھی وبال کہاں

بیخودی کو مری، خدا رکھے — ہجر اور وصل کا سوال کہاں

حدِ عشق و وفا سے آگے ہوں — وہ سرا امیرا خیال کہاں

کچھ خبر بھی ہے تجھکو اے غافل
جا رہے ہیں ماہ و سال کہاں؟

ہو اگر میرا ظرفِ دل نہ وسیع
جائیں رنج و غم و ملال کہاں

میں ہوں اور رات دن تصورِ یار
کون ہوں، کیا ہوں، یہ خیال کہاں

لذتِ انتظار، ارے توبہ!
میری تقدیر میں وصال کہاں

چارہ گر تو بھی کر لے اپنی سی
ورنہ زخموں کا اندمال کہاں

تو کہاں اور کہاں مہِ کامل
عکس کا بھی ہے احتمال کہاں

کاش ملتے تو ملکے رو لیتا
عمرِ فانی کے ماہ و سال کہاں

وہ ہوں مہمانِ خواب، ناممکن
ہے پریشاں سرِ خیال کہاں

دیکھیے وہ ملیں کہاں نشتر
عید ہوتی ہے ایک سال کہاں

۱۰۷ ۱۳

اندنوں کم ہے جفائے یار کیوں
حسن کی کمزور ہے رفتار کیوں

ایک پر خوشیوں کی ہے بھرمار کیوں
دوسرے پر رنج کی بوچھار کیوں

کوششیں ساری گئیں بیکار کیوں
پھر گئی ہم سے نگاہِ یار کیوں

پھونکے دیتی ہے تپِ سوزِ فراق
خشک ہے اے چشمِ دریا بار کیوں

دل ہی میں کیوں نہ کرلیں آپ سے بات
دوسرا ہو جائے واقف کار کیوں

پہلے ناشادِ محبت کر دیا
پوچھتے ہیں اب کہ ہو بیزار کیوں

جب ستم کی لذتیں اس میں نہیں
پھر تمنائے وفائے یار کیوں

تیری قسمت میں اگر واعظ نہیں — ترکِ مے پر مجھ سے ہی اصرار کیوں
خواب میں تھی اُن سے کیا کیا گفتگو — ہو گئے ایسے میں ہم بیدار کیوں
آج میخانے میں کیا ساقی نہیں — مضمحل بیٹھے ہیں بادہ خوار کیوں
جب نہ دی تھی تابِ نظّارہ مجھے — دل کو دیدی حسرتِ دیدار کیوں
سادگی کیوں وجہِ قتلِ عام ہے — سب مرے جاتے ہیں بے تلوار کیوں
آبھی جاؤ دو گھڑی کیواسطے — ہو نہ مجھ کو آخری دیدار کیوں
کیوں یہ آخر سردِ بازاریِ عشق — حُسن کی یہ گرمیٔ بازار کیوں
عشق کو سُنتے تھے ہم اصلِ حیات — زندگی اپنی ہے پھر دشوار کیوں
ہے یقیناً اُسکے دل میں بھی لگاؤ — ورنہ یہ ہر دم خیالِ یار کیوں
بانٹ سکتا ہی نہیں ہے جب کوئی — درد کا اپنے کریں اظہار کیوں
لذّت اندوزِ جفائے یار ہوں — ہو تمنّائے وفائے یار کیوں
عشق ہی جب منزلِ مقصود ہے — راستہ اسکا ہے ناہموار کیوں
حاضر و ناظر ہے تُو جب ہر جگہ — ہو ہراساں طالبِ دیدار کیوں
کچھ نہیں کُھلتا کہ جاتے ہی ترے — رونے لگتے ہیں در و دیوار کیوں
کیوں نہ کرلیں دل کے ہر ذرّے کو طور — طور پر ڈھونڈیں جمالِ یار کیوں

عشق اگر تم کو نہیں نشتر تو پھر
قلبِ زار و دیدۂ خونبار کیوں

نہیں ہے کم نگہی قہر، یا نگاہ نہیں
ادا ہے کونسی تیری جو بے پناہ نہیں

نگاہ تو ہے مگر وسعتِ نگاہ نہیں
تمھارے پاس پہونچنے کی کوئی راہ نہیں

کسی کے آہ ہے لب پر کسی کے آہ نہیں
مگر ہے کون جو حسرت کشِ نگاہ نہیں

بہت وسیع نگاہیں ہوئیں محبت میں
جہاں یقین نہیں تھا، اب اشتباہ نہیں

ذرا میں خوش ہے تو ظالم ذرا میں ہے ناراض
ابھی نگاہ ہے مجھپر، ابھی نگاہ نہیں

دلوں کو دیکھے تمنائے دیدِ بے پایاں
وہاں مقیم ہے ظالم جہاں نگاہ نہیں

نگاہ بند کرو اور دیکھ لو اُس کو
مذاقِ دید میں پابندیٔ نگاہ نہیں

جمالِ یار سے محرومیوں کا شکوہ کیا
مری نگاہ ہی شاید ابھی نگاہ نہیں

مرے غم اور مسرت کا فلسفہ یہ ہے
کبھی نگاہ ہے اُسکی کبھی نگاہ نہیں

عجیب حال محبت میں ہے نگاہ کا بھی
کبھی نگاہ ہے سب کچھ کبھی نگاہ نہیں

تمام بزم ہے کیفِ نگاہ سے سرخوش
وہ ایک ہم ہیں کہ ہم پر تری نگاہ نہیں

گناہگار نہ کھائے فریبِ تنہائی
وہ کون فعل ہے جسکا خدا گواہ نہیں

چلا ہوں رحمتِ خالق کا مستحق ہو کر
یہ فخر کیا مجھے کم ہے کہ بے گناہ نہیں

اگر گناہ پہ رحمت خدا کی ہے موقوف
تو مغفرت ہے اُسی کی جو بیگناہ نہیں

گناہگار ہوں اور اعتراف کرتا ہوں
ہزار شکر میں شرمندۂ گناہ نہیں

نہ انتہائے کرم ہے، نہ انتہائے ستم
اتھاہ دونوں ہیں یعنی کسی کی تھاہ نہیں

نہیں ہے مجھ کو ستائش سے کچھ غرض نشتر

۱۰۹ نہ ہو کلام پہ میرے جو واہ واہ نہیں ۱۷

بنانا تھا اگر زنداں مرا وسطِ گلستاں میں
بھڑکتے تھے ضروری ہر طرف دیوارِ زنداں میں

لحاظ اسکا بھی رہنا چاہیے صیّاد زنداں میں
تمام قیدی کی ساری عمر گذری ہے گلستاں میں

ضنو بتا کس کو کہتے ہیں، مصیبت کیا ہے زنداں میں
وہ کیا جانیں کہ جنکی عمر گذری ہو گلستاں میں

حقیقت کی نگاہوں سے، اگر دیکھو تو یکساں ہیں
بظاہر فرق کچھ بھی ہو بیاباں میں گلستاں میں

چمن میں پھول جو کھلتے ہیں، انکو دیکھنے والے
کبھی وہ پھول بھی دیکھیں جو کھلتے ہیں بیاباں میں

وہ ہی گلشن، وہ ہی پتے، وہ ہی پھل پھول ہیں یارب
گلستاں کا مزہ پھر کیوں نہیں آتا گلستاں میں

کسی کو ایک مرجھائی ہوئی پتی کے لالے ہیں
بھرا گلشن لیے پھرتا ہے کوئی اپنے داماں میں

کہوں اسکو برا کیونکر، کہوں اس کو بھلا کیونکر
وہ ہی خالق بیاباں میں، وہ ہی خالق گلستاں میں

وہ ہی انسان ہے انساں جسکو لطف آتا ہے
بیاباں کا گلستاں میں، گلستاں کا بیاباں میں

جو ہو امید سے معمور دل، پھر اسکا کیا کہنا
فلک پُر نور ہوتا ہے فروغِ ماہِ تاباں میں

یہاں کیوں امن رہتا ہے، یہاں ملتی ہے کیوں تسکیں
بدل جاتا ہے شاید آسماں گورِ غریباں میں

عزیزا زبس میں قطرے اشک کے، تجھ سے جدا ہو کر
جو گر پڑتے ہیں آنکھوں سے تو رکھ لیتا ہوں داماں میں

کبھی ہیں دل میں امیدیں، کبھی مایوسیاں نشتر
کبھی ہم ہیں گلستاں میں، کبھی ہم ہیں بیاباں میں

۱۱۰ ۱۳

کچھ مری آہ میں اللہ اثر ہے کہ نہیں
کچھ مرے حال کی ظالم کو خبر ہے کہ نہیں

ضو فگن کیفیتِ داغِ جگر ہے کہ نہیں
شامِ غم میں مری، اندازِ سحر ہے کہ نہیں

اُنکی آنکھیں ہیں اُدھر مست، اِدھر دل بیہوش — کِس سے پوچھوں کہ محبت میں اثر ہے کہ نہیں
جگر و درد میں کچھ ربط ہے ایسا، کہ ہمیں — یہ بھی احساس نہیں اب، کہ جگر ہے کہ نہیں
چارہ گر جذبِ جہاں کر کے گئے تھے مرہم — دیکھ لیں آ کے وہیں دردِ جگر ہے کہ نہیں
وہ زباں سے تو بُلاتے ہیں ہمیں محفل میں — یہ خبر کسکو ہے، ایمائے نظر ہے کہ نہیں
خوگرِ دردِ جگر خاک کرے شکوۂ درد — اب احساس کہاں دردِ جگر ہے کہ نہیں
دل محبت میں بہت محو ہوا جاتا ہے — اِسکو انجامِ محبت کی خبر ہے کہ نہیں
ہم نے تا حدِ نظر جلوہ ترا دیکھا ہے — اور گنجائشِ توسیعِ نظر ہے کہ نہیں؟
وعدۂ دید پہ نازاں نہ ہو اُن کے اے دل — پہلے یہ دیکھ کہ تائیدِ نظر ہے کہ نہیں
مجھ سے دُزدیدہ نگاہی تری آخر کب تک — ساری دُنیا تری ممنونِ نظر ہے کہ نہیں
مجھ کو منزل نہ بتا یہ تو بتا دے ظالم — جطرف پانو اُٹھائے ہیں اُدھر ہے کہ نہیں
قصۂ طور کو گذرے ہوئے مدت گذری — کیا خبر اب بھی اُنھیں شوقِ نظر ہے کہ نہیں

پوچھنا رات وہ ساقی کا نہ بھولے گا ہمیں
۱۱۱ دیکھنا نشترِ شوریدہ نظر ہے کہ نہیں ۱۴

تصور میں بلا انگیز ہیں، زنداں کی تصویریں — جدھر ہم آنکھ اُٹھاتے ہیں نظر آتی ہیں زنجیریں
نہیں منظور ہوتا جب تجھے اے صانعِ قدرت — نہ کام آتی ہیں تقدیریں، نہ کام آتی ہیں تدبیریں
اگر ہوتیں نہ امیدیں، تو جینا سخت مشکل تھا — انھیں سے ظلمتِ دل میں نظر آتی ہیں تنویریں
شگونِ نیک سمجھوں، یا کہ فالِ بد اسے سمجھوں — اُترتی جا رہی ہیں پاؤں سے خود آج زنجیریں

کبھی اتنا تو سوچیں منکرانِ ہستیٔ خالق
مصوّر ہو نہ گر کوئی، بنائے کون تصویریں

خدا کی شان، ہے تاریکیوں کو نور سے نسبت
گھٹا اُٹھی جہاں، آئیں نظر بجلی کی تنویریں

نہ جانے رات کیا گذری ترے قیدی پہ اے ظالم
نہ اب آواز آتی ہے، نہ اب بجتی ہیں زنجیریں

خوشی سے ہم اسیری میں نہیں کھوتے ہیں عمر اپنی
کریں کیا پاؤں پڑتی رہتی ہیں دن رات زنجیریں

محبّت کا نہ پوچھو حال، محبّت حد سے بڑھتی ہے
بہت کمبخت کی مضبوط ہو جاتی ہیں زنجیریں

محبّت ساتھ اپنے لے گئی سب لوٹ لے دل کے
نہ وہ اپنی دُعائیں ہیں، نہ اب اُن میں وہ تاثیریں

ہے فطرت جن کی آزادی، کہیں وہ نچلے رہتے ہیں
نہ قیدیں اُن کو قیدیں ہیں، نہ زنجیریں ہیں زنجیریں

ہمارے اُن کے ملنے کی نہیں ممکن کوئی صورت
اُدھر وہ شرم کے پابند، اِدھر پاگیر زنجیریں

فقط احساس ہی میں آدمی محصور رہتا ہے
اسیری ہے اسیری اور نہ زنجیریں ہیں زنجیریں

ذرا دیکھے تو کوئی رُعبِ حسنِ صاحبِ محفل
یہ اہلِ بزم ہیں، یا بزم کی خاموش تصویریں

گرفتارِ ہوس بھی ہے، گرفتارِ تمنّا بھی
ہزاروں طرح کی انساں کو ہیں دُنیا میں زنجیریں

کہاں پھر وہ، کہاں پھر رحمتِ معبود محشر میں
بڑی تقصیر کرتے ہیں، نہیں کرتے جو تقصیریں

گنہگار اپنی نادانی سے گھبرایا کرے، لیکن
یکایک شانِ رحمت سے بدلجاتی ہیں تقصیریں

ہمارے دل سے پوچھے کوئی ہم پر کیا گذرتی ہے
نشیمن میں نظر آتی ہیں جب بجلی کی تنویریں

حسینوں کا بگڑنا، قسمتِ عاشق کا بننا ہے
یہ ظالم تو بگڑ کر بھی بنا دیتے ہیں تقدیریں

نہ جانے کون سا زنداں میں ایسا لطف تھا مجھکو
مری آنکھوں میں پھرتی ہیں ابھی تک میری زنجیریں

دُعا کرتے ہیں اور اُن پر اثر ہوتا نہیں مطلق
دُعاؤں سے الگ اکثر نظر آتی ہیں تاثیریں

شبابِ مختصر کے بعد یہ پیری کی تکلیفیں
ذرا سا خواب اور اُسکی یہ لامحدود تعبیریں!

شکارِ جور ہو جاتے ہیں خود اہلِ ستم نشتر
کسی کو باندھتی ہیں جب تو خود بندھتی ہیں زنجیریں

۱۱۲ ۲۳

کبھی قیدِ قفس میں دل سے جب ہم آہ کرتے ہیں
تو سُننے والے یا اللہ یا اللہ کرتے ہیں

نہ آگاہِ اجل ہم ہوں، تو ہے اسمیں خطا اپنی
ہزاروں واقعے دنیا میں روز آگاہ کرتے ہیں

اُسی منزل کا جویاں ہوں، اُسی منزل کا خواہاں ہوں
پہونچنے کی جہاں کوشش گدا و شاہ کرتے ہیں

تری منزل کے دیوانے، بجز اک اللہ بجز اک اللہ
جہاں راہیں نہیں پیدا وہاں بھی راہ کرتے ہیں

فراقِ یار میں ہمدم، بقدرِ اضطرابِ دل
کبھی کرتے ہیں نالے ہم کبھی ہم آہ کرتے ہیں

کہاں تک مشکلاتِ راہ کی درماندہ سامانی
قدم رکھتے ہیں ہم تو آج بسم اللہ کرتے ہیں

شکستِ ضبطِ غم، اے اضطرابِ دل قیامت ہے
کمائی عمر بھر کی ہم نثارِ آہ کرتے ہیں

کریں اُمید کیا ہم منزلِ مقصود ملنے کی
ہمارے رہنما خود ہی ہمیں گمراہ کرتے ہیں

یہ کس کے دیکھنے کو مضطرب ہیں رات دن یارب
طوافِ آسماں کیوں روز مہر و ماہ کرتے ہیں

کہو اُن سے شبِ فرقت کی گھڑیوں کو بھی کم کردیں
ہماری وصل کی راتوں کو جو کوتاہ کرتے ہیں

تمنائیں اُنھیں کی ہیں، اُنھیں کو لطف ہے اِنکا
جو روز اپنی تمنائیں فنا فی اللہ کرتے ہیں

کوئی ان آہ کرنیوالوں سے اک روز یہ پوچھے
کبھی یہ اپنے دل کو بھی شریکِ آہ کرتے ہیں؟

کبھی تکمیل ہو ہی جائیگی سعیِ محبت کی
خدا کا نام لیکر آج بسم اللہ کرتے ہیں

کُجا عرشِ معلیٰ اور کُجا فرشِ زمیں نشتر

۱۱۳ کہاں تاثیر رہتی ہے، کہاں ہم آہ کرتے ہیں ۱۴

کہاں گئے تمہارے وعدے پر اعتبار کے دن — وہ انتظار کی راتیں وہ انتظار کے دن
نہ جانے آئینگے کب پھر وہ ہی بہار کے دن — وہ میری آہ کے دن نالۂ ہزار کے دن
نہ اضطراب کے دن تھے، نہ تھے قرار کے دن — عجیب دن تھے محبت میں انتظار کے دن
فراقِ یار کے دن میں خزاں کے دن سمجھا — قسم خدا کی وہ ہی تھے مری بہار کے دن
بشر فریب میں ہے زندگی کے بڑھنے سے — قریب آتے چلے جاتے ہیں مزار کے دن
مری نشاط میں پنہاں ہیں میرے رنج و ملال — خزاں کا رنگ لئے ہیں مری بہار کے دن
یونہی گذرتی چلی جا رہی ہے دنیا میں — کبھی خزاں کا زمانہ کبھی بہار کے دن
حقیقتاً یہ فریبِ نظر ہے انساں کا — وہ ہی خزاں کے بھی دن ہیں جو ہیں بہار کے دن
جنھیں صحیح مذاقِ نظر خدا نے دیا — خزاں کی فصل کو سمجھا کئے بہار کے دن
بہار سے نہیں چھٹتا چمن کا ساتھ کبھی — خزاں کے دن بھی تو ہیں ماتمِ بہار کے دن
غضب خدا کا یہ کیا کہہ رہا ہے تو واعظ — سوال توبہ کا اور ابرِ نو بہار کے دن
قفس میں ہونگے الٰہی کہ ہم گلستاں میں — نہ جانے اب کے کہاں آئینگے بہار کے دن
نہ روئے کیوں کوئی اُسکی فسردہ بختی پر — جسے چمن میں نہ آئے کبھی بہار کے دن
نشاط آئی کہ بھرمار رنج و غم کی ہوئی — خزاں میں ڈوب کے آئے ہیں اب بہار کے دن
خوشی خوشی نہیں دیتی ہے کیوں خوشی کیطرح — بہار پر نہیں آتے ہیں کیوں بہار کے دن
فراقِ یار سے کیا وصلِ یار کو نسبت — کہاں خزاں کا زمانہ کہاں بہار کے دن

مجھے وہ خوب محبت کے یاد ہیں دن رات
مری خزاں کو ترستے تھے جب بہار کے دن

فریبِ موسمِ گُل سے نجات رہتی ہے
خزاں کے دن بھی ہیں گویا بڑی بہار کے دن

جب آیا عہدِ ضعیفی تو یہ ہوا معلوم
خزاں کے دن کے لئے تھے مری بہار کے دن

کبھی تو ضبط سے ہوگی نجات اے نشتر
کبھی تو لوٹیں گے پھر چشمِ اشکبار کے دن

۱۱۴ ۲۰

آنسو غمِ محبوب میں ہر وقت پیئے کون
مر مر کے اسطرح شب و روز جیئے کون؟

اے بادِ صبا ہاتھ جو تیرا نہیں اس میں
کر جاتا ہے ٹھنڈے مری تربت کے دیئے کون؟

ہنگامہ جانبازیِ عشاق تو دیکھو
آپس میں یہ جھگڑا ہے مرے کون جیئے کون؟

دل آنا نہ آنا، نہیں انساں کے بس میں
آجائے اگر موت تو اُس وقت جیئے کون؟

کہدو کہ انہیں میری ہی تربت پہ چڑھائے
جاتا ہے مری قبر سے یہ پھول لئے کون؟

اسطرح نہ آسودگی ہوگی کبھی ساقی
خُم منہ سے لگا دے مرے ساغر سے پیئے کون؟

ہر شے میں یہاں لطف ہے، دریافت کروں کیوں
دُنیا کے لئے کون ہے، عقبیٰ کے لئے کون؟

قاتل کا ہر انداز ہے قاتل بخدا آج
اب دیکھئے مقتل میں مرے کون جیئے کون؟

اپنی نگہِ مست کے انداز دکھا کر
دیکھو تو یہ جاتا ہے مری جان لئے کون؟

اے ضبط جگہ دی کہ یہ آنکھوں سے نکل جائیں
یوں آنکھ میں ہر وقت بھرا اشک لئے کون؟

ہو عشق و محبت میں اگر لطف نہ بے حد
ہر روز محبت میں مرے کون جیئے کون؟

دیکھو یہ کہیں حضرتِ نشتر تو نہیں ہیں!

۱۱۵ پھرتا ہے یہ سامانِ جنوں کس کے لئے کون؟ ۱۲

بھول نہ جاؤ تو سہی، اپنی یہ لن ترانیاں — تم نے ابھی سنیں کہاں، درد بھری کہانیاں
قصے اگر وہ دن ہیں اب، رات بھی ہیں کہانیاں — ہوش سے تھیں عداوتیں جوش پہ تھی جوانیاں
آتشِ سوزِ غم نے کیا سارا لہو جلا دیا — کیا ہوئیں اے دلِ حزیں، وہ تری خونفشانیاں
عاشقِ خستہ حال کی قبر کا کوئی بھی نہیں — بھول گئی نسیم بھی، اپنی وہ گل فشانیاں
یاد ہیں ہجر کے وہ دن، یاد ہیں ہجر کے وہ غم — وہ مری اشک ریزیاں، وہ مری خونفشانیاں
داغ ترے فراق کے، کیوں نہ عزیز ہوں مجھے — باقی ہیں عشق کی ترے دل میں یہی نشانیاں
سعی کیا کرے کوئی، کم نہ ہوئیں ہوں کبھی — حسن کی بے نیازیاں، عشق کی بدگمانیاں
خواب میں بھی نہیں نصیب، اس کی زیارت آجکل — کیا ہوئیں تھیں جو پیشتر، نیند کی مہربانیاں
ذکرِ جہاں کا کیا کریں، ذکرِ جہاں کا کیا سنیں — کون کہے کہانیاں، کون سنے کہانیاں
بیٹھے بٹھائے نشترؔ آج کس کا خیال آ گیا — یاد یکایک آ گئیں بھولی ہوئی کہانیاں

۱۱۶ ۱۰

بقدرِ جام کہیں بادہ خوار پیتے ہیں — جو آئیں پینے پہ دیوانہ وار پیتے ہیں
کہاں شراب تری بادہ خوار پیتے ہیں — تری نگاہ سے بے اختیار پیتے ہیں
شراب پینے کو سب بادہ خوار پیتے ہیں — ہماری طرح مگر دو ہی چار پیتے ہیں
نہیں ہے رشک، غمِ ہجرِ یار پیتے ہیں — شرابِ نابِ مئے خوشگوار پیتے ہیں
بہار تک کبھی محدود بادہ نوشی تھی — ہر ایک فصل میں اب میگسار پیتے ہیں

یہ میکدے کا ترے کیا نظام ہے ساقی — جو چار دیکھ رہے ہیں، تو چار پیتے ہیں
کبھی خیال کچھ اِنکا بھی چاہیے ساقی — لہو کے گھونٹ جو لیل و نہار پیتے ہیں
انھیں کو بادہ کشی کا حقیقتاً ہے مزہ — جو زیرِ سایۂ دیوارِ یار پیتے ہیں
کسی پہ کچھ ہے اثر، اور کسی پہ کچھ ہے اثر — شراب ایک سی سب بادہ خوار پیتے ہیں
شرابِ ناب میسر کہاں ہے اب ہم کو — ہم اپنے اشک ہی لیل و نہار پیتے ہیں
ہمیں یہ چشم عنایت ہے کیوں تری واعظ — ہمیں تو ایک نہیں پیتے ہزار پیتے ہیں
شرابِ عشق کی کیفیتیں معاذ اللہ — ہزار ہوتے ہیں مسرور، چار پیتے ہیں
جسے تمام زمانہ پکارتا ہے موت — شراب ہے جسے سب ایک بار پیتے ہیں
ہماری بادہ گساری کا ہے یہ وقت کہاں — کہ ہمتو دیکھ کے ابرِ بہار پیتے ہیں
غمِ جہاں نہیں رہتا مزار والوں کو — شراب کیا کوئی زیرِ مزار پیتے ہیں
ہماری بادہ کشی اب کہاں وہ پہلی سی — کبھی ہوئے جو بہت بیقرار پیتے ہیں
تصورِ نگہِ یار تیرا کیا کہنا — قفس میں رہ کے مئے خوشگوار پیتے ہیں
تبائیں بادہ گساری کی وجہ کیا نشتر — کرم کے ہم بھی ہیں اُمیدوار پیتے ہیں

۱۱۷ — ۱۸

پیش کرتی رہتی ہیں ہر دم نرالی صورتیں — کیا قیامت ہیں مرے دل کی خیالی صورتیں
وہ نہ خود آئے، نہ خط آیا، نہ لوٹا نامہ بر — مِٹ مِٹا کر رہ گئیں میری خیالی صورتیں
جسکو دُنیا کہتی ہے دُنیا، خیالستان ہے — آدمی کہتے ہیں جنکو، ہیں خیالی صورتیں

ان حسینانِ جہاں کو دیکھکر حیران ہوں
یہ تیرے اِن کے اور یہ بھولی بھالی صورتیں
کیوں نہ ہوتا عشق، کیوں ہوتا نہ یہ انجامِ عشق
ہو کے رہتی ہیں ہمیشہ ہونیوالی صورتیں
سیرتِ انساں بھی کوئی چیز ہے صورت کیساتھ
کیا کرے لیکر کوئی دُنیا میں خالی صورتیں
حشر میں دیکھیں گے ملتی ہیں کسی سے یا نہیں
دلمیں جو اسکی ہزاروں ہیں خیالی صورتیں
اپنے ہاتھوں سے چھپا دیتے ہیں ہم زیرِ زمیں
کیسی کیسی موہنی نازوں کی پالی صورتیں
اُسکی صناعی کا یہ ادنیٰ کرشمہ دیکھئے
جتنی تصویریں ہیں، سکی ہیں نرالی صورتیں
ہے قصور اسمیں ہمارا ہی اگر غمگیں رہیں
خود بناتے رہتے ہیں غم کی خیالی صورتیں
یا الٰہی اور پیدا کر زمین و آسماں
روز کبتک کوئی دیکھے دیکھی بھالی صورتیں
ہے خوشی دُنیا میں کوئی شے، نہ کوئی چیز غم
درحقیقت ہیں یہ دونوں ہی خیالی صورتیں
ہے انھیں کا نام دُنیا اور دُنیا کچھ نہیں
کچھ خیالی سیرتیں ہیں، کچھ خیالی صورتیں
بے نیازی ان کی جانب سے سوا ہونے لگی
ہو چلیں پیدا مجھے تڑپانے والی صورتیں
شکر یہ کِس منہ سے تیرا ہو ادا اے ضبطِ غم
زخم ہائے دلمیں ہیں اب اندمالی صورتیں
اب اسے کہئے فنا، چاہے قضا، چاہے اجل
روز بن بن کر بگڑتی ہیں خیالی صورتیں
نشتر اُن میں ہم ہیں جو سیرت کا رکھتے ہیں خیال
اور ہونگے دیکھتے ہونگے جو خالی صورتیں

۱۱۸

۱۸

نظارہ بہار کو آنکھیں ترس گئیں
نظریں بہت گئیں تو مری تا قفس گئیں
اے سوزِ عشق آہ یہ کیا تونے کر دیا
دلکی جو آرزوئیں تھیں دلمیں جھلس گئیں

ان میری آرزوؤں کا دیکھے تو کوئی رنگ — ہر وقت ہے یہ حال کہ دس آئیں دس گئیں
وہ نقطۂ نگاہ نہ باقی رہا مرا — نظریں کسی کی جب سے مرے دل میں بس گئیں
اے دل خدا کے واسطے اب بھول پچھلے خواب — وہ دن گئے وہ آتیں ابھی بوالہوس گئیں
پیری میں زعمِ عہدِ جوانی فضول ہے — برسینگی کیا وہ پھر جو گھٹائیں برس گئیں
آجاؤ اب تو ہو چکی حد انتظار کی — نظارۂ جمال کو آنکھیں ترس گئیں
خودکام آرزوئیں تھیں عہدِ شباب کی — آئیں بکامِ حرص بکامِ ہوس گئیں
تھے وہ بھی دن کہ جب یہ گھٹاؤں کا حال تھا — اُٹھیں کہیں سے میرے چمن پر برس گئیں
اللہ کون قیدِ قفس میں سُنے یہ روز — لو آج پھر چمن پہ گھٹائیں برس گئیں
نشترؔ کرم ہے رحمتِ حق کی گھٹاؤں کا
119 دل سے بخارِ یاس جب اُٹھا برس گئیں 11

بے پلائے ماننے والی نہیں — آج معمولی گھٹا کالی نہیں
رنج و غم سے دل کبھی خالی نہیں — ایک لمحہ فارغ البالی نہیں
ایک ذرہ آپ سے خالی نہیں — حیف نظریں دیکھنے والی نہیں
شیخ جی ہم اور ترکِ میکشی — یہ ہی ممکن حضرتِ عالی نہیں
کر دیا جس نے ہمیں مجبورِ قید — وہ ہماری بے پر و بالی نہیں
کیوں نہ جائے آئے دن سوئے زوال — آدمی میں ہمتِ عالی نہیں
یا ہمارا دل نہیں مستی پذیر — یا تری آنکھ آج متوالی نہیں

رحم اے داغِ فراقِ یار رحم — دل میں اب کوئی جگہ خالی نہیں
وعظ و عظ کا یہ بعد از وقت ہے — اب گھٹائیں چرخ پر کالی نہیں
یوں ہوا اپنی ہوا باندھا کرے — آج یہ اُن کی گلی والی نہیں
لوٹتا کیوں میرے نشیمن پر ہے برق — اور کوئی باغ میں ڈالی نہیں؟
چاہتا ہے تو اُسے اے بے نیاز — جس کی دُنیا چاہنے والی نہیں
دیکھ اُن پھولوں کو بھی اے فصلِ گُل — جن کا مالی، جن کا رکھوالی نہیں
کیوں میں شاخِ آشیاں کا غم کروں — کون سی ڈالی مری ڈالی نہیں
یہ اسی کی ہوگی، ہوتی آئی ہے — جس نے دُنیا پر نظر ڈالی نہیں
کردیا کیا تو نے اے بادِ خزاں — ہے سبز کوئی باغ میں ڈالی نہیں

۱۲۰ خونِ دل کی ہے یہ نشتر خواستگار
شاعری ہے، کوئی قوالی نہیں ۱۷

رات دن ہیں جورِ پیہم کیا کریں — یہ جوانی یہ شبِ غم، کیا کریں
شکوہ جور و جفا ہم کیا کریں — اُنکی خو ہے جورِ پیہم کیا کریں
دل بھی ظالم ہو گیا اُنکی طرف — جانے دونوں مل کے ہم کیا کریں
بس میں ہیں مٹ کر امیدیں رہ گئیں — کہہ دیا تم نے جہاں، ہم کیا کریں
جانتے ہیں جب، کہ یہ اپنی نہ تھی — جان کے جانے کا ماتم کیا کریں
دل جو کہتا ہے کئے جاتے ہیں ہم — اپنے دیوانے کو برہم کیا کریں

کس طرح آخر ملے تجھ سے نجات — کچھ بتا تو اے شبِ غم کیا کریں
عشق میں گمنامیوں کا لطف ہے — ہو گئے ہم مشہورِ عالم کیا کریں
اے غمِ جاوید تیری خیر ہو — عارضی خوشیوں کا ماتم کیا کریں
ہے اگر اختر شماری بھی گناہ — صبح تک آخر شبِ غم کیا کریں
کیوں نشاطِ دہر کو کر دیں نہ ترک — ہے یہ ظالم دشمنِ غم کیا کریں
نشتر اب بیمارِ غم کا کیا علاج
۱۲۱ آج وہ بھی کہہ گئے ہم کیا کریں ۱۲

چھوڑ دیں کسطرح قدرت ہی نہیں — ترکِ مے رندوں کی فطرت ہی نہیں
اور بھی انسان کو واعظ ہیں کام — صرف رندوں کی مذمت ہی نہیں
سو طرح کے عشق میں ہوتے ہیں رنج — ایک تنہا دردِ فرقت ہی نہیں
ہو گیا کیا آدمی کو اے خدا — کچھ خیالِ آدمیت ہی نہیں
کب ہوا ہے اُن کو احساسِ وفا — جب ہمیں اسکی ضرورت ہی نہیں
لاکھ تڑپیں لاکھ کوندیں بجلیاں — اضطرابِ دل سے نسبت ہی نہیں
دل میں سوچا ہے اکدن منعمو — سب کچھ اِس دُنیا میں دولت ہی نہیں
کیا کریں ہم شکوۂ دردِ فراق — اب ہمیں احساسِ فرقت ہی نہیں
کیا سبق انسان اِس دُنیا سے لے — چشمِ انساں میں بصیرت ہی نہیں
شادی و غم کیا کریں اُس پر اثر — جسکو دُنیا کی محبت ہی نہیں

یہ غضب اے یاس تو نے کیا کیا — آج دل میں کوئی حسرت ہی نہیں
رنگِ نیرنگِ زمانہ دیکھیے — جیسے دُنیا میں محبت ہی نہیں
اب بہاریں کیوں نہیں دیتیں مزا — وہ جنوں وہ جوشِ وحشت ہی نہیں
نامُرادیِ مسلسل مرحبا — وہ مرا دل، وہ طبیعت ہی نہیں
کیوں کروں شکوے کسی کے جور کے — یہ تقاضائے محبت ہی نہیں
کیا کرے وہ جس کو مرنے کے سوا — زندگی کی کوئی صورت ہی نہیں
یوں مصیبت میں ہو جب بات ہی — تم پہ گویا کچھ مصیبت ہی نہیں

ہم ہیں نشتر خوگرِ ضبطِ فغاں
وہ سمجھتے ہیں محبت ہی نہیں

۱۲۲ ۱۸

اُس وقت دیکھ اپنے ماحول کی فضائیں — جب ماند ہوں ستارے، شمعیں بھی جھلملائیں
جتنی بھی ہو سکیں تم ہم پر کرو جفائیں — انداز پوچھتے ہو، انداز کیا بتائیں!
منزل قریب آئی، خاموش ہیں فضائیں — کچھ اور ہیں ہوائیں، کچھ اور ہیں صدائیں
اک معجزہ ہے میرا، اقدامِ بادہ نوشی — وہ دیکھو کالی کالی، اُٹھنے لگی گھٹائیں
خوشیوں کی اصلیت سے ہم ہو چکے ہیں واقف — واقف نہ ہوں جو ان سے، خوشیاں وہ ہی منائیں
ہم کر چکے محبت، ہم نے تو کچھ نہ پایا — اب اور لوگ آئیں، تقدیر آزمائیں
لو آ گئیں وہ لیکر، پیغامِ کیف و عشرت — بہکی ہوئی ہوائیں، بہکی ہوئی گھٹائیں
جس وقت سے بیخودی کی لذت ملی ہے ہم کو — اب جی یہ چاہتا ہے، ہم ہوش میں نہ آئیں

کچھ عرصے میری خاطر، ایسی روش بھی ظالم — دو چار دن وفائیں، دو چار دن جفائیں

انسان ہی کا دم ہے جو انکو جھیلتا ہے — انسان بیچ میں ہے، چاروں طرف بلائیں

ہے غم فزا قفس میں کیوں یاد گلستاں کی — کیا کم ہیں غمزدوں کو، یہ ابر یہ گھٹائیں

قسمت کی آڑ لیکر، کیا کیا ہیں نازشوں پر — دروازۂ اثر سے لوٹی ہوئی دعائیں

پوچھے نہ کوئی ہم سے، کیوں ترکِ میکشی کی — باتوں میں آگئے تھے واعظ کی، کیا بتائیں

منزل کی جستجو ہو، دل سے اگر کسی کو — گمراہ کرنیوالے، خود راستہ بتائیں

اللہ کھول آنکھیں، اللہ دے بصیرت — کبتک ہم اس جہاں کے آخر فریب کھائیں

کبتک کوئی فلک کے سہتا رہے نظالم — آتا ہے جی میں ہم بھی اب آستیں چڑھائیں

پہونچا دیا کہاں پر، اے عشق تونے ہم کو — دنیا کی اب صدائیں، ہیں دور کی صدائیں

دنیا کی ساری باتیں، ہیں دشمنِ محبت — آتا ہے جی میں دنیا، اپنی الگ بسائیں

جس وقت ہم نے ٹھانی، بادہ کشی کی نشتر
اُٹھنے لگیں گھٹائیں، چلنے لگی ہوائیں

۱۲۳ — ۱۹

سامنا اُس آنکھ کا ہے، اور میں — کیف و مستی کی فضا ہے، اور میں

اب زمانہ ہجر کا ہے اور میں — زندگانی بد مزا ہے اور میں

ارتکابِ جرم کیوں کرنے لگا — رات دن خوفِ خدا ہے اور میں

ہو ہی جائیگی محبت میں بسر — یہ دلِ درد آشنا ہے اور میں

اُسطرف اُن کی جفا ہے اور وہ — اِسطرف میری وفا ہے اور میں

دیکھئے نبھتی ہے کبتک، کس طرح — وہ تغافل آشنا ہے اور میں
سو طرح کہہ سُن کے اُن سے تھک گیا — اب فقط شغلِ دُعا ہے اور میں
اور ہمرازِ محبت کون ہے — اِک دلِ درد آشنا ہے اور میں
زندگی بھی دی تو پابندِ قضا — رات دن خوفِ قضا ہے اور میں
اک طرف ہے رحمتِ پروردگار — اک طرف میری خطا ہے اور میں
رات دن بھولا ہوا ہوں میں اُسے — یعنی فکرِ ماسوا ہے اور میں
چارہ گر مایوس ہو کر چل دیئے — اب یہ دردِ لادوا ہے اور میں
مجھکو اِس ہنگامۂ ہستی سے کیا — میری خلوت میں خدا ہے اور میں
آسرے دُنیا کے سب جاتے رہے — اب خدا کا آسرا ہے اور میں

کاش اے نشتر رہوں ثابت قدم
آفتوں کا سامنا ہے اور میں

۱۲۴ — ۱۶

کب نگاہوں میں تری محفل نہیں — کب تری محفل کا جویا دل نہیں
میں قدم فرسا ہوں، فرطِ شوق سے — سامنے میرے کوئی منزل نہیں
اہلِ محفل کے قلوب تنگ ہیں — ہمتِ پروانہ محفل نہیں
لذتِ غم سے جو ہو مانوس دل — ہجر میں جینا کوئی مشکل نہیں
جو کرے تلقین ترکِ عشق کی — اُنکے سینے میں یقیناً دل نہیں
سب یہ کہتے ہیں کہ منزل آگئی — دل یہ کہتا ہے ابھی منزل نہیں

اک قدم آگے بڑھا دیتی ہے یہ — سعیِ لاحاصل بھی لاحاصل نہیں
چار دن پہلے جو منزل تھی مری — اب وہ ہی منزل مری منزل نہیں
میرے دل کا نام اب رکھئے کچھ اور — دل کہاں جب آرزوئے دل نہیں
تجھ سے ہر انسان غافل ہے، مگر — تُو کسی انسان سے غافل نہیں
امتحانِ دل جسے کہتے ہو تم — موت ہے وہ امتحانِ دل نہیں
یہ کرشمہ ہے نگاہِ ناز کا — اب ہمارا دل، ہمارا دل نہیں
ہر حسیں کی کیوں ادا ہو ایک سی — ہر ستارہ تو مہِ کامل نہیں
پہلے جینا بھی مجھے آساں نہ تھا — جان دیدینا بھی اب مشکل نہیں
سوچکر اس کو اُڑا، بادِ صبا — صرف یہ خاکسترِ محفل نہیں
ہے وہ ہی عاشق، وہ ہی شایانِ عشق — دل کو جو سمجھے کہ میرا دل نہیں

جان کے لالے پڑے ہیں عشق میں
اب فقط نشتر سوالِ دل نہیں

۱۲۵ — ۱۷

آج فرصت ہے کہ اندیشۂ فردا کر لوں — راہ تاریک ہے، پہلے سے اُجالا کر لوں
وہ مرے پاس ہیں، اظہارِ تمنا کر لوں — آج تو اپنے خیالات کو یکجا کر لوں
دل کو معمور تری یاد سے اتنا کر لوں — کعبے کی سیر کروں، طوفِ کلیسا کر لوں
پوچھ لوں ضبطِ محبت سے جو ناراض نہ ہو — قصد ہے گریہ سے کچھ غم کا مداوا کر لوں
ایک ہی بات ہے امکان میں اے حضرتِ دل — خاطرِ دوست کروں، خاطرِ دُنیا کر لوں

شوقِ بیباک سے دوں حُسن کو پھر دعوتِ عشق — پہلے میں اپنی تمنا کو تمنا کروں
دل میں کس طرح کروں اپنی تمنا اُسکی — پہلے میں دل کو تو شایانِ تمنا کروں
اور تو کچھ بھی نہیں صرف یہ اِک حسرت ہے — مجھ سے مل جاؤ تو اظہارِ تمنا کروں
بے نیازی سے نہیں آپ کی ڈرنیوالا — آپ کو، کہئے تو دو روز میں اپنا کروں
ایک دن مجھ پہ بھی ہو جائے عنایت تیری — میں بھی نظارۂ حُسنِ رُخِ زیبا کروں
ہائے بیدرد ترے درد کا کیا کہنا ہے — جی میں آتا ہے اسے دل کا مداوا کروں
جوشِ وحشت میں کبھی یہ بھی اُمنگ اُٹھتی ہے — خود تو رسوا ہوں، مگر تجھکو بھی رسوا کروں
وہ جو ملتے ہیں تو اِس فکر میں کھو جاتا ہوں — نہ کروں آج کہ اظہارِ تمنا کروں
یوں محبت سے مجھے خاک نہ حاصل ہوگا — جبتک اندازِ محبت کے نہ پیدا کروں
جوشِ وحشت میں جو وحشت پہ میں اپنی آؤں — ساری دُنیا کو ابھی محوِ تماشا کروں
رحمتِ حق کہیں تحقیر سے دیکھے نہ انھیں — اور میں اپنے گناہوں میں اضافا کروں
اب وہ عالم ہے مرے دل میں کہ انشاءاللہ — یاس بھی آئے تو ہمرنگِ تمنا کروں
بھولجانیکی اُسے سعی میں کرتا ہوں فضول — کہیں ایسا نہ ہو غم اور زیادا کروں

یاد کرتا نہیں میں بھول کر اُسکو نشتر
۱۲۶ پھر بھی یہ خبط ہے مجھ کو اُسے اپنا کر لوں ۱۹

نجاتِ ہر نفس ہے صرف مرگِ ناگہانی میں — کسی کا بس نہیں ہے وسعتِ دُنیائے فانی میں
نہ ہو غم تو مزہ کیا خاک آئے شادمانی میں — خزاں کچھ لازمی سی ہے بہارِ زندگانی میں

نہ جانے آئے یا یہ دن نہ آئے پھر جوانی میں
ڈبوئے آج تو ساقی، شرابِ ارغوانی میں

پسِ مردن اگر بالیں پہ تم آئے تو کیا آئے
مزہ جب تھا کہ آجاتے ہماری زندگانی میں

کریں صبر و قرار امداد کچھ میری شبِ فرقت
یہ پہلا سانحہ ہے آج میری زندگانی میں

ملے آسودگی کیا اس کو جو غرقِ تمنّا ہو
سکونِ بحر کب ملتا ہے، موجوں کی روانی میں

ہمیں اب صبر کیونکر ہو، سکوں آئے تو کیوں آئے
یقیں کا رنگ گہرا ہے ہماری بدگمانی میں

تصوّر میں تمہیں سے گفتگو ہے رات دن میری
لگا رہتا ہوں میں ہر دم تمہاری میہمانی میں

وفائیں عشق میں عنقا ہمیشہ رہتی آئی ہیں
یہ سننے ہی کی چیزیں ہیں فقط قصّے کہانی میں

بڑے پائے کا عاشق چلدیا کوئی ترا شاید
فضائیں آج کیوں مصروف ہیں سب نوحہ خوانی میں

ترے عاشق کا قصہ پاک آخر ہو تو کیونکر ہو
اسے ہے جاں دہی میں لطف تجھکو جانستانی میں

خدا کیواسطے اے حضرتِ واعظ، خدا لگتی!
یہ نفرت بادہ پیمائی سے، اور عہدِ جوانی میں!

گنہ چھپ کر کرو کتنا ہی ظاہر ہو کے رہتا ہے
ضرور ابھریگا وہ پانی پہ، جو ڈوبیگا پانی میں

گوارا موت کی تلخی سبھی کو کرنی پڑتی ہے
کسی کو عہدِ پیری میں کسی کو نوجوانی میں

قضا یوں تو قضا ہر وقت ہے جب وقت آجائے
مگر دیکھے کوئی آتی ہے جب ظالم جوانی میں

بغیر عشق میری زندگی ممکن نہیں ناصح
وہ باہر کیا رہیں پانی سے، جو بستے ہیں پانی میں

ہر اک مشکل مری جوشِ محبت میں ہوئی آساں
کہیں کوئی ٹھہر سکتا ہے دریا کی روانی میں

ارے او بے خبر اندھا نہ بن، لے کام آنکھوں سے
حیاتِ جاوداں کی جستجو، اور دارِ فانی میں!

تری تصویر ہے تصویر تیری ہی، مگر پھر بھی
کہیں آتا ہے لطفِ نقشِ اول نقشِ ثانی میں

کہیں موقع سے ملجاتا، تو میخانے لیئے چلتے
ذرا یہ دیکھتے اکدن، ہے واعظ کتنے پانی میں

نہ چھوڑا افسانۂ فرقت مرا، افسانہ گو ظالم
یہی تو ایک ٹکڑا ہے، مری ساری کہانی میں

وفا کی جستجو جنکو حسینانِ جہاں میں ہے
وہ دریا کی روانی ڈھونڈھتے ہیں بندپانی میں

شبِ فرقت کی طولانی کا یہ عالم معاذ اللہ
کہ جیسے اک یہی ہے رات ساری زندگانی میں

کنارہ ہی سے ہمت تو جواب خشک دیتی ہے
الٰہی حشر کیا ہونا ہے، جب اُتریں گے پانی میں

مزے سے تو نہیں خالی، جفا اُنکی کوئی، لیکن
مزہ کچھ اور ہوتا ہے جفائے امتحانی میں

نہیں دیوان کے دیوان پاسکتے انھیں نشتر
نکلجاتی ہیں جو غزلیں طبیعت کی روانی میں

سُنے کس سے یہاں کوئی، سُنے کسکی یہاں کوئی؟
پڑی ہے اپنی اپنی سب کو نشتر دارِ فانی میں

۱۲۷ ۲۷

کب تری محفلِ رنگیں میں نہیں ہوتے ہیں
ہم کہیں بھی ہوں حقیقت میں وہیں ہوتے ہیں

خفگی میں یہ حسیں اور حسیں ہوتے ہیں
دیکھیے اُنکو یہ جب چیں بہ جبیں ہوتے ہیں

یوں تو ہر بات میں اچھے یہ حسیں ہوتے ہیں
اک ذرا قول کے پابند نہیں ہوتے ہیں

مے و معشوق سے ہوتی نہیں جنکو الفت
میری دانست میں انسان نہیں ہوتے ہیں

کیوں اُلجھتے ہو عبث شیخ سے بادہ نوشو
ایک سے سب کے خیالات نہیں ہوتے ہیں

اب تو نزدیک ہے اتنی تری محفل ہم سے
دل میں آتا ہے خیال اور وہیں ہوتے ہیں

تھی جبیں سجدوں کی پابند، کبھی وہ دن تھے
اب تو سجدے، مرے پابندِ جبیں ہوتے ہیں

دل جو دینا تھا بہ مقدارِ الم دینا تھا
گھر زمانے میں بہ اندازِ مکیں ہوتے ہیں

ٹکّریں چرخ سے لیتے ہیں ہمیشہ انسان ہار جاتے ہیں تو پیوندِ زمیں ہوتے ہیں
سب کو شکوہ ہے حسینوں کی دل آزاری کا مجھ کو یہ غم کہ دل آزار نہیں ہوتے ہیں
عرضِ مطلب پہ خموشی نہیں اُن کی بیجا کچھ سوالوں کے جوابات نہیں ہوتے ہیں
چار دن میں نہیں ہوتے ہیں سبقِ عشق کے یاد مدّتوں میں یہ کہیں ذہن نشیں ہوتے ہیں
سجدے مقبولِ خدا ہوتے ہیں جنکے نشترؔ
اور اُن لوگوں کے اندازِ جبیں ہوتے ہیں

۱۲۸ ۱۳

میں ہوں بزمِ حُسن سے آشنا، کہ رہا ہوں پردۂ راز میں
میں بڑھا ہوں محفلِ ناز میں، میں پلا ہوں محفلِ ناز میں
ہمیں کام لذّتِ غم سے ہے، ہمیں تلملانے سے واسطہ
کرے امتیاز بلا ہماری، حقیقت اور مجاز میں
مجھے واسطہ نہ الم سے ہے، نہ غرض ہے کوئی نشاط سے
تری بزم سے مجھے کام کیا، نہ میں سوز میں نہ میں ساز میں
نہ ثبات اِسے، نہ قیام اِسے، نہ حقیقتوں سے ہے کام اسے
مجھے زحمت آپ نے دی فضول، جہانِ شعبدہ باز میں
تو نظر سے لاکھ چھپا رہے، ترا راز راز نہیں رہا
جسے جانتی ہو تمام خلق، وہ راز ہے کسی راز میں؟
وہ ہی ایک لذّتِ غم بھی ہے، وہ ہی ایک لُطفِ کرم بھی ہے

نہ ہوا ہے فرق، نہ ہوگا فرق، حقیقت اور مجاز میں
کرو قدر میرے نیاز کی، میں تمہارا عاشقِ زار ہوں
مجھے کیوں پھراتے ہو دربدر، مجھے لیلو دامنِ ناز میں
ترے دل میں شرم ہو کچھ اگر، تو کمالِ ننگ سے ڈوب مر
کہ ترا گذر بھی نہیں مگر، ہیں پتنگے محفلِ ناز میں
مرے دل میں جلوۂ نورِ حق کی ضیائیں پھیلی ہیں ہر طرف
مجھے ایسی کونسی ہے غرض، کہ میں جاؤں بزمِ مجاز میں
ہے خوشی خوشی وہ ہی جسمیں جھلک بھی غم کی دکھائی دے
وہ ہی ساز، ساز ہے اصل میں، کہ ہو لطفِ سوز بھی ساز میں
میں ہوں اہلِ عشق تمام کا، ہو کرم جو کوئی کرے عطا
مرے دل نے مجھ کو پھنسا دیا ہے فریبِ حُسنِ مجاز میں
نہ ہوا جُدا کبھی اک گھڑی کو بھی اُنکی محفلِ ناز سے
کبھی میں تھا محفلِ ناز میں، کبھی دل تھا محفلِ ناز میں
جو پتنگے اُس نے جلا دئے، تو رہی نہ شمع بھی چین سے
یہ ہی ہے یونہی گداز میں، یہ رہیگی یوں ہی گداز میں
کوئی بیچ میں جو پڑے تو کیوں، کوئی مجھ کو منع کرے تو کیوں
اُسے لطف میرے جلانے میں، مجھے لطف سوز و گداز میں

میں ہوں اہلِ محفلِ ناز کا، نہ اُٹھا ب مجھے، نہ ہٹا مجھے
مرا حق ہے محفلِ ناز پر، مری جا ہے محفلِ ناز میں
نہیں دور کا بھی تو واسطہ، کوئی میرا اور ترا واعظا
تری جا ہے محفلِ وعظ میں، مری جا ہے محفلِ ناز میں
جو مزہ ہے سوز و گداز میں، نہیں نشترؔ اور کسی میں وہ
کہ یہ ہوتا مشربِ شمع کیوں، جو نہ ہوتا لطف گداز میں

۱۲۹ ۱۷

عرصۂ محشر سے آخر اُٹھ گیا میں، کیا کروں — یہ خیال آیا کہ اُن کا سامنا میں کیا کروں
بے اثر نالے ہیں، آہیں نارسا میں کیا کروں — اپنی غمگیں زندگی کا فیصلہ میں کیا کروں
ایسے ظالم سے بھلا چشمِ وفا میں کیا کروں — جب کہا میں نے کہ مرتا ہوں کہا، میں کیا کروں
انتہائے بے بسی کا اور کیا ہوگا ثبوت — آج وہ خود کہہ گئے اس پہ جفا میں کیا کروں
کیوں دُعاؤں پر تجھے اصرار ہے اے ہمنشیں — کوئی سنتا ہی نہیں میری دُعا میں کیا کروں
سُن چکا ہوں میں ہزاروں وارداتیں حُسن کی — ایسے عاشق کُش سے اُمیدِ وفا میں کیا کروں
ہوگئیں نیچی نگاہیں اُنکی میرے دل کے پار — کرتے کرتے اُنکے شکوے رُک گیا میں، کیا کروں
ہُو کا عالم ہر طرف، ساری فضائیں دم بخود — درد کی دلمیں نہیں کچھ انتہا میں کیا کروں
میں وفا کرتا ہوں جتنی اور وہ کرتے ہیں جور — کیا علاج اسکا کروں، اسکی دوا میں کیا کروں
کیوں نہ یہ سمجھوں چراغِ گور قسمت میں نہیں — روز ناحق شکوۂ بادِ صبا میں کیا کروں
اک جفا پر سو وفائیں تو کئے جاتا ہوں میں — آپ ہی فرمائیے اس کے سوا میں کیا کروں

میں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی ہے کوئی ناکامِ عشق — ایک گھر سے آرہی تھی کل صدائیں کیا کروں
قید سے بدتر ہے اب صیاد آزادی مجھے — فصلِ گل رخصت ہوئی ہو کر رہا میں کیا کروں
ایک دن چپ چاپ ہونا ہے فنا آخر مجھے — چار دن کو باندھ کر اپنی ہوا میں کیا کروں
کشتۂ جور و جفائے یار اک مدت سے ہوں — سوچتا ہوں اب کہ ارمانِ وفا میں کیا کروں
میں نے سوچا تھا کہ توبہ اور چلتی کچھ دنوں — جھوم کر اتنے میں بادل آگیا، میں کیا کروں
لوگ ان سے کیوں نہیں کہتے ہیں ترکِ جور کو — فطرتاً ہوں میں تو مجبورِ وفا میں کیا کروں
میں دعائیں کر چکا، لاکھوں وفائیں کر چکا — اور اب آخر مداوائے جفا میں کیا کروں

اب مریضِ غم ہے نشتر اور خدا کی ذات ہے
چارہ گر بھی آج آکر کہہ گیا، میں کیا کروں

۱۳۰ ۱۹

مجھے بھٹکا رہے ہو کیوں تلاشِ راہِ منزل میں — کسی دن آ بھی جاؤ آنکھ کے رستے مرے دل میں
سنبھالے کیا انہیں کوئی پڑی ہو جان مشکل میں — ہزاروں آرزوئیں روز آتی ہیں مرے دل میں
تری محفل سے جب آتے ہیں تو کچھ روز تک ہم کو — یہی معلوم ہوتا ہے، ابھی بیٹھے ہیں محفل میں
نہ پہلے درد اتنا تھا، نہ اس میں اتنی لذت تھی — تمھیں کیا درد بنکر آتے جاتے ہو مرے دل میں
بشر سے سچ اگر پوچھو تو پروانے کہیں اچھے — نہیں پھر لوٹتے محفل سے جب جاتی ہیں محفل میں
چلے لیکر ہزاروں آرزوئیں تیری محفل سے — ہزاروں آرزوئیں لیکے ہم آئے تھے محفل میں
بہت بیدل نظر آنے لگے ہیں جب سے لوٹے ہیں — کہیں دل تو نہیں ہم چھوڑ آئے انکی محفل میں؟
غرض کچھ زندگی سے ہے نہ ہمکو موت سے مطلب — ہماری زندگی اور موت، سب ہے ذہنِ قاتل میں

کھنچی جاتی ہے دنیا کوئے قاتل کی طرف ساری
الٰہی کونسی ایسی کشش ہے کوئے قاتل میں

تصور کی کمی بیشی سے اب اپنا یہ عالم ہے
کبھی محفل سے باہر ہیں کبھی بیٹھے ہیں محفل میں

تمنا جو ترے ملنے کی ہے، وہ اک قیامت ہے
ہزاروں یوں تو رہتی ہیں تمنائیں مرے دل میں

تجھے دیکھا ہے جب سے، ہے مسلسل اضطرابِ دل
نمایاں ہے تری برقِ نظر بیتابئ دل میں

محبت کے بھی دو داغ ہیں فطرت کے آئینے
ہمارے قلبِ محزوں اور روئے ماہِ کامل میں

بہت دل کو لبھانے والی ہے دنیا، مگر پھر بھی
کہاں پاتی ہے یہ اسکو جو دنیا ہے مرے دل میں

لئے جاتا ہے باہر کون یہ، خاکسترِ محفل
ہمیشہ بات رہنی چاہیے محفل کی محفل میں

ہزاروں عیب ہوں تجھ میں یہ کیا کم فخر ہے مجھ کو
وہی باتیں زباں پر ہیں جو باتیں ہیں مرے دل میں

محبت میں طبیعت کی عجب رفتار ہے یارب
جہاں آسانیاں ہوتی ہیں، پڑ جاتا ہوں مشکل میں

مجھے ذوقِ تماشا ہے، انھیں چھپنے کی عادت ہے
نہ میں ہٹتا ہوں محفل سے، نہ وہ آتے ہیں محفل میں

ہزاروں آرزوؤں میں گھرا رہتا ہوں ہر لحظہ
کبھی دیکھ آکے یہ دنیا جو دنیا ہے مرے دل میں

بھلا کب رُک سکتا ہے، کوئی جذبِ محبت کے
ہمیں وہ کر گذرنا جو ارادہ کر لیا دل میں

اسی دورِ محبت میں کبھی وہ دن بھی آئیگا
ہماری آرزوئیں جب رہینگی آکے دل میں

محبت اور پھر اک بیوفا سے، ہائے نادانی
نہ جانے آگئی بیٹھے بٹھائے کیا مرے دل میں

اگر ہو زندگی سادہ، تو ہے کچھ لطف جینے کا
تمنا دلمیں ہو کوئی، نہ کوئی آرزو دل میں

سمائے جاتے ہیں ہر روز لاکھوں غم محبت کے
کہاں کی وسعتیں کمبخت پیدا ہو گئیں دل میں

سمجھ میں آج تک آیا نہ بسمل ہونے والوں کی
صفائی دستِ قاتل میں ہے یا شمشیرِ قاتل میں

وہ جینے کی تمنا ہو، کہ مرجانے کی حسرت ہو — نہیں جاتی ہے مر دل سے جب آتی ہے مر دل میں
ہماری نارسائی کی بھی کوئی حد نہیں نشتر — ابھی منزل کہاں، گم ہیں سراغِ راہِ منزل میں
یہی رہ رہ کے اکثر سوچتا رہتا ہوں میں نشتر
خودی سر میں کہاں سے آگئی، جب تھا خدا دل میں

۱۳۱ ۲۸

غمِ فراق نہ فکرِ وصال کرتے ہیں — ہم اب تو ماتمِ ماضی و حال کرتے ہیں
ہلال گھٹ کے کہاں جائیگا جو خوف کرے — کمال والے خیالِ زوال کرتے ہیں
خدا کی بات پہ کرتے کہیں خیال ای کاش — تمھاری بات کا جتنا خیال کرتے ہیں
وفا میں نہیں کہتا، حسیں نہیں کرتے — برائے نام مگر خال خال کرتے ہیں
ہمیں تو موت ہے بیکار اک گھڑی رہنا — "جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں"
وہ چاہے طور کا قصہ ہی کیوں نہ تازہ ہو — ہم آج ارادہ بزمِ جمال کرتے ہیں
خوشی انہیں کی ہے در اصل ہنسنے ملنے میں — خوشی کو بھی جو تصورِ ملال کرتے ہیں
ملا ہے ہم کو دلِ دردمند کچھ ایسا — کسی کا رنج ہو، اپنا خیال کرتے ہیں
خوشی خوشی تھی کبھی ہمکو اور ملال، ملال — اور اب تو دونوں کو یکساں خیال کرتے ہیں
نکل کے آتے نہیں ہیں زباں تک نشتر
ہمارے نالے کسی کا خیال کرتے ہیں

۱۳۲ ۱۰

محبت کا جو گھر تھا، چاہنے والوں کے سینوں میں — الٰہی کچھ وفا بھی لازمی تھی، نازنینوں میں
رموزِ عشق آئی ہیں، نہ آئیں گی زبانوں پر — چلی آئی ہیں سینوں میں چلی جائینگی سینوں میں

غم و اندوہ، جن کے نام سے بھی ہم نہ تھے واقف — وہ ہی اب ہیں ہمارے رات دن کے ہمنشینوں میں

شکایت کیجیے کیونکر، کسی کے جورِ پنہاں کی — "ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"

ارے یہ اہلِ دنیا کیوں لڑے مرتے ہیں دنیا پر — مکانِ خیر یہ تکرار ناحق ہے مکینوں میں

محبت میں جنھیں محرومئ قسمت کا دعویٰ ہے — ہمیں جب دیکھتے ہیں ڈوب جاتے ہیں پسینوں میں

تمھاری خو میں کچھ تھوڑی وفاداری اگر ہوتی — خدا شاہد ہے ہوتے ایک تم لاکھوں حسینوں میں

جگہ وہ کونسی ہے، جو نہیں ہے قابلِ سجدہ — مگر ہاں شرط یہ ہے، شوقِ سجدہ ہو جبینوں میں

وہ ہم سے دو گھڑی کو بھی بچھڑتے ہیں تو اب ہمکو — یہی معلوم ہوتا ہے کہ آئے ہیں مہینوں میں

ذرا دیکھو تو سج دھج اپنے سودائی گیسو کی — گریباں ہے جو دامن میں، تو دامن آستینوں میں

ترے عشاق کی ہمت کو کوئی پا نہیں سکتا — یہ ہی وہ ہیں جو اکثر آگ رکھ لیتے ہیں سینوں میں

دلوں میں خواہشیں رکھ کر، سکونِ قلب کیا معنی! — سکوں کیا ہو اُسے جو سانپ پالے آستینوں میں

تصور کو خدا رکھے فراق و وصل یکساں ہیں — نہیں ہیں وہ تو ہے اُن کا تصور ہمنشینوں میں

مقابل ہو نہ آئینہ، تو کون اُنکا مقابل ہو — رہا ہے یہ حسینوں میں پلا ہے نازنینوں میں

یہ وہ موتی ہیں جن پر قلزمِ دل ناز کرتا ہے — کسی کی یاد کے آنسو ہیں میری آستینوں میں

ابھی ضبطِ فغاں کو کچھ بہت مدت نہیں گذری — نظر آنے لگا کچھ فرق سا اُنکے قرینوں میں

نہ کیوں رشک و حسد ہمکو ہو، خالِ روئے روشن پر — کہ آخر یہ بھی ظالم ہیں کسی کے خوشہ چینوں میں

کسی کا رنج ہو اپنا سمجھتے ہیں اُسے نشتر
کسی کے اشک ہوں، لیتے ہیں اپنی آستینوں میں

۱۳۳ — ۱۸

میرا قصور تھا، کہ نظر کا پتہ نہیں — دیکھا ہے جب سے اسکو، جگر کا پتہ نہیں
میری شبِ فراق کی کسطرح صبح ہو — یہ رات وہ ہے جسکی سحر کا پتہ نہیں
اُمیدوار بزم میں بیٹھے ہیں ہر طرف — کس کی طرف اُٹھیگی نظر کا پتہ نہیں
آوارہ بہار سے گھر کا پتہ نہ پوچھ — گھر کیا بتائے وہ جسے گھر کا پتہ نہیں
صحرا سے لے چلی مجھے یادِ وطن کدھر — جاتا ہوں گھر، مگر مجھے گھر کا پتہ نہیں
لیکر چلا ہوں محفلِ جاناں میں نذر کو — نالے وہ چند جن میں اثر کا پتہ نہیں
اُس کا پتہ نہیں ہے، یہ کہنا نہیں صحیح — راہِ طلب میں اہلِ نظر کا پتہ نہیں
نالے تو خیر تھے ہی تاثر سے بے نیاز — کمبخت آہ میں بھی اثر کا پتہ نہیں
اللہ رے تیرگی میری شامِ فراق کی — نشتر کہیں فلک پہ قمر کا پتہ نہیں

۱۳۴ ۹

حیران کون کہیں ہے، تو دیوانہ گر کہیں — کچھ ہے کہیں نظر تری، کچھ ہے نظر کہیں
ہٹتے نہ پاس سے مرے، شام و سحر کہیں — رہتے وہ رات دن مرے پیشِ نظر کہیں
دیکھے تو کوئی عہدِ جوانی کی مستیاں — یہ حال ہے قدم ہیں کہیں اور نظر کہیں
محدود ہو گئی ہے ہماری نگاہِ شوق — ہوتی وسیع اور بساطِ نظر کہیں
جلوہ کسی کا دیکھ کے آفت میں پڑ گئے — اب ہم کہیں ہیں اور ہماری نظر کہیں
آنکھوں کی جستجو کا جو عالم یہی رہا — مل جائیگی ہماری تمہاری نظر کہیں
مشکل ہے مرکزیتِ نظارہ جمال — اُنکی نظر کہیں ہے، ہماری نظر کہیں

اے آفتاب تو ہے تماشائیِ جہاں
مجھ سا بھی دوسرا ہے خرابِ نظر کہیں

جلوہ سا آرہا ہے نظر، دلمیں دوست کا
ایسا نہ ہو کہ ہو یہ فریبِ نظر کہیں

خوئے نگاہِ شوق ہے، ہر وقت دیکھنا
اور دیکھنا اُسے جو نہ آئے نظر کہیں

کیا پوچھتے ہو ہم سے مزے حسنِ یار کے
ذرات ہم کہیں ہیں ہماری نظر کہیں

ہم، اور کوہِ طور سے ناکام لوٹتے
ڈر تھا کہ لگ نہ جائے تمھیں کو نظر کہیں

آتا ہوں بزمِ یار سے معمورِ حسنِ یار
لگجائے آج مجھکو نہ میری نظر کہیں

تکمیلِ آرزو کا زمانہ قریب ہے
تھوڑی جو اور بڑھ گئی حدِ نظر کہیں

اندازِ اُنکی مست نگاہوں کے الاماں!
شاید گرائی جائیگی برقِ نظر کہیں

جلووں کی ماہیت کیلئے کس پاس جائیں
آتا نہیں نظر کوئی اہلِ نظر کہیں

اُس دن کے انتظار میں رہتے ہیں اتدن
اِک طورِ نو بنائے وہ برقِ نظر کہیں

اے نشتر ایک شہرِ خموشاں کو چھوڑ کر
١٣٥ دُنیا میں ہم کو امن نہ آیا نظر کہیں ١٧

آتی نہیں ہے زیست کی صورت نظر کہیں
کیا ہوگا آج بھی نہ وہ آئے اگر کہیں

ہو عشق میں ملک سے زیادہ بشر کہیں
مٹجائے اُسکے دل سے جو مرنیکا ڈر کہیں

وحشت زدوں کے ہوتے ہیں دُنیا میں گھر کہیں
دُنیا میں اُنکی شام کہیں ہے سحر کہیں

آجائے شام تک وہ حسیں میرے گھر کہیں
ہوجائے کامیاب، دُعائے سحر کہیں

اے دل دُعا پہ مجھ کو نہ مجبور کر فضول
ہوتا ہے عاشقوں کی دُعا میں اثر کہیں

آؤ خدا کیواسطے بیمارِ غم کے پاس
ہو جائے اسکا قصۂ غم مختصر کہیں

دُنیا بھری ہوئی ہے بشر سے جو دیکھئے
اور ڈھونڈیئے تو شاذ ملیگا بشر کہیں

کیا لطف دے رہا ہے مجھے انتظارِ دوست
ہو اب خدائی بھر میں یا رب سحر کہیں

کھٹکا ہمیں ذرا بھی نہیں بازپُرس کا
دھوکا مگر نہ حشر میں دے چشمِ تر کہیں

انسان ہوکے ہم کو وطن کا نہیں خیال
رہتے کہیں ہیں اور ہمارا ہے گھر کہیں

ہوتے یہ ساتھ ساتھ تو کچھ اور لطف تھا
دل رکھدیا خدا نے کہیں اور جگر کہیں

جب سے ہمارے شام و سحر عشق کے گئے
اب ہے نمودِ شام، نہ چاکِ سحر کہیں

عقبیٰ میں ہے طلب، کبھی دُنیا کی دعوتیں
آخر ہمیں بتاؤ گے، رہنے کا گھر کہیں؟

بیمارِ غم ہیں ہم کو تڑپنے سے کام ہے
کرتے ہیں ہم غریب دعائے سحر کہیں

رہ رہ کے ہر ستم پہ گذرتا ہے یہ خیال
آجائے ایک روز دعا میں اثر کہیں

جو کچھ ہے جسکا حق وہ ہی مقسوم ہے اُسے
ہوتا ہے دل کا درد نصیبِ جگر کہیں

بدقسمتی سے باغِ تمنا وہ باغ ہے
جسمیں نہیں ہے دخلِ نسیمِ سحر کہیں

کل سے اب اعتبار نہ اُنکا کرینگے ہم
ہو جائے آج شب تو الٰہی سحر کہیں

ممکن نہیں کہ حُسن و وفا ساتھ ساتھ ہوں
ہوتے ہیں اک مقام پہ شام و سحر کہیں

ہو رائیگاں نہ محنتِ بیداریٔ فراق
لگ جائے میری آنکھ نہ وقتِ سحر کہیں

کوسوں پتہ نہیں ہے سحر کا شبِ فراق
دیں دغا ہمارے دل ہی فریبِ سحر کہیں

اللہ گردشیں سی ہیں کیوں آج درد میں
کچھ دل سے فاصلے پہ قریبِ جگر کہیں

آخر وہ کیوں تڑپ کے نہ آتے ہمارے پاس   خالی کبھی گئی ہے دعائے سحر کہیں
کی آنکھ بند، شہرِ خموشاں کی راہ لی   اتنا ہے کوئی اور بھی آساں سفر کہیں
دعوائے عشق کیا کوئی نشترؔ کرے یہاں
١٣٦ سودائے عاشقی ہے سزاوارِ سر کہیں ٢٥

سوز سے لبریز دل کا ساز سُن   آ سُناؤں درد کی آواز سُن
سوز سُن یا ساز ہو تو ساز سُن   وہ تجھے جس طرح دی آواز سُن
اپنے آنکھوں کی بھی حیلہ ساز سُن   گفتگوئے دیدۂ غمّاز سُن
سوز سے اکدن بدل کر ساز سُن   درد میں ڈوبی ہوئی آواز سُن
سوز سُن اس سے، اسی سے ساز سُن   ہر طرح کی دل میں ہے آواز سُن
اپنے دل کا بھی کبھی دن ساز سُن   آ رہی ہے غیب کی آواز سُن
چھوڑ دے اے دل دوئی کا واہمہ   ایک ہی کو دیکھ ایک آواز سُن
دیکھ ہر ذرّے سے آتی ہے صدا   سُننے والے عشق کی آواز سُن
آ رہا ہوں میں حریمِ ناز سے   مجھ سے رودادِ حریمِ ناز سُن
لے چلے صیاد تیری قید سے   اب ذرا افسانۂ پرواز سُن
جلوہ ہائے عارضِ محبوب دیکھ   اور رودادِ حریمِ ناز سُن
اور آوازیں جہاں سُنتا ہے تو   دل کی بھی اکدن کبھی آواز سُن
دے اجازت گر تجھے تیرا غرور   التجائے کشتگانِ ناز سُن

جھیل تنہا اپنے اوپر آفتیں — عشق میں ملتا نہیں دمساز سُن
بتلائیے دیر و کعبہ کیوں ہے تو — بیٹھ گھر میں قلب کی آواز سُن
میں پکارے جاؤں گا یونہی تجھے — اب نہ سُن تو یا مری آواز سُن
دلکی آوازیں نہیں آتی ہیں یوں — کان اپنے بند کر، آواز سُن
بے نیازِ عشق اور پھر اسقدر — حُسن پر کرتے نہیں یوں ناز سُن
عشق کو میرے حقارت سے نہ دیکھ — اِسپہ قرباں ہیں ترے سو ناز سُن
شمع پر آجائیگا الزامِ خوں — سُن، اسے پروانہ جانباز، سُن
یوں نہیں سنتے صدائے سازِ دل — ہو کے مطلق گوش بر آواز سُن
تو ہو، میں ہوں، دوسرا کوئی نہ ہو — ایک دن میری بہ ایں انداز سُن
کہہ نہ دُنیا سے ہمارا رازِ عشق — اتنی بات اے دیدۂ غماز سن
آ، محبت کا مری انجام دیکھ — آ، مرا افسانہ، آغاز سُن
آ، کہ دم ہونٹوں پہ ہے، او بیوفا — آج میری آخری آواز سُن
دل سے کیوں ہٹتا ہی آتا دور دور — پاس آکر دور کی آواز سُن
یہ زمانہ تجھ کو بھی دیگا فریب — تو نہ سُن، یا اے زمانہ ساز سُن
شادی و غم میں نہ کر کچھ امتیاز — عقل ہے تو نغمۂ ہر ساز سُن
کبتک آخر روز یونہی قتلِ عام — اسطرف دیکھ اے نگاہِ ناز سُن
ہے اُسے بھی حسرتِ عرضِ نیاز — ایک دن نشتر کا سوز و ساز سن

۱۳۷ ۳۱

کبتک آخر دل میں رکھتے وہ غریب
اپنے نشتر کا بھی اکدن راز سُن

مری نگاہ سے اوجھل نگاہِ یار نہ ہو — نگاہِ یار مری ہے، مری ہزار نہ ہو
ستم ہے محوِ ستم گر ستم شعار نہ ہو — تڑپ ہی جاؤں جو دل میرا بیقرار نہ ہو
وصالِ یار کہاں، اگر فراق یار نہ ہو — قرار پائیگا وہ کیا، جو بیقرار نہ ہو
شبِ فراق کا دشوار کاٹنا ہو جائے — جو غمزدوں کے لئے شغلِ انتظار نہ ہو
زبانِ شوق میں دل ہی کو درد کہتی ہیں — وہ دل نہیں ہے جو ہر وقت بیقرار نہ ہو
قیام اس کو ہوا ہے نہ ہو سکیگا کبھی — خرابِ نشۂ رنگینیٔ بہار نہ ہو
بہار دیکھ مگر دیکھ اسطرح غافل — بہار جائے تو مطلق غمِ بہار نہ ہو
عجیب حال ترے عشق میں ہے اب دل کا — قرار ہی نہیں آتا جو بیقرار نہ ہو
کبھی وہ دن تھے کہ ڈرتا تھا بیقراری سے — اور اب دعا ہے کہ یارب کبھی قرار نہ ہو
جب آیا موسمِ گل، ہم اسیرِ دام ہوئے — ہماری طرح کوئی مجرمِ بہار نہ ہو
دلِ فسردہ کو منظور دیکھنا ہو اگر — چمن کو دیکھ لو، جب عالمِ بہار نہ ہو
ملال ہی سے خوشی کی ہے قدر دنیا میں — تمیز کیا ہو خزاں کی اگر بہار نہ ہو
یہ ہے تقاضۂ رحمت، یہ ہے نویدِ کرم — گناہگار نہ ہو کر۔ گناہگار نہ ہو
خزاں کے بعد نہ آیا کرے اگر کمبخت — بہار کہتے ہیں جس کو، کبھی بہار نہ ہو
خدا کرے خلشِ آرزو رہے باقی — خدا کرے ترے وعدے پہ اعتبار نہ ہو

۱۳۸ ۱۶

فراقِ یار میں وہ سرخوشی کہاں نشتر
بہار کوئی مناتا ہے، جب بہار نہ ہو؟

یارب یہ مرا دردِ نہاں، دردِ نہاں ہو
یہ کیا کہ رہوں چپ بھی تو صورت سے عیاں ہو

کہتے ہیں نہ کر آہ، نہ سرگرمِ فغاں ہو
کیوں عشق کرے جس کو غمِ عشق گراں ہو

اُس بزم میں چلنا ہے تو اسطرح چل ای دل
آنکھوں میں تری اشک ہوں ہونٹوں پہ فغاں ہو

اے دل غمِ جاناں بھی ہے اک جزوِ محبت
ایسا ہے کہاں باغ جو محفوظِ خزاں ہو

کعبے میں کلیسا میں نہ محدود رکھ اس کو
یارب وہ نظر دے جو بہ ہر سو نگراں ہو

اللہ رے افسردگیٔ خاطرِ محزوں
آئے جو بہار اسمیں تو آتے ہی خزاں ہو

ابتک ہے مجھے یاد نشیمن کی تباہی
ڈرتا ہوں کہ جگنو نہ کہیں برقِ تپاں ہو

خوشیوں نے، ترے غم کا مزہ چھین لیا ہے
دل والوں کے رہنے کو کوئی اور جہاں ہو

چکر میں یہ ہستی و عدم کے ہے ہمیشہ
انسان کو آرام یہاں ہو نہ وہاں ہو

ای کاش ترے غم میں مرا حال یہ ہو جائے
جو بات کروں میں وہ ہی ہمرنگِ فغاں ہو

جب چھوڑ چکا بلبلِ ناشاد گلستاں
اب آگ لگے چاہے گلستاں میں دھواں ہو

دل تو نے لیا ہے تو یہ لے درد بھی اپنا
دل ہی نہیں پہلو میں تو اب درد کہاں ہو

اِن شوخ حسینوں سے مروّت کی گذارش
تالاب کے پانی سے ہے کہنا کہ رواں ہو

اِس موسمِ گُل میں یہ اسیری کی مصیبت
چھا جائے جو گلشن پہ تو احسانِ خزاں ہو

اس باغِ جہاں کے لئے کیوں جان دے کوئی
وہ باغ بھی کیا باغ جو ہمرنگِ خزاں ہو

میں دیکھ رہا ہوں تجھے کچھ دور سے دل میں — اب ہو یہ حقیقت کہ مرا وہم و گماں ہو

دل اور جگر درد سے تیرے نہ ہوں محروم — ہوتی ہے اک ٹیس یہاں ہو کہ وہاں ہو

گھبرائیں گے کیوں آپ کے غم سے دلِ عشاق — حق یہ ہے نہ ہو غم تو گذارا بھی کہاں ہو

بے میل خوشی کی ہے تمنا جسے نشتر
جو بارے گلستاں ہو کہ مصئونِ خزاں ہو

۱۳۹ — ۱۶

وہیں لے چل اے دلِ مضطرب، جہاں اُنکی محفلِ ناز ہو
جہاں ساز داخلِ سوز ہو، جہاں سوز شاملِ ساز ہو

مرے دل پہ اب وہ نگاہ ہو، کہ جو مجھ کو مایۂ ناز ہو
ترے نغمے روح نواز ہیں، تو اُسی لحاظ سے ساز ہو

جو یہ بُت حسیں ہیں تو قسمتیں بھی نہایت انکی حسین ہیں
یہ کریں ستم تو وہ ہو ادا، یہ کریں جفا تو وہ ناز ہو

یہی دل کی ہے مرے آرزو، نہیں اور کچھ مجھے جستجو
ترے پاؤں پر ہو مری جبیں، ترا در ہو فرقِ نیاز ہو

مری احتیاط سے اور بھی، مرے راز راز نہ رہ سکے
کہیں یہ نہ واقفِ راز ہو، کہیں وہ نہ واقفِ راز ہو

وہ کریں ستم کہوں مرحبا، وہ کریں جفا تو کروں وفا
اُنھیں اپنے دل پہ جو ناز ہے، مجھے اپنے دل پہ بھی ناز ہو

نہ ہے دیر سے مجھے دشمنی، نہ حرم سے کوئی خصوصیت
وہیں کیوں نہ پڑھ لوں نماز میں، جہاں مجھکو وقت نماز ہو

مجھے تاب ضبط کی اب نہیں، میں تو آہ کرتا ہوں ہمنشیں
جو زمانہ واقفِ راز ہو، تو بلا سے واقفِ راز ہو

نہ کرونگا دل کی کہی کبھی، نہیں اعتبار اب اسپہ بھی
یہ ہمیشہ کہتا ہے اُنکی سی، کہیں اِس سے اُن سے نہ ساز ہو

اُسے دل میں اپنے ڈھونڈلے، تو سکونِ قلب تجھے ملے
کبھی کعبہ کی کبھی دیر کی، نہ یہ رات دن تگ و تاز ہو

مجھے قیدِ راہِ سلوک سے، مرا ہوش لیکے رہا بھی کر
نہ مجھے خیالِ سجود ہو، نہ مجھے خیالِ نماز ہو

یہی ایک خواہشِ دل ہے اب، یہی ایک دلکی ہے آرزو
کہ جو تیرے در سے نہ اُٹھ سکے، وہ مری جبینِ نیاز ہو

تجھے رونے سے تو اے چشمِ تر، نہیں روکتا میں تو رو، مگر
کہیں ہو نہ جائیں وہ بدگماں، کہیں فاش میرا نہ راز ہو

جنھیں لطفِ لذّتِ غم نہ ہو، وہ دعائیں صبح کی مانگ لیں
مری التجا ہے کہ اے خدا، شبِ ہجر اور دراز ہو

ہوئیں مدّتیں کہ یہ غم ترا، دلِ زار میں ہے گھٹا ہوا

کوئی اب تو واقفِ راز ہو، کوئی اب تو محرمِ راز ہو

ہمیں ایک عمر گذر گئی، کہ تڑپ رہے ہیں فراق میں
کسی دن ہمارے لئے بھی اب، کوئی حکم بندہ نواز ہو

کروں یاد تیری میں جس گھڑی، تو اک آنسوؤں کی لگے جھڑی
مری چشمِ خشک کو اشک دے، کہ وضو کے ساتھ نماز ہو

میں حقیقی عشق کو کیا کروں، کہ ہے ظرف اتنا کہاں مرا
مرے بس کا ہے یہ جبھی کہ اسمیں لطیفِ رنگِ مجاز ہو

کہیں نشتر آئے بھی وہ گھڑی، ہے اسی کی آس لگی ہوئی
۱۴۰ کریں اپنے ہاتھ سے ذبح وہ، میں کہوں کہ عمر دراز ہو ۱۹

جب ہوئی اپنے گناہوں سے ندامت مجھکو
ہو گیا چاکِ گریباں درِ رحمت مجھکو

ہر نفس جسمیں تھا سرمایۂ عشرت مجھکو
کاش ملجائے وہ ہی دورِ محبت مجھکو

آفتِ جاں ہوئی جاتی ہے محبت مجھکو
مفت کا روگ دیا، دیکھئے یہ نعمت مجھکو

وجہِ آسودگیِ دل نہیں دولت مجھکو
جب بنے بات کہ ہو جائے قناعت مجھکو

ہو گئی ہے جو ترے درد کی عادت مجھکو
کوئی زحمت نظر آتی نہیں زحمت مجھکو

کچھ زباں سے نہ کہا حشر میں دیکھا جو انھیں
ہائے کس وقت یہ آئی ہے مروت مجھکو

لذتِ قیدِ قفس تونے یہ کیا سحر کیا
باغ کے نام سے ہونے لگی وحشت مجھکو

کیفیت مستیِ آزارِ محبت کی نہ پوچھ
کبھی سوجھا ہی نہ انجامِ محبت مجھکو

رات دن ہیں وہ جفائیں کہ الٰہی توبہ
سمجھے بیٹھے ہیں وہ مجبورِ محبت مجھکو

تو نے اے عشق مجھے واقفِ احساس کیا
پہلے معلوم نہ تھی درد کی لذت مجھکو

خواہیں تو نے سنے ہونگے نہ اتنے واعظ
جتنے معلوم ہیں اسرارِ محبت مجھکو

رازِ دل جب سے چھپانے کی مجھے فکر ہوئی
نظر آیا وہ ہی ہمرازِ محبت مجھکو

جنکو اصرار ہے مجھ سے کہ نہ دوں جان اپنی
وہ ہی جینے کی بتا دیں کوئی صورت مجھکو

پھینکدوں دلکو اگر تم مری تائید کرو
نہ ضرورت تمھیں اسکی، نہ ضرورت مجھکو

مجھ سے دنیا کا کوئی ذکر نہ للّٰہ کرے
خوب معلوم ہے دنیا کی حقیقت مجھکو

کاش رستہ میں پڑتا ہو نہ گلشن کوئی
جس طرف لیکے چلی ہے مری وحشت مجھکو

کم نگاہی سے طبیعت نہیں بھرتی میری
چاہیے جور بہ مقدارِ محبت مجھکو

فاش اسرارِ محبت میں جہاں بھر کر دوں
غیرتِ عشق جو دیدے تو اجازت مجھکو

وہ وفائیں نہیں کرتے تو خطا کیا اُنکی
کرنی آتی نہیں دراصل محبت مجھکو

تم جو کچھ روز دکھاتے نہیں صورت اپنی
زندگی کی نظر آتی نہیں صورت مجھکو

میں نہ کہتا تھا کہ دن رات جفائیں نہ کرو
اب ندامت ہوئی تمکو کہ ندامت مجھکو؟

غم سے گھبراؤں محبت میں تو کیوں گھبراؤں
رفتہ رفتہ یونہی ہو جائیگی عادت مجھکو

حسبِ دلخواہ میں تقدیر بنا لوں اپنی
اتنی قدرت تو دے اے مالکِ قدرت مجھکو

عرصۂ حشر میں خالق سے اُنھیں مانگ لیا
دیکھتے رہ گئے سب اہلِ قیامت مجھکو

اپنی قسمت پہ نہ کیوں ناز کروں میں نشترؔ

۱۴۱ وہ سمجھتے ہیں گنہگارِ محبّت مجھکو ۲۵

کیا ہے عشق تو نشترؔ بنا ہو — پھر آگے جو بھی منظورِ خدا ہو
مجسّم آج تم حُسن و ادا ہو — کہیں دیکھو نہ کوئی دیکھتا ہو
فنا ہر شخص اگر قبلِ فنا ہو — تو دنیا روز کیوں نذرِ قضا ہو
ہم اب چپ ہیں، وفا ہو یا جفا ہو — کہاں تک کوئی مصروفِ دُعا ہو
الٰہی درد وہ دل کو عطا ہو — نہ جس کی حد نہ کوئی انتہا ہو
محبّت میں قیامت کا مزا ہو — اگر سینے میں دل درد آشنا ہو
شریکِ حال اگر فضلِ خدا ہو — ہماری گمرہی خود رہنما ہو
وہ کیوں کہنے لگا مجھ سے، وفا ہو — جفا کا لُطف جس کو آچکا ہو
نہیں اس کے سوا کوئی تمنّا — جدھر دیکھیں تمھارا سامنا ہو
جفاؤں سے نہ رکھ محروم مجھکو — وفا بھی ہو تو ہمرنگِ جفا ہو
ترے ہوتے تو ہے دنیا کا یہ حال — یہاں گر تو نہ ہو تو جانے کیا ہو
مرے سجدے ہوں اور تصویرِ جاناں — کوئی آجائے ایسے میں تو کیا ہو؟
جفاؤں پر وفائیں کر رہا ہوں — کوئی مجھ سا نہ مجبورِ وفا ہو

اُسے کیا درد کا احساس نشترؔ
جو بالکل درد بنکر رہ گیا ہو

۱۴۲ ۱۴

ہوس بہشت کی مجھکو، نہ حُور کی مجھکو — عزیز جان سے بڑھکر ہے بیخودی مجھکو

ہنسی کے وقت اگر آئیگی ہنسی مجھ کو
تو غم کیو قت ہے رونا بھی لازمی مجھکو

خدا نے دی ہے محبت تو کاش یوں بھی ہو
نہ بے بسی ہو تمھیں کچھ، نہ بے بسی مجھکو

ہزار عیب سہی مجھ میں یہ ہنر بھی ہے
کسی کے رونے پہ آتی نہیں ہنسی مجھکو

اسی کو دیکھ کے کھاتے ہیں رحم وہ مجھ پر
عزیز کیوں نہ ہو میری یہ بیکسی مجھکو

خوشی سے سیر طبیعت، نہ غم سے آسودہ
غضب میں ڈالے ہوئی ہے یہ زندگی مجھکو

تری زبان ہے واعظ، جو دل میں ہو کہہ لے
نہ میکشی کو میں چھوڑوں نہ میکشی مجھکو

نہ جانے اس سے کبھی ہو گی یا نجات نہیں
خدا سے دور نہ کر دے مری خودی مجھکو

جو ایک رنگ سے چھوڑوں بھی میں تو کیا واعظ
ہزار رنگ سے آتی ہے میکشی مجھکو

ذرا سی بات تھی پھر بھی میں سمجھ نہ سکا
ہزار نطق سے بہتر تھی خامشی مجھکو

پتہ بتاتے نہیں ٹھیک ٹھیک کیوں اپنا
پھرا رہے ہو ازل سے گلی گلی مجھکو

قدم قدم پہ جسے ہے فنا کا اندیشہ
یہ زندگی میں کوئی دی ہے زندگی مجھکو

خوشی جو آئی ہے ہمراہ رنج لائی ہے
خوشی کیطرح ہوئی ہی نہیں خوشی مجھکو

بہ فیضِ حضرتِ سیماب اکبر آبادی
جو دیر مشق ہیں کہتے ہیں منتہی مجھکو

خوشی مناؤں میں اس زندگی پہ کیا نشتر
دکھائی دیتی ہے ہستی میں نیستی مجھکو

۱۴۳ 15

پردے سے باہر آکے مقابل تو کوئی ہو
محفل کے ساتھ صاحبِ محفل تو کوئی ہو

پوشیدہ اک حجاب میں ہے وہ تو رات دن
دیکھیں کسے، ہمارے مقابل تو کوئی ہو

نادان ہیں وہ جو کہتے ہیں منزل کو دور ہے
منزل تو یہ ہے، طالب منزل تو کوئی ہو

ہم تو ہزار بار محبت کو چھوڑ دیں
اس بحر بے کنار کا ساحل تو کوئی ہو

مرتا نہیں ہے کون شہادت کیواسطے
جانیں تو سب کے پاس ہیں قاتل تو کوئی ہو

کس آستاں پہ جائیں ترے آستاں سے ہم
دنیا میں اس کا مدِمقابل تو کوئی ہو

یوں تو شبِ فراق کو باتوں میں کاٹ دوں
میرا شبِ فراق میں شامل تو کوئی ہو

ہشیار میں کسیکو بتاؤں تو کس طرح
اپنے سے پہلے آدمی غافل تو کوئی ہو

دریا میں کوئی کیسے اتر جائے بے دھڑک
ہمت دلانے کو لب ساحل تو کوئی ہو

کس آرزو کو پھینک دوں دل سے نکال کر
کمبخت پھینک دینے کے قابل تو کوئی ہو

امید اسکے رحم و کرم کی فضول ہے
پہلے وفورِ عشق سے بیدل تو کوئی ہو

کس شخص پر کروں میں زمانے میں اعتبار
دنیا میں اعتبار کے قابل تو کوئی ہو

ہر وقت ہیں بہار کی رنگینیاں وہی
رنگینئ بہار کے قابل تو کوئی ہو

جلوہ وہی ہے، طور وہی ہے، تجلی طور بھی
لیکن نگاہِ دید کے قابل تو کوئی ہو

نشتر خود آکے خالق دل اسمیں ہو مکیں
کہتے ہیں جس کو دل وہ مگر دل تو کوئی ہو

۱۴۴ ۱۵

یہ ٹوٹے ہوئے دل کا مرے ساز تو دیکھو
نغمے تو سنو اسکے اور آواز تو دیکھو

صد گونہ مصائب کا ہے باعث یہ غمِ عشق
اسپر بھی غمِ دل یہ مرا ناز تو دیکھو

ہے گوش بر آواز مرا دل کہ نہیں ہے
تم دیکے کسیدن اسے آواز تو دیکھو

پر ٹوٹے ہوئے اور اسیری کی یہ قیدیں
اسپر مری بیتابیٔ پرواز تو دیکھو

دل توڑ دیا تم نے کہیں سے مرا شاید
ہے مضمحل آواز، ذرا ساز تو دیکھو

ہر چند پر و بال ہیں ٹوٹے ہوئے میرے
پھر بھی یہ مری ہمتِ پرواز تو دیکھو

دُنیا کی جو سُنتا ہے، تمہاری بھی سُنیگا
تم دیکے کسی دن اُسے آواز تو دیکھو

ہم سامنے آنکھوں کے ہیں اور تشنۂ مستی
ساقی کی نگاہوں کا یہ اعجاز تو دیکھو

ہیں دونوں جہاں عالمِ پرواز میں میرے
اے اہلِ چمن وسعتِ پرواز تو دیکھو

گو خوب سمجھتا ہے کہ وہ دل میں مکیں ہے
انسان کی لیکن یہ تگ و تاز تو دیکھو

ہر وقت تبسم ہے مرے حالِ غلط پر
تم اپنی نگاہِ غلط انداز تو دیکھو

کچھ بھی تو نہیں بلبلِ ناچیز کی ہستی
ظالم کا مگر نالۂ غم ساز تو دیکھو

مونس ہے کبھی رنج، تو ہمدم ہے کبھی یاس
خلوت کے مری، ہمدم و دمساز تو دیکھو

ہے راز مرا اور مجھی کو نہیں معلوم
اللہ رے مرا راز، مرا راز تو دیکھو

میں اپنے تصور میں کہاں جا نہیں سکتا
بے پر ہوں مگر قوتِ پرواز تو دیکھو

میخانے سے آتے ہیں مگر حضرتِ نشتر
لغزش کی ذرا آپ کے انداز تو دیکھو

۱۴۵ ۱۶

یوں بھی کچھ دن عاشقی میں اے دلِ ناشاد ہو
ایک دن بالکل خموشی ایک دن فریاد ہو

واقعی سُننا اگر تم کو مری فریاد ہو
سُن لو جس دن میں ہوں، تم ہو، اور دلِ ناشاد ہو

پوچھتے ہیں وہ فسانہ، اور میں تکتا ہوں مُنہ
کیا کہوں اپنا فسانہ، جب نہ مجھکو یاد ہو

آدمی کا خون کردو، تو نہیں اتنا بُرا — حسرتوں کا خون کرتے ہو بڑے جلّاد ہو

کِس کی ہمّت ہے جو اُنکے سامنے کچھ کہہ سکے — حکم ہے اُنکا ہمارے سامنے فریاد ہو

بندہ پرور ہم ستم ایجاد جب سمجھیں تمھیں — جب ہمارے واسطے روز اک ستم ایجاد ہو

کوئی اِن دو میں اسیری کا ہی میری ذمہ دار — آرزوئے قید ہو، یا خاطرِ صیّاد ہو

سب کو ہے فکرِ رہائی، مجھکو یہ ہر وقت فکر — کوئی اکدن یہ نہ کہدے جاؤ تم آزاد ہو

مطمئن کیا ہوں تمہاری دعوتِ دیدار سے — طُور پر محروم رکھا تھا جو تم کو یاد ہو

لُطفِ ضبطِ غم سمجھ جائے اگر دُنیائے عشق — کیوں فغان و آہ ہو کیوں نالۂ و فریاد ہو

اہل ہے تیری محبّت کا اگر کوئی، تو وہ — روز تیرے جور جس کو بھُول جانا یاد ہو

اسقدر دُھندلا ہے ابتو کیفِ ماضی کا خیال — مدّتوں کی جیسی اک بھُولی ہوئی سی یاد ہو

آج انجامِ محبّت آکے وہ دیکھے مرا — جس کو آغازِ محبّت کا زمانہ یاد ہو

ہمکو ضبطِ غم نے دے رکھا ہے سب کچھ عشق میں — وہ کرے فریاد جو وارفتۂ فریاد ہو

حضرتِ دل چاہتے ہیں حسن والوں سے وفا — اک نیا عالم اب اُنکے واسطے ایجاد ہو

پھینکنا اُس شوخ کو چاروں طرف تیرِ نظر — عشق کی دُنیا اگر برباد ہو، برباد ہو

یہ کرشمہ کون دیکھے عشق والوں کے سوا — دل نہ پہلو میں رہے اور دل میں کیسی یاد ہو

لیتی رہتی ہے مرے دلمیں برابر چٹکیاں — بے خود فراموشی تمھاری ہو کہ میری یاد ہو

خُلد کی خواہش نہیں نشتر جو خواہش ہے تو یہ — لکھنؤ ہو، ہم ہوں، فرصت ہو، امین آباد ہو

کبھی اس شکل سے بھی انقلابِ چرخِ گرداں ہو
فلک پر چاندنی ہو اور زمیں پر ماہِ تاباں ہو

کبھی تو بھول کر اپنے گناہوں پر پشیماں ہو
بنایا ہے تجھے فطرت نے جب انساں تو انساں ہو

وہ خواہش دید کی ہو، یا ترے ملنے کا ارماں ہو
جو مہماں ہو وہ مہمانوں کی صورت دل میں مہماں ہو

ہمارے غم جبھی تک غم ہیں، جب تک غم سمجھتے ہیں
جو ہم چاہیں تو زنداں بھی ہمیں صحنِ گلستاں ہو

ذرا بادِ صبا بکھرا تو دے اُس زلفِ مشکیں کو
پریشاں جس سے دنیا ہے، کبھی وہ بھی پریشاں ہو

تمنائیں محبت کا مزہ لینے نہیں دیتیں
مزہ جب ہے کہ دل میں کوئی حسرت ہو نہ ارماں ہو

زیادہ فکر کیوں شاخِ نشیمن کی کروں گلچیں
مجھے شاخِ نشیمن ہے، کوئی شاخِ گلستاں ہو

گھٹا گھر کر کہیں ایسے میں آ جائے تو اے ساقی
ہماری بادہ خواری کے لئے تائیدِ یزداں ہو

کہاں دیر و حرم کے پھیر میں رکھتا ہے تو مجھکو
وہاں لے چل جہاں اے دل زمیں کوئے جاناں ہو

بلائیں رات دن ناحق لپکتی ہیں مری جانب
وہ کیوں ڈرنے لگا اُن سے، خدا جسکا نگہباں ہو

نشاط و غم کو سمجھو ایک، اگر دنیا میں رہنا ہے
طبیعت کا مزہ یہ ہے نہ خنداں ہو نہ گریاں ہو

وہ ہی اس خارزارِ ہستیٔ موہوم کو سمجھے
بیاباں ہو چمن جس کو، چمن جسکو بیاباں ہو

وہ ہرجائی ہے اے نشتر تو ایسا کیوں نہیں ہوتا
۱۴۷ میں جس تصویر کو دیکھوں، وہ ہی تصویرِ جاناں ہو ۱۳

کس رنگ میں ہے حسن کی تصویر نہ پوچھو
اب دل کا مرے عالمِ تنویر نہ پوچھو

کیا چیز ہے انسان کی تقدیر نہ پوچھو
کس درجہ ہے غارتگرِ تدبیر نہ پوچھو

قسمت کی ہی یا دل کی ہے تقصیر نہ پوچھو
کیوں عشق میں رہتا ہوں میں دلگیر نہ پوچھو

جس روز مرے دل سے نکلتی ہے یہ کمبخت — اُس روز مری آہ کی تاثیر نہ پوچھو
کیا اس نے لکھا ہے مری تقدیر میں دیکھو — کیا بھول گیا کاتبِ تقدیر نہ پوچھو
ایسا نہ ہو تقصیرِ محبت کی ہو توہین — ہر شخص سے تقصیر کی تعزیر نہ پوچھو
تعزیر جو دینی ہو تمھیں شوق سے دے لو — مجھ سے مری مجبوریٔ تقصیر نہ پوچھو
محمول مقدّر پہ کرو میری تباہی — اس شوخ کی تھی یا مری تقصیر نہ پوچھو
کیا عشق تھا کیا عشق کا انجام ہوا تھا — کیا خواب تھا کیا خواب کی تعبیر نہ پوچھو
میرا ہی جگر ہے کہ انھیں جھیل رہا ہوں — کیا کیا ہے جفائے فلکِ پیر نہ پوچھو

ہوں پھیر میں جب سے نگہِ مست کے نشتر
۱۴۸ اُس دن سے مری گردشِ تقدیر نہ پوچھو ۱۱

چشمِ ساقی روبرو ہونے تو دو — دل کو خم خم سے سبو ہونے تو دو
حضرتِ دل کرکے اشکوں کو شریک — اب نمازیں باوضو ہونے تو دو
خود نکل جائیگی دل سے ایک دن — آرزو کو آرزو ہونے تو دو
ہم بھی میخانے سے آتے ہیں ابھی — جمع سامانِ وضو ہونے تو دو
کون پھر ہمت کریگا دید کی — ذکرِ ایمن، چار سو ہونے تو دو
بے نیازی دیکھ لینگے اُن کی ہم — ہم کو اُن کے روبرو ہونے تو دو
منزلِ مقصود بھی مل جائیگی — اشتیاقِ جستجو ہونے تو دو
ابتدا کرلو نمازِ عشق کی — بے وضو یا باوضو ہونے تو دو

خود چلی آئیگی رحمت ڈھونڈتی ‏— شغلِ بادہ قبلہ رو ہونے تو دو
ڈھونڈ کر اُن کو رہونگا ایک دن ‏— بیقرارِ جستجو ہونے تو دو
دُو بدو بھی ایک دن ہو جائیگی ‏— دل ہی دلمیں گفتگو ہونے تو دو

ہم بھی ہو جائینگے نشتر کامیاب
انتہائے آرزو ہونے تو دو

۱۴۹ ‏— ۱۳

مجھ کو رحم آئے، وہ ظالم بیقرار ایسا تو ہو ‏— عمر بھر میں ایک دن پروردگار ایسا تو ہو
آنے والا آئے، اور آکر چلا جائے مگر ‏— ہو نہ کچھ معلوم، کیفِ انتظار ایسا تو ہو
وہ چلے آئیں کلیجہ ہاتھ سے تھامے ہوئے ‏— آج زورِ نالۂ بے اختیار ایسا تو ہو
بادہ خواری کسطرح کی میکدے میں، کچھ نہ پوچھ ‏— میکدہ خود کہہ رہا تھا، بادہ خوار ایسا تو ہو
حُسن یہ سمجھے کہ وہ بھی عشق کا محتاج ہے ‏— اِک کرشمہ اے مرے پروردگار ایسا تو ہو
کچھ سمجھ ہی میں نہ آئے نشتر کیا چیز بھی ‏— آستیں ہو یا گریباں تار تار ایسا تو ہو
بے تکلف دُور سے ہر سنگدل کو کھینچ لے ‏— کشتگانِ عشق کا سنگِ مزار ایسا تو ہو
زندگانی میں جہاں تسکین دم بھر پا سکیں ‏— عاشقوں کا تیرے اک دار القرار ایسا تو ہو
ابر کے سائے میں بزمِ میکدہ ہو منعقد ‏— فصلِ گُل میں ایک دن جشنِ بہار ایسا تو ہو
لافنا بھی ہے، فنا بھی ہے حقیقت نفس کی ‏— اُستوار ایسا تو ہو، نا اُستوار ایسا تو ہو
آپ کے غم سے زیادہ کون مونس ہے مرا ‏— ساتھ جو دم بھر نہ چھوڑے غمگسار ایسا تو ہو
حُسن کے جلوے نگاہوں کو نہ خیرہ کر سکیں ‏— اے وفورِ اشتیاقِ دیدِ یار ایسا تو ہو

ہوں قفس کمیاب، گلشن ہی مرا زنداں بنے — اب کے فصلِ گُل میں اے پروردگار ایسا تو ہو

یوں میں **نشتر** بیقراری کا نہیں قائل کبھی
بیقراری داد خود دے بیقرار ایسا تو ہو

۱۵۰ ۱۴

کہا تھا میں نے بھلا کب، کہ تم ستم نہ کرو — مجھے دیارِ محبت میں مُتّہم نہ کرو

جفائیں کر کے زیادہ اب اُنکو کم نہ کرو — کرو تم اور ستم کوئی، یہ ستم نہ کرو

ہزار دل میں ہوں رنج و ملال غم نہ کرو — ہزار آنکھ میں آنسو ہوں، آنکھ نم نہ کرو

خدا کیواسطے بعدِ ستم، کرم نہ کرو — تسلّیٔ دلِ پُر درد، وہ ستم نہ کرو

ہمیں پہ ظلم کرو، اور کہو کہ غم نہ کرو — تلافیٔ ستم اچھی نہیں، ستم نہ کرو

ملالِ عاشقِ محزون کا کوئی غم نہ کرو — تم اِس سے کوششِ اندازہ ستم نہ کرو

کرو نہ جلوہ نمائی میں بخل بہرِ خدا — مری نگاہ کی حیرانیوں کو کم نہ کرو

جو اعتبار کرو ایک بار تم اپنا — تو اعتبار پھر اپنا، مری قسم نہ کرو

کرم نہ جھیل سکیں گے، ستم کے عادی ہیں — ستم کرو نہ کرو، ہمتِ کرم نہ کرو

خدا کیواسطے اتنا کرم کرو مجھ پہ — کسی کے کہنے سے مجھ پر کوئی ستم نہ کرو

مجھے مٹا کے مرے دل کو کیوں مٹاتے ہو — خدا کے گھر کو تو پامالِ رنج و غم نہ کرو

طریقِ عشق کہاں ہے، یہ اہلِ ناداں — میں اور اُن سے کہوں یہ کہ تم ستم نہ کرو

خدا کیواسطے اپنے خیال کو روکو — مری فراق کی تنہائیوں کو کم نہ کرو

نہ جور ہی فقط اچھے نہ ہیں کرم اچھے — کبھی ستم نہ کرو تم، کبھی کرم نہ کرو

تمہاری ظلم میں جو لذتیں ہیں، کیا کہنا
نہ جانے کیا ہو جو دو روز تم ستم نہ کرو

خدا گواہ ہے کچھ لطفِ عاشقی نہ رہے
کرم میں پنہے جو آمیزشِ ستم نہ کرو

ابھی ہے اور تڑپنے کی آرزو باقی
شبِ فراق کی طولانیوں کو کم نہ کرو

ستم کا یہ بھی طریقہ ہے کوئی بندہ نواز
ستم کرو مگر اندازۂ ستم نہ کرو

وفا و حسن کہیں ساتھ ساتھ ہوتے ہیں
خدا کیواسطے دونوں کو تم بہم نہ کرو

مرے دیارِ محبت کی حد کہاں یہ کہاں
بیانِ قصہ بتخانہ و حرم نہ کرو

جو غم کی بات ہے لاتی ہے دلمیں رنج ضرور
ہزار اسکو نہ سوچو، ہزار غم نہ کرو

سوال زندگی و موت کا ہے عاشق کی
کرو جو ترک محبت تو یک قلم نہ کرو

ابھی تو حضرتِ نشتر بڑی ہے عمر تمام
ابھی سے کوششِ اندازہ ستم نہ کرو

خوشی خوشی سے جو آئے تو یہ خوشی اسکی
خوشی نہ آئے تو نشتر خوشی کا غم نہ کرو

۱۵۱ ۲۴

ہے میکشوں کے دل میں عزمِ شراب خانہ
اے آسماں بن جا، رحمت کا شامیانہ

آ اور نکال دل سے رنج و غمِ زمانہ
قبضہ ہی تیرے گھر پہ ان سب کا غاصبانہ

اب اضطراب ان کا دیکھے ذرا زمانہ
آتی تھی نیند سُنکر جن کو مرا فسانہ

کس سے کہوں فسانہ، کیا ہی مرا فسانہ
کاہیدہ سا ترنم، خوابیدہ سا ترانہ

شاید یہی ہو انکے آنے کا اک بہانہ
لبریز غم سے ایدل، اک چھیڑ دے ترانہ

کیا کوئی اس کو سمجھے ہے رمز عاشقانہ
عاشق نے آہ جب کی، اک کہہ دیا فسانہ

موجود آج ہے جو، کل ہو وہ ہی فسانہ
دُنیا یہی، یہی ہے دُنیا کا کارخانہ

کہتا رہے زمانہ، بکتا رہے زمانہ
چھوٹا نہ ہم سے چھوٹے، واعظ شراب خانہ

اے کاش آئے ساقی، ایسا کوئی زمانہ
میکش ہوں اہلِ دنیا، دُنیا شراب خانہ

وعدہ وفا وہ کرتے، عاشق سے اپنے کیونکر
آخر تو موت کو بھی لازم تھا اک بہانہ

ہر ساز میں نہاں ہے، ہر ساز سے عیاں ہے
چھیڑا تھا جو ازل میں اُس نے نیا ترانہ

صحنِ چمن میں سُن لو جب چاہو بن میں سن لو
ہے ایک ہی ترنم، ہے ایک ہی ترانہ

اعمال پر نگاہیں پڑتی نہیں کسی کی
ہے سب کو یہ شکایت، اچھا نہیں زمانہ

اب وہ کہاں زمانہ، جب قیدِ گفتگو تھی
اب تو زبان روکی، اور کہدیا فسانہ

کیا کردیا یہ تونے، اے دیدۂ حقیقت
دُنیا اور اہلِ دُنیا، سب ہو گئے فسانہ

ہم اہل بھی چمن کے، کیا کام تھا قفس سے
لیکن کچھ اور شے ہے، تقدیرِ آب و دانہ

پہلو میں دل کہاں ہے، کچھ میں لہو کی بوندیں
کیا تیر تھا ستمگر، کیا تیر کا نشانہ

کہنا کسیکا آکر، بالیں پہ بعدِ مُردن
کچھ موت بھی تھی اسکی، کچھ مل گیا بہانہ

دونوں کا فرق زاہد، دو دن میں دیکھ لیتا
اے کاش نزدِ مسجد، ہوتا شراب خانہ

واعظ خیال میرا ہے مستِ چشمِ ساقی
کیسی شراب نوشی، کیسا شراب خانہ

ہم تو خوشی کے سپنے، ذرات دیکھتے ہیں
تھی کیا خبر، چمن سے اُٹھیگا آب و دانہ

اب کیا کسی سے کہئے روداد اپنے غم کی
رودادِ غم ہی اپنی، جب ہو گئی فسانہ

عہدِ شباب کو ہم بھولے کبھی نہ بھولیں
وہ موت کا زمانہ، وہ زیست کا زمانہ!

افسوس کان لگا کر، سُنتا نہیں ہے کوئی ہر سانس آدمی کی، کہتی ہے اک فسانہ
مرتے نہ ہم تو آخر، چارہ ہی اور کیا تھا خود زندگی تھی اپنی، مرنیکا اک بہانہ
اب اُنکا آنا جانا، اتنا نہیں ضروری ہونے لگی ہیں باتیں، اب اُنسے غائبانہ
ہے جاں کنی کا عالم آجاتے کاش وہ بھی سُن لیتے چلتے چلتے اک آخری فسانہ
قدرت سے تیری یا رب! کیا کچھ نہیں ہے ممکن لوٹ آئے پھر ہمارا گذرا ہوا زمانہ
رکھنا تھا حُسن کو جب یوں بے نیاز اُس سے کیوں دلیں بھر دیا تھا یہ سوزِ عاشقانہ

ہوں مستِ چشمِ ساقی، دن ہو کہ رات نشتر
۱۵۲ رکھتا ہوں ساتھ اپنے، اپنا شراب خانہ ۳۰

دستِ ساقی میں جام، ائے توبہ! اور واعظ حرام، ائے توبہ!
ذوقِ حُسن تمام، ائے توبہ! زیست کردی حرام، ائے توبہ!
میرے ہاتھ اور جام، ائے توبہ! مُفت کا اتہام، ائے توبہ!
سوز اور مستقل، معاذ اللہ دردِ دل اور مدام، ائے توبہ!
لاکھ پردوں میں ہے نہاں ظالم حُسن کا انتظام، ائے توبہ!
شام آتی ہے، یا پیامِ اجل نامرادوں کی شام، ائے توبہ!
اِک قدم اور سیکڑوں فتنے تیری طرزِ خرام، ائے توبہ!
آدمی ہوکے آدمی نہ ہوا خواہشوں کا غلام، ائے توبہ!
تم سے لونگا جفاؤں کا بدلہ؟ عشق اور انتقام، ائے توبہ!

وہ نظر اور بے نقاب وحجاب
تیغ اور بے نیام، ارے توبہ!
ہوش میں آکے بات کرو اعظ
میکشی اور حرام، ارے توبہ!
شمع بے نور، اُداس بام اور در
تیری فرقت کی شام ارے توبہ!
آج آنا مرا نہیں ممکن
نزع میں یہ پیام، ارے توبہ!
جس محبت پہ ناز تھا مجھ کو
اُس کا یہ اختتام، ارے توبہ!
کون دیدے نہ اس ادا پر جان
وقتِ رخصت سلام، ارے توبہ!
وہ محبت کے رات دن میرے
وہ مری صبح و شام، ارے توبہ!
تیری وعدوں سے زندگی ہی حرام
رات دن، صبح و شام، ارے توبہ!
اتنی رنگینیاں شباب میں، اور
برق کا سا قیام، ارے توبہ!
وہ نہ اپنا کبھی ہوا ہے، نہ ہو
بتِ کافر ہو رام، ارے توبہ!
ہے ہر اک شعر نشتر اے نشتر
تیری طرزِ کلام، ارے توبہ!

۱۵۳ ۳۰

ناداں یہاں کھیل نہ مستی سے زیادہ
ہو جائے نہ مستی کہیں ہستی سے زیادہ
مستی بھی نگاہوں میں تری کم نہیں لیکن
نظروں میں تری سحر ہے مستی سے زیادہ
ہنگامہ گری شہرِ خموشاں کی نہ پوچھو
آباد یہ ویرانہ ہے بستی سے زیادہ
کافر ہوں جو عشرت کے لئے عادتِ مے ہو
مجھ کو تو غرض ہستی ہے مستی سے زیادہ
عاجز تو میں دونوں سے ہوں اک طرح، مگر ہاں
ہستی سے ذرا کم، غمِ ہستی سے زیادہ

جو امن ہے ویرانوں میں بستی میں نہیں ہے / ویرانے دل آویز ہیں بستی سے زیادہ

لا بھر دے مرے جام یوں اتنی مرے ساقی / جو کم نہ ہو مستی کو نہ مستی سے زیادہ

حاصل ہیں مزے عشق و محبت کے انہیں کو / مطلب ہے جنہیں حسن پرستی سے زیادہ

ہستی میں بھی ہیں حسن کے انداز نمایاں / یہ بھاگتی ہے طالبِ ہستی سے زیادہ

منہ گورِ غریباں سے، نہ چل موڑ کے غافل / پڑنا ہے تجھے کام اسی بستی سے زیادہ

کیوں اس سے بچھڑنے کا نہ انسان کو ہو رنج / ہے کون بھلا مادرِ ہستی سے زیادہ

تحقیق ہے جب یہ کہ قیام اسکو نہیں ہے / مانوس ہوں کیوں محفلِ ہستی سے زیادہ

اس میں جو پھنسے گا تو کہیں کا نہ رہیگا / تو دور ہی رہ کاوشِ ہستی سے زیادہ

اب میری تگ و دو کو یہ میداں نہیں کافی / عالم ہو کوئی، عالمِ ہستی سے زیادہ

دنیا میں نظر ایک بھی جامہ نہیں آیا / کمزور ہمیں جامۂ ہستی سے زیادہ

آخر تو بسر ہوتی ہے ویرانوں میں نشتر

۱۵۴ کیوں دل کو لگائے کوئی بستی سے زیادہ ۱۶

کر رہا ہم کو نہ اے صیاد دیکھ / رہ نہیں سکتے ہم اب آزاد دیکھ

میری نظروں میں چمن صیاد دیکھ / قید میں ہوں کس طرح آزاد دیکھ

ہو گیا دو دن میں کیا صیاد دیکھ / آج حالِ آشیاں برباد دیکھ

لوٹ جائیگا دلِ ناشاد دیکھ / کر نہ یوں بیداد پر بیداد دیکھ

چار دن کی زندگی پر یہ گھمنڈ / آدمی کا زعمِ بے بنیاد دیکھ

روزِ اوّل سے نہیں بھولا تجھے — دیکھ مجھ کو، اور میری یاد دیکھ

ہر قدم پر نامناسب ہے تجھے — امتحانِ عاشقِ ناشاد دیکھ

ہو اگر ہمت تو اے صیّاد آ — آخری ہنگامۂ فریاد دیکھ

دید کے قابل ہے، دردِ دل مرا — خالقِ دردِ دلِ ناشاد دیکھ

فکرِ آزادی میں تھا نشتر اسیر
۱۵۵ آج اُس کو قید میں آزاد دیکھ ۱۰

نہیں دخل اسمیں کسی کا کچھ، نہیں عشق گھر کا معاملہ
جو کرے گی طے تو نظر اِسے، کہ یہ ہے نظر کا معاملہ

تجھے یہ خبر بھی ابھی نہیں، ہے تری نظر کا معاملہ
کہ مجھی سے پوچھ رہا ہے تُو، مری چشمِ تر کا معاملہ

مری ساری عمر کی داستان، تری اک نظر کا معاملہ
تجھے ایک لمحے کا مشغلہ، مجھے عمر بھر کا معاملہ

یہ رہا ہے راز ازل ہی سے، یہ رہیگا راز ہی تا ابد
نہ کسی پہ کھُل سکا آجتک، مری چشمِ تر کا معاملہ

کوئی کیسے چھوڑدے عشق کو، کوئی آج کا ہے یہ ناصحا
ارے بے خبر یہ تو یاد سے بھی ہے پیشتر کا معاملہ

یہ جہاں ایک سرائے ہے، یہاں ساعتوں کا قیام ہے

جسے تم سمجھتے ہو زندگی، یہ ہے رات بھر کا معاملہ
کبھی بھول کر بھی فغاں نہ کر، غمِ عشقِ دوست عیاں نہ کر
اسے گھر میں رکھ دلِ بے خبر، یہ ہے تیرے گھر کا معاملہ
مری آنکھ سے نہ ہٹو کہیں، نہ اٹھو ابھی مری پاس سے
دمِ واپسیں یہ ہے منحصر، مری عمر بھر کا معاملہ
غمِ عشق کا کہوں حال کیا، مری ہمت اور مجال کیا
جو کہے کوئی تو کہے نظر، ہے نظر نظر کا معاملہ
نہیں پیری اور شباب میں، کوئی نام کو بھی مشابہت
یہ ہے نیم شب کا معاملہ، تو وہ ہے سحر کا معاملہ
نہ یہ اس سے کم، نہ وہ اس سے کم، نہ یہی سُنے نہ وہی سُنے
یہ عجیب طرح کا پڑ گیا ہے، دل و جگر کا معاملہ
وہ ضرور آئینگے صبحدم، یہ ہے وعدۂ اُنکا تری قسم
دلِ بیقرار ٹھہر بھی جا، کہ ہے رات بھر کا معاملہ
دمِ واپسیں پہ نگاہ رکھ، اسے فکر و غور سے ختم کر
یہ ہی ایک سانس بنائیگی، تری عمر بھر کا معاملہ
نہ خودی سے اپنے ہے شرم اسے، نہ خدا کا اسکو خیال ہے
ہے بشر بھی ایک عجیب شے، ہے عجب بشر کا معاملہ

سرِ کوہِ طور جو یاد ہو، ابھی تھوڑے دن ہی کی بات ہے
وہ مری نظر کا معاملہ، وہ تری نظر کا معاملہ

مجھے پوچھنے کو نہ آؤ تم، مرا غم نہ اور بڑھاؤ تم
مری چشمِ تر ہی میں رہنے دو، مری چشمِ تر کا معاملہ

مجھے واقعاتِ کلیم و طور، ذرا ابھی یاد نہیں رہے
کسی روز پھر بھی دکھا مجھے، وہ نظر نظر کا معاملہ

نہیں کچھ امیدِ مریضِ غم، فقط اور تھوڑی سی رات ہے
کہاں جا رہے ہو اب اُٹھ کے تم کہ ہے دوپہر کا معاملہ

یہ جلی کٹی نہ سنائیے، نہ جلے پہ لون لگائیے
دمِ واپسیں نہ بگاڑیئے، مری عمر بھر کا معاملہ

کبھی سوچتا ہوں جو اسکو میں، تو ہنسی سی آتی ہے زیست پر
فقط ایک سانس پہ ختم ہے، مری عمر بھر کا معاملہ

وہی نشتر ایک خلش رہی، جو دل و نگاہ میں جذب تھی
نہ ہوا کسی سے بھی طے کبھی، رگ و نشتر کا معاملہ

۱۵۶ ۲۱

نہ پوچھ حال مرا اے نگاہِ یار نہ پوچھ
لیا ہے کس نے مرا صبر اور قرار نہ پوچھ

چمن میں کیفیتِ ابرِ نو بہار نہ پوچھ
نشاطِ بادہ گساریِ میگسار نہ پوچھ

ہے کس قدر مرے دل میں غمِ بہار نہ پوچھ
دلا نہ یاد مجھے، مجھ سے بار بار نہ پوچھ

وفائے یار کہ لطفِ جفائے یار نہ پوچھ — ہے کون انہیں مرادشمن قرار نہ پوچھ

بتاؤں کیا تجھے ارمان کتنے ہیں دل میں — تو انکی شورشیں خود دیکھ لے شمار نہ پوچھ

بجز ستاروں کے، جو رات بھر کے شاہد ہیں — کسی سے اور مرا کیفِ انتظار نہ پوچھ

جو سانس آتی ہے بیچارے کی غنیمت ہے — مریضِ دردِ محبت کا حالِ زار نہ پوچھ

کہوں نہ تجھ سے تو کس سے کہوں میں آخرِ کار — مجھے تو اپنی سنانی ہے، تو ہزار نہ پوچھ

بتائے کچھ تو بتائے ترا تبسمِ ناز — کہاں گیا وہ مرا عالمِ قرار نہ پوچھ

ہے باز پرسِ قیامت کا رات دن کھٹکا — مزار والوں کی حالتِ تہِ مزار نہ پوچھ

پسِ فنا تو نہ بیگانہ بن خدا کے لئے — مرے مزار پہ آکر، مرا مزار نہ پوچھ

قیامت اور بپا اس نے حشر میں کر دی — نہ پوچھ شعبدۂ چشمِ اشکبار نہ پوچھ

جلا کے دونوں جہاں اس نے خاک کر ڈالے — دیارِ عشق میں عاشق کا اختیار نہ پوچھ

سحر یاد دلانا ہے یہ دوستوں کو — خدا کیواسطے کیفِ نگاہِ یار نہ پوچھ

شبِ فراق میں کیا ذکرِ وصل کی شب کا — مزے بہار کے ہم سے پسِ بہار نہ پوچھ

وہ روز روز تری بات پر یقیں کرنا — وہ روز روز مرا لطفِ انتظار نہ پوچھ

بیان سے ہے باہر ہے کیا کہوں نشتر
١٥٧ خدا کیواسطے لطفِ جفائے یار نہ پوچھ ١٧

ایک نشتر کی نصیحت یاد رکھ — ہو خوشی، یا رنج دل کو شاد رکھ

بندہ بیدامِ الفت ہیں ترے — شاد رکھ تو، یا ہمیں ناشاد رکھ

آرزوئیں تو نہ کر میری ہلاک — دل کی دُنیا تو مری آباد رکھ

ایکدن کر دے عنایت کی نظر — آبروئے نالہ و فریاد رکھ

یا نشاطِ دہر دے، یا اپنا غم — ایک دُنیا تو مری آباد رکھ

دل تو لگتے ہی لگیگا قید میں — کچھ دنوں خاطر سے اے صیاد رکھ

خوب جی بھر کر ستالے تو ہمیں — ایک دن انصاف ہوگا یاد رکھ

بیوفائی حسن میں ہے فطرتاً — پاس اسکا بھی دلِ ناشاد رکھ

ظلم کی جب تیرے ہوگی بازپرس — وہ زمانہ آرہا ہے، یاد رکھ

کچھ اسی حیلے سے نکلیں حوصلے — قید میں آزادیٔ فریاد رکھ

اس کی اِس بے اعتنائی پر نہ جا — بھولنے والے کو اے دل یاد رکھ

تیرے دیوانوں کو گھر سے کیا غرض — اور انکو خانماں برباد رکھ

دل بنا پہلو میں امید آفریں — آج اس تعمیر کی بنیاد رکھ

ہے اگر بیداد قسمت میں مری — دلمیں قایم لذتِ بیداد رکھ

ہوں شکارِ لذتِ قیدِ قفس — قید رکھ اب یا مجھے آزاد رکھ

یہ دورنگی اور محبت، واہ واہ — شاد ہی رکھ یا مجھے ناشاد رکھ

اپنی حد پر آچکا ہے دردِ دل — میں کہے دیتا ہوں تجھ سے یاد رکھ

تجھ کو تقصیروں سے بچنا ہے اگر
اپنی تقصیروں کو نشتر یاد رکھ

دونوں عالم ہیں گدائے میکدہ — اے تری قدرت، خدائے میکدہ!
حضرتِ واعظ بھی اسکی دھن میں ہیں — کھل گئے کیا رازہائے میکدہ
ہے خیالِ چشمِ ساقی اور ہم — کون اب تھکنے کو جائے میکدہ
چشمِ ساقی تیری نظروں کے نثار — ہے نگاہوں میں فضائے میکدہ
الفراق ای ہوش، ای عقل و خرد — لے اُڑی مجھکو ہوائے میکدہ
تجھکو ساقی اپنی نظروں کی قسم — کچھ نہ دیکھوں میں سوائے میکدہ
اسطرف بھی اِک نگاہِ چشمِ مست — میں بھی ہوں ساقی گدائے میکدہ
چھوڑ آتے کیوں نہ ہم اسکو وہیں — ہوش تھا آخر برائے میکدہ
راز ہے یہ اور رہیگی راز ہی — ابتدا و انتہائے میکدہ
جسکو سب دُنیا سمجھتی ہے اذاں — ہے حقیقت میں صدائے میکدہ
اپنی ہی مستی سے ہیں سب رند مست — میکدہ ہے مبتلائے میکدہ
ہیں وہاں بھی ہوش کی پابندیاں — کون لے جنت بجائے میکدہ
میکشوں پر میکدے کی رحمتیں — بر سرِ واعظ، بلائے میکدہ
ہمنے تو جانے کی دلمیں ٹھان لی — کوئی جائے یا نہ جائے میکدہ

میکدہ میرے لئے پیدا ہوا
۱۵۹ اور نشتر میں برائے میکدہ ۱۵

کردیتے ہیں وہ کرکے کرم اور زیادہ — بیتابیٔ ارمانِ ستم اور زیادہ

چاہوں اگر الطاف و کرم اور زیادہ
کرتے ہیں وہ بیداد و ستم اور زیادہ

غم سے جنھیں بچنے ہی کی دُھن رہتی ہے ہر دم
ملتے ہیں اُنھیں دہر میں غم اور زیادہ

جتنا میں الگ دیکھتا ہوں رنج و خوشی کو
آتے ہیں نظر مجھ کو بہم اور زیادہ

ہر روز تڑپنے کو ترستا ہوں شبِ غم
ہوتا کہیں طولِ شبِ غم اور زیادہ

کل مل ہی گئی تھی بخدا منزلِ مقصود
رکھ دیتے اگر چار قدم اور زیادہ

خواہاں نہ خوشی کا ہو یہاں اے دلِ غمگیں
چاہو جو خوشی، ہوتے ہیں غم اور زیادہ

اب قوتِ برداشت سے باہر ہے ہماری
ہو جائے اگر ایک ستم اور زیادہ

مفتوں ہے ستم پر دلِ دیوانۂ عاشق
کر دے اسے بربادِ ستم اور زیادہ

جب بیٹھ گئے پینے کو میخوارِ قدح نوش
پھر ان کے لئے کچھ نہیں کم اور زیادہ

عاقل ہو تو خوشیوں کی محبت میں نہ کر فکر
خوشیوں سے نہیں دشمنِ غم اور زیادہ

وہ کونسی شے ہے جو نہیں باغِ جہاں میں
کیا ہوگا بھلا باغِ ارم اور زیادہ

کر عشق میں کچھ کارِ نمایاں دلِ وحشی
مجنوں سے بھی دو چار قدم اور زیادہ

مایوسِ کرم یوں بھی محبت میں نہیں ہوں
کر مجھ کو نہ ممنونِ کرم اور زیادہ

اکبار جہاں خوگرِ بیداد ہوا یہ
عاشق نہیں پھر سوچتا، کم اور زیادہ

غم سے تجھے بچنا ہے اگر دارِ فنا میں
کر قلب کو وابستۂ غم اور زیادہ

اظہارِ شکوک اُن سے ہے ناحق دلِ ناداں
کھا جائیں گے ایک آدھ قسم اور زیادہ

ہر وقت مرے ذوقِ ستم کا ہے اشارہ
دے مجھ کو خدا شوقِ ستم اور زیادہ

۱۶۰ جتنا یہ غمِ عشق سوا ہوتا ہے نشتر
ہوتی ہے ہمیں خواہشِ غم اور زیادہ ۱۹

ہر سوز جُدا گانہ، ہر ساز جدا گانہ ۔ ہر چیز کا ہوتا ہے انداز جدا گانہ
ہوتا ہے جدا گانہ، ہر حال محبت کا ۔ انجام جدا گانہ، آغاز جدا گانہ
ممکن ہو اگر یارب، دل اور عنایت کر ۔ رکھونگا میں دو دلمیں، اک راز جدا گانہ
دُنیائے محبت میں، ہمنے تو یہی دیکھا ۔ انجام سے رہتا ہے، آغاز جدا گانہ
آواز جو یکساں ہو، سُن لے وہ ضرور اسکو ۔ دیکھو جسے دیتا ہے آواز جدا گانہ
آواز نہ کعبے کی وہ ہے، نہ کلیسا کی ۔ ہوتی ہے محبت کی آواز جدا گانہ
کس کس پہ مرے کوئی، کس کس سے بچے کوئی ۔ سو ناز ہیں کافر میں، سو ناز جدا گانہ
غم ہو کہ مسرت ہو، ہے سب کے لئے اک دل ۔ ہر نغمے کو لازم تھا، اک ساز جدا گانہ
آغاز کا ہوتا ہے انجام الگ جیسے ۔ انجام کا ہوتا ہے آغاز جدا گانہ
ہر شخص چھپاتا ہے یوں رازِ محبت کو ۔ گویا یہ اُسی کا ہے اک راز جدا گانہ
اس طرح جدا گانہ محفل میں کبھو بیٹھیں ۔ دل چور جدا گانہ، جانباز جدا گانہ
کیوں کھاتے ہو تم قسمیں ذاتِ محبت کی ۔ ہوتا ہے محبت کا انداز جدا گانہ
کعبے کی صدائیں ہوں یا دیر کی آوازیں ۔ مطلب ہے وہی سب کا، انداز جدا گانہ

۱۶۱ ہے حُسن وہ ہی نشتر ہر شے میں مگر اُسکا
نیرنگِ نمو سے ہے انداز جدا گانہ ۱۴

اب پہونچکر دیکھتا ہوں میں، تو کچھ مشکل نہ تھی
منزلِ مقصود منزل میں کوئی منزل نہ تھی

دل کو حاصل تھی کبھی رُویت، کبھی حاصل نہ تھی
ایک ہی منزل، کبھی منزل کبھی منزل نہ تھی

اب جو مشکل جان کو ہے، پہلے یہ مشکل نہ تھی
جب نظر بجلی نہ تھی تیری، ادا قاتل نہ تھی

آرزوئے دل کبھی دل میں ٹھہر سکتی نہیں
جو نہ نکلی دل سے، سمجھو آرزوئے دل نہ تھی

بارہا ایسا ہوا ہے شاہراہِ عشق میں
جسکو منزل میں نے سمجھا، وہ مری منزل نہ تھی

پھر بھی آئینگے کبھی وہ دن الٰہی یا نہیں
دل ہی دل پہلو میں تھا اور آرزوئے دل نہ تھی

عشق میں ناکامیابی، کامیابی تھی مری
سعیٔ لاحاصل بظاہر، سعیٔ لاحاصل نہ تھی

عشق کرتے ہی نہ جانے ہو گیا کیا انقلاب
ورنہ پہلے دل نہ تھا یا آرزوئے دل نہ تھی

نارسائی کی کسی سے کیا شکایت، کیا گلہ
اے مُسافر، تجھ میں خود ہی گرمیٔ منزل نہ تھی

آرزوئے دل ہوئی پوری نہ اپنی عشق میں
آرزوئے دل ہی شاید آرزوئے دل نہ تھی

ہم کو تنہا تو نے کیوں محرومِ محفل کر دیا
سب کو محفل تھی ہمارے واسطے محفل نہ تھی

اسکے ہر ہر ذرے میں اک دل تھا اے بادِ صبا
یوں اُڑانے کے لئے خاکسترِ محفل نہ تھی

اب میں سمجھا، کیوں یہ دُنیا پہلے سُنتی تھی مری
داستانِ دل تو تھی، لیکن زبانِ دل نہ تھی

شمع تھی لیکن مذاقِ سوزِ پروانہ نہ تھا
ہم نہ تھے محفل میں جب، یہ گرمیٔ محفل نہ تھی

ابتو جو روکے ہیں، وہ بھی ہمارے ساتھ ہو
پہلے کچھ بات اور تھی، جب سامنے منزل نہ تھی

اب میں دیکھوں کتنے پردوں میں کہاں چھپتی ہیں آپ
آپ پر اب تک نگاہیں تھیں، نگاہِ دل نہ تھی

عشق نے مجھ کو بچایا، ورنہ دُنیا کی ہوس
اُسطرف لیکر چلی تھی، جسطرف منزل نہ تھی

انکشافِ راز کا اب مجھ سے ناحق ہے گلہ
آنکھ کیوں دی تھی، جو ضبطِ عشق کے قابل نہ تھی

تونے ای چشمِ بصیرت خوب آنکھیں کھول دیں
واقعی کمبخت یہ دُنیا مرے قابل نہ تھی

بیٹھ کر محفل میں ایسا ہو چکا ہے بارہا
سامنے محفل بھی تھی اور سامنے محفل نہ تھی

ابتو سب کچھ ہو گیا، تیرے تصور پر نثار
ایک دریا دلمیں تھا جب آنکھ دریا دل نہ تھی

کیا کہوں اُسکے کرم کو، جب کیا اُس نے کرم
دیکھتے ہی دیکھتے مشکل مری مشکل نہ تھی

ابکے فصلِ گُل میں کیوں نشتر نہیں کیفِ بہار
ایسی پہلے تو کبھی افسردگیِ دل نہ تھی

لے گئی نشتر نگاہِ ناز دل کا صبر بھی
میں نے سمجھا تھا اسے غافل، مگر غافل نہ تھی

۱۶۲ ۲۴

اُٹھتی ہے نظر اپنی نہ اُس در سے اُٹھیگی
چلمن کبھی خود جذبِ مقدر سے اُٹھیگی

اُسوقت سے بچنا، میں کہے دیتا ہوں صیّاد
جب آہ قفس میں دلِ مضطر سے اُٹھیگی

بیداد یہ بیداد کئے جاتے ہو تم روز
سختی یہ کہاں تک دلِ مضطر سے اُٹھیگی

بیطرح گری ہے تری فرقت میں طبیعت
اب خاک یہ تدبیرِ دوا گر سے اُٹھیگی

کیا حال مرا ہو گا تری یاد میں ظالم
جب ہُوک سی میرے دلِ مضطر سے اُٹھیگی

جب فرق نہ دونوں میں رہا کوئی نمایاں
اب خاک جبیں میری ترے در سے اُٹھیگی

مرتی نہیں جب رُوح تو پھر مرنے کا غم کیا
اک گھر میں چلی جائیگی اک در سے اُٹھیگی

باز آؤنگا جب خون کے دعوے میں اپنے
تحسین کی صدا دامنِ محشر سے اُٹھیگی

کیا مجھکو خبر تھی کہ چڑھیگی وہ ہی سر پہ
جو خاک مری پاؤں کی ٹھوکر سے اُٹھیگی

۱۶۳ بیداد تری کوئی اُٹھائے تو میں جانوں ۱۰
اُٹھیگی تو صرف اک دلِ نشتر سے اُٹھیگی

جب اُنکی یہ خوئے جفا جائیگی — تو دُنیا توازن پہ آجائیگی
بھلا اُنکی خوئے جفا جائیگی! — گئی جو نہ ابتک وہ کیا جائیگی
اب آکر کہاں یہ گھٹا جائیگی — مرے ہی نصیبوں پہ چھا جائیگی
نہ کھلوائیں واعظ ہماری زبان — کوئی ہمنے کہدی تو چھا جائیگی
وہ آئیں گے بالیں پہ جبدم مری — تو مُنہ اپنا لیکر قضا جائیگی
ابد تک نہیں انتہائے وفا — کہانتک تمھاری جفا جائیگی
اُنھیں ہم بھلا دیں، یہ ممکن نہیں — بھُلانے سے یاد اور آجائیگی
وفا آئیگی آتے آتے اُنھیں — یہ جانے ہی جاتے جفا جائیگی
میں خاموش جس روز ہو جاؤنگا — نہ جانے کہانتک صدا جائیگی
ذرا دستِ رنگیں میں ساغر تو لو — گھٹا خود ہی گلشن پہ چھا جائیگی
یہ نیرنگیِ عشق بھی ہے عجب — بگاڑیگی جس کو بنا جائیگی
یہ مستیاں جوش پر ہیں مری — جہاں جاؤنگا میں گھٹا جائیگی
ذرا کھول دو زُلف دیکھیں تو ہم — کہانتک یہ کالی گھٹا جائیگی
ابھی تو شبِ ہجر ہے اور ہم — نہ معلوم کب یہ بلا جائیگی
کروں کیوں میں ہر وقت خوفِ اجل — بچونگا نہ آخر جب آجائیگی

نظر اُنکی نظروں سے ملتی رہے
کبھی تو مروّت بھی آجائیگی

تو کیا وہ نہ آئیں گے اے شامِ ہجر؟
تو کیا رائیگاں ہر دُعا جائیگی؟

تجھی سے یہ نکلی تھی دُنیا کبھی
تجھی میں یہ دُنیا سما جائیگی

جب آئیگی نشتر نظر اُنکی یاد
مرے دل پہ نشتر چلا جائیگی

۱۶۴ ۱۹

غضب ہیں یہ آنکھوں کے ڈورے گلابی
ہوئی جاتی ہے ساری دُنیا شرابی

فلک کی ہے پھر آج رنگت شہابی
چلیں بوتلیں لیکے گھر سے شرابی

خرابات سے پائیگی کیف دُنیا
کہ تمہیدِ تعمیر ہے ہر خرابی

عناصر کا پردہ اُٹھا کر تو دیکھو
نہ میں آتشی ہوں، نہ خاکی نہ آبی

تجھے ہر طرف جلوہ گر دیکھتا ہوں
حجابوں میں رہکر بھی یہ بے حجابی!

تصوّر میں ہیں مست آنکھیں کسی کی
ہمیں تو ہیں بے جام و بادہ شرابی

جسے دیکھئے ایک ہی رنگ میں ہے
جو ہم ہیں شرابی، تو دُنیا شرابی

تصوّر سلامت تخیّل سلامت
نہیں ہے، نہ ہو، بزم میں باریابی

زبان روک اپنی خبر بھی ہے تجھکو
میں کس میکدے کا ہوں واعظ شرابی

میں ہوں چشمِ ساقی سے مدہوش و بیخود
خبردار مجھ کو نہ کہنا شرابی

مرا مذہبِ عشق کہتا ہے واعظ
نہیں پارسا، جو نہیں ہے شرابی

یہ محجوب و برہم تمہاری نگاہیں
جو کچھ آفتابی، تو کچھ ماہتابی

سنا ہے بہار آ گئی گلستاں میں
پھر آئی سکونِ خاطری کی خرابی

ذرا شرم، اے خام کارِ تمنا
پتنگوں کو ہے بزم میں باریابی

مرادف ہیں دونوں ہماری سمجھ میں
جہانِ محبت، جہانِ خرابی

خدا جانے دل کو یہ کیا ہو گیا ہے
ہوئی شام اور بڑھ چلی تشنہ خوابی

نہ کہہ اُنکی آنکھوں کو مست اُنکے آگے
شرابی کو کہتا ہے کوئی شرابی

ہر اک شاخ پر اک نیا ہے نشیمن
چمن میں یہ کون آ گیا انقلابی!

وہ دورِ جوانی، وہ مستی کا عالم
ہوائیں گلابی، گھٹائیں شرابی

نہ بھولیگا وہ میرے ساقی کا کہنا
نہ چھیڑو اسے، ہے یہ میرا شرابی

زمانہ جسے برق کہتا ہے نشتر
وہ ہے درحقیقت مری تشنہ تابی

۱۶۵ ۳۱

نہیں ہوتا ہے زمانہ جو ہمارا، نہ سہی
عالمِ عشق سلامت رہے، دُنیا نہ سہی

ہم نے مانا نہ ملے گی ہمیں عقبیٰ نہ سہی
مُنہ سے کسطرح کہیں، ساغر و صہبا نہ سہی

دل کو تسکین دیے جاؤ، مداوا نہ سہی
التفات ایک تبسم سے زیادہ نہ سہی

حسن ہی کر کے دکھا دے ہمیں تکمیلِ وفا
نہیں شایانِ وفا عشق تو اچھا نہ سہی

ضبط بھی تو ہے سکونِ دلِ مضطر کا سبب
نہیں بہتا ہے جو اب آنکھ سے دریا نہ سہی

درد وہ جو بڑھ کے مرے درد کا درماں ہوگا
نہیں ملتا ہے اگر کوئی مسیحا نہ سہی

سیرِ طوفاں ہمیں کرنی ہے کہیں سے کر لیں
قعرِ دریا ہی سہی، ساحلِ دریا نہ سہی

مِل ہی جائیگی کہیں ہمکو اماں بعدِ فنا — دامنِ بحر سہی دامنِ صحرا نہ سہی
آرزوؤں کو خدا میری، سلامت رکھے — میں بنا لونگا جہاں اور، یہ دُنیا نہ سہی
خوں بہا ہے یہ نگاہوں کا پشیماں ہونا — تم تو قاتل ہو مجھے خون کا دعویٰ نہ سہی
آؤ اِس عالمِ نیرنگ کی بھی سیر کریں — غمِ جاناں سہی کچھ دن، غمِ دُنیا نہ سہی
میں نے تو دیکھ لیا بزم میں سو بار اُنھیں — آنکھ اُٹھا کر نہ اُنھوں نے مجھے دیکھا نہ سہی
زندگی کی دلِ مُردہ میں ضرورت ہی فقط — لاکھوں ہو جائینگی دُنیائیں، یہ دُنیا نہ سہی
پھر بھی اُمیدِ کرم پر ترے زندہ ہوں ابھی — لاکھ مایوس سہی، دلمیں تمنّا نہ سہی
ایک دن مجھکو دکھا دیجئے جلوہ اپنا — طالبِ دید اک انساں تو ہوں موسیٰ نہ سہی
ڈھونڈنے والیکو ملنا ترا دشوار نہیں — دل تو موجود ہے پھر دیر و کلیسا نہ سہی
مشرقِ جلوہ سے آواز مجھی کو دیدو — طور قائم ہے، نہ ہوں حضرتِ موسیٰ نہ سہی

وہ ہمارے ہیں، تو دُنیا ہے ہماری نشتر
۱۶۶ نہیں ہوتا جو کوئی اور ہمارا، نہ سہی ۱۸

ایک بار اعتبار، اور سہی — آج کا انتظار، اور سہی
دلکی اِک یادگار، اور سہی — ایک لوحِ مزار، اور سہی
کچھ دنوں ہجرِ یار اور سہی — لذّتِ انتظار، اور سہی
نیم بسمل نہ چھوڑ اے قاتل — ایک اوچھا سا وار اور سہی
پھول لیں پھول، موسمِ گُل میں — یہ فریبِ بہار اور سہی

لطفِ دنیا کا خوب دیکھ لیا — لطفِ زیرِ مزار اور سہی
ایک دل درد کو ہے ناکافی — ایک، پروردگار اور سہی
خالی از لطف تو خزاں بھی نہیں — رنگِ فصلِ بہار اور سہی
چھوٹنا ہے قفس سے جب اک دن — نہ سہی یہ بہار، اور سہی
خوگرِ انتظار کو پسِ مرگ — حشر کا انتظار اور سہی
کچھ تو ہیں پھول میری تربت پہ — کچھ نسیمِ بہار اور سہی
ہیں ہمارے لئے تو دونوں ایک — اضطراب و قرار اور سہی
غم بھی منظور ہے جو آپ ملیں — پھول کے ساتھ خار اور سہی
شاید آجائے راہ پر کوئی — کچھ دنوں اشکبار اور سہی
دردِ دل خوشگوار ہے یارب — اک دلِ بیقرار اور سہی

تو نے نالے بہت کئے نشترؔ
آہِ بے اختیار اور سہی

۱۶۷ — ۱۶

سنانے کو سنا دے انکو میری داستاں کوئی — کہاں سے لائیگا لیکن، محبت کی زباں کوئی
کہاں تک ہر گھڑی رکھّے خیالِ آشیاں کوئی — کہاں تک رات دن دیکھے نگاہِ باغباں کوئی
گلستاں لاکھ ہو، لیکن ہے وہ بھی گلستاں کوئی — نہ جسمیں آشیاں کوئی، نہ جسکا باغباں کوئی
نہ مصئوں گلستاں کوئی، نہ محفوظ آشیاں کوئی — گذارے زندگی اپنی یہاں آخر کہاں کوئی
یہ ہے شانِ کرم، اے خالقِ کون و مکاں کوئی — کوئی ڈوبا ہوا عشرت میں مصروفِ فغاں کوئی

میں دیکھوں پھر جو سن لے میری غم کی داستاں کوئی
ملا دے درد اگر تھوڑا سا اِس میں قصہ خواں کوئی

ہمارے حال پر کچھ روز سے ہے مہرباں کوئی
شگوفہ چھوٹنے والا ہے شاید آسماں کوئی

پتہ دیتی ہے گرد اُٹھتی ہوئی راہِ محبت کی
ابھی اس راہ سے ہو کر گیا ہے کارواں کوئی

نہیں موقوف جب یہ دیر و حرم پر آپ کا ملنا
تو کیوں بھٹکا پھرے آخر یہاں کوئی وہاں کوئی

لپٹ کر خوب رو لیتا، یہی دل کی تمنا تھی
دکھا دیتا مجھے اکبار میرا آشیاں کوئی

گلی میں اُنکی جب ہم تھے، تو کیا کیا لُطف آتے تھے
وہاں کیا اور تھے یارب زمین و آسماں کوئی

چمن پر آفتیں آتیں، تو کچھ دن کو نکل جاتے
بیاباں بھی ضروری تھا، قریبِ گلستاں کوئی

نہ بھولیگا وہ آنسو جذب کرنا آستینوں میں
نظر آیا اِدھر آتا ہوا مجھ کو جہاں کوئی

میں اب لذّتِ شناسِ نعمتِ نامہربانی ہوں
نہ ہو اب مہربانی کر کے مجھ پر مہرباں کوئی

نہیں ہے زندگی کی شکل کوئی جورِ پیہم سے
نئی صورت نکالے اب تو مرگِ ناگہاں کوئی

بہارِ رفتہ اپنی یاد کر کے خوب روتے ہیں
نظر آتا ہے جب شاداب ہمکو گلستاں کوئی

الٰہی کسطرح اظہارِ حال اُن پر کروں اپنا
ارادہ کرتے کرتے روک لیتا ہے زباں کوئی

کہے جاتے ہیں وہ اپنی، کہے جاتا ہوں میں اپنی
نہ اُن کا ہمزباں کوئی، نہ میرا ہمزباں کوئی

نہیں کوئی جو محتاجِ کرم تیرا نہیں یارب
نہ بالائے فلک کوئی، نہ زیرِ آسماں کوئی

نہ ہمت ہار اے دل، جھیل سختی زندگانی کی
پسِ پردہ یہ تیرا لے رہا ہے امتحاں کوئی

ہماری داستاں کیا، ایک ہی قصہ ازل سے ہے
ہماری داستاں پڑھ لو، اُٹھا لو داستاں کوئی

یہ آنکھیں ہیں شرارِ حُسن سے دہکی ہوئی آنکھیں!
بھر دیتا ہے میرے دل میں لاکھوں بجلیاں کوئی

مزے لوٹے ہوئے ہیں ہم کسی کے رنجِ پیہم کے
نہ لیں ہم، دے اگر ہم کو نشاطِ دو جہاں کوئی

دوئی کا جب اُٹھا پردہ، ہم اور وہ ایک ہی نکلے
ہمیں خود درمیاں نکلے، نہ نکلا درمیاں کوئی

تمہارے غم کا فریادی ہو یا ملنے کا شایق ہو
ابھی دوڑا گیا ہے اُس طرف نالہ کناں کوئی

یہ میرا ہوش بھی لیلو کہ قصہ پاک ہو جائے
حجاب اب کیوں رہے میرے تمہارے درمیاں کوئی

کئے دیتا ہے ثابت نامناسب میرے شکووں کو
ذرا اُس شوخ کا دیکھے تو یہ حُسنِ بیاں کوئی

اسی اِک خوف سے اسکو چھپائے دل میں بیٹھا ہوں
مبادا چھین لے مجھ سے مرادِ دل نہاں کوئی

قیامت تک مزے ہیں ساکنانِ گور کو نشتر
کوئی خوفِ زمیں اِن کو، نہ خوفِ آسماں کوئی

جو میرے دل میں ہے نشتر وہ ہی میری زباں پر ہے
۱۶۸ نہیں جب راز ہی کوئی، تو کیوں ہو رازداں کوئی ۳۰

بشر خیر چاہیں اگر اپنی اپنی
خطاؤں پہ رکھیں نظر اپنی اپنی

جہاں میں ہے ذہنِ رہبر اپنی اپنی
ہے اک منزل اور رہگذر اپنی اپنی

غرض ہے جو مدِ نظر اپنی اپنی
بکے جاتے ہیں بشر اپنی اپنی

اُنھیں مجھ سے نفرت، مجھے اُن سے اُلفت
پسند اپنی اپنی، نظر اپنی اپنی

بُتِ ماہ وش بے حجاب آ رہا ہے
جھکا لیں ستارے نظر اپنی اپنی

نظر تو وہ ہی ہے جو سب کو ملی ہے
مگر ہے نشاطِ نظر اپنی اپنی

نگاہیں تری انقلابی ہیں، پھر بھی
جگہ پر ہیں قلب و جگر اپنی اپنی

وہ بے خواب ہیں، داستاں کہنے والے
کہیں داستاں مختصر اپنی اپنی

یہ ہیں محوِ غفلت کہ بھولے ہوئے ہیں / تمام اہلِ دُنیا خبر اپنی اپنی
تجھے اُس نے دیکھا، جو اہلِ نظر تھا / لگائے رہے سب نظر اپنی اپنی
بہت کچھ سُنانا تھا محشر میں اُنکو / پڑی تھی وہاں تو، مگر اپنی اپنی
اُنھیں کی بدولت ہے ساری خرابی / کرو خواہشیں مختصر اپنی اپنی
بھرے باغ میں نغمہ سنجانِ گلشن / سُناتے ہیں شام و سحر اپنی اپنی
نہ یہ مانتا ہے، نہ وہ مانتا ہے / ہیں فکر و نیمِ قلب و جگر اپنی اپنی
تھے مہمان اک رات کے شمع و انجم / کہ لی راہ وقتِ سحر اپنی اپنی
ہیں غارتگرِ ہوش جلوے کسی کے / ہٹا لیں ندیدے نظر اپنی اپنی

وہ رخصت ہوئے اپنی محفل سے نشترؔ
سمیٹا کریں سب نظر اپنی اپنی

١٦٩ ١٧

مصروفِ نظارہ ہے، بے منّتِ بینائی / خود ایک تماشا ہے، دُنیا کا تماشائی
اب اِسکے سوا کیا ہے، ارمانِ تمنّائی / بس تیرا تصوّر ہو، اور عالمِ تنہائی
رونا ہے کبھی ہنسنا، ہنسنا ہے کبھی رونا / کیا دل سے کہیں اپنے، سودائی ہے سودائی
کچھ روز محبت میں، اب تجھ سے بھی مر گذریں / میں تیرا تماشا ہوں، تو میرا تماشائی
یا صبح و مسا میں تھا، اور چار طرف خوشیاں / یا اب ہے خوشی مجھکو، ماضیِ تمنّائی
پائے نہ تجھے کوئی، یہ ہو ہی نہیں سکتا / در اصل نہیں تیرا دُنیا میں تمنّائی
جب چھین لیا تمنے سب صبر و شکیبِ دل / آئے ہو سکھانے کو اب صبر و شکیبائی

آخر انھیں سودائی، تم نے ہی بنایا ہے
تم تو نہ کہو منہ سے عشاق کو "سودائی"

ہے عالمِ ہو ہر سُو، ہر سمت ہے تو ہی تو
تاروں بھری راتیں ہیں اور تیرا تماشائی

کس وقت محبت میں، رکھا تھا قدم ہمنے
جو راہ کبھی سوچی، وہ راہ نہ راس آئی

کرنے کو خلافِ غم، کر بیٹھے دعائیں ہم
غالب ہے مگر ہر دم، اب خوفِ پذیرائی

جو بات ہے تیری وہ، دُنیا سے نرالی ہے
ڈھونڈے سے نہیں ملتا، ہم کہنے کو ہرجائی

لو شمع ہوئی ٹھنڈی، پروانے کے جلتے ہی
کس کام جفا آئی، کس کام وفا آئی

تنہائی میں پہلے تو، تھیں انجمنیں لاکھوں
اب انجمنوں میں ہے کیفیتِ تنہائی

ہو معتدل افسانہ، اے جوشِ جنوں میرا
کچھ سیرِ گلستاں ہو، کچھ بادیہ پیمائی

جو بات ہے اب تک کی، وہ تھی نہ کبھی پہلے
جب تک نہ ترے غم سے، تھی دل کی شناسائی

اندیشۂ رسوائی، ہے دل کے لئے خطرہ
ہے موجبِ رسوائی، اندیشۂ رسوائی

مانگے سے کبھی خوشیاں، نادان نہیں ملتیں
حسرت ہے خوشی کی تو، کر غم سے شناسائی

للّٰہ کوئی روکے کمبخت تمنائیں
چھینے لئے جاتی ہیں، مجھ سے مری تنہائی

گھِر کر تری جلووں میں بیہوش نہ ہو جاؤں
آنکھوں کو عطا کر دے، سرمایۂ بینائی

کیا واسطہ آہوں سے، نالوں سے غرض کیا ہے
کہنے سے ہمیں مطلب، ہو یا نہ ہو شنوائی

کیا حسن کے مشرب میں تغیر ہوئی یا رب؟
پھر میری تڑپ میں ہے اندازِ شکیبائی

وہ عشق ترا ظالم، صد آفت و صد محشر
وہ حاصلِ بدنامی، کافر میری رسوائی

انساں ہے، نہ دُنیا ہے، سب تیرا ہی جلوہ ہے
تجھ کو لئے پھرتی ہے، تیری ہی خود آرائی

تنہائی و محفل میں، کیوں فرق کروں نشتر — تنہائی مجھے محفل، محفل مجھے تنہائی

۱۷۰ ہے جلوہ گہِ عالم، کیا خوب جگہ نشتر ۲۶
ہر شخص تماشا ہے، ہر شخص تماشائی

آج کافر نے وہ نظر ڈالی — دل کی دُنیا تباہ کر ڈالی
تجھ پہ جس شخص نے نظر ڈالی — پھر کسی پر نہ بھول کر ڈالی
موسمِ گُل کا جشن دھوم سے ہے — پیش کرتا ہے ہر شجر "ڈالی"
الاماں وہ نگاہِ یاس مری — وقتِ رخصت جو باغ پر ڈالی
جان میری نکال لی تم نے — چلتے چلتے جو اِک نظر ڈالی
وہ چمن چھوڑنے کا منظر، ہائے — آشیاں بن گئی تھی ہر ڈالی
جب اُسے دیکھنا ہوا مقصود — بند کی آنکھ اور نظر ڈالی
ہم سے دُنیا سے واسطہ کیا تھا — ہم پہ دُنیا نے کیوں نظر ڈالی
تھی خطا دل کی، ہمسے ہیں ناراض — بات کسکی، ہمارے سر ڈالی
مجھ کو الزامِ عشق دیتے ہو — کِس نے بنیاد پیشتر ڈالی؟
دل ہرا ہو گیا قفس میں بھی — اپنی "ڈالی" پہ جب نظر ڈالی
بعدِ رخصت وہ بھولتی ہی نہیں — تُو نے مُڑ مُڑ کے جو نظر ڈالی
لے لیا اُس نے میرا صبر و قرار — اور کہنے کو اِک نظر ڈالی
کھُل گئی سب حقیقتِ دُنیا — ہم نے دُنیا پہ جب نظر ڈالی

ڈالیاں تھیں ہزار ہا، اے برق — میری ڈالی پہ کیوں نظر ڈالی
وعدۂ شام کر کے اے ظالم، — نیند تو نے حرام کر ڈالی
وہ عمارت نہ پا سکی تکمیل — جس کی بنیاد عمر بھر ڈالی
غم کی بھرمار جب ہوئی دلیر — آہ، بے اختیار کر ڈالی

میں نے سوچا کبھی نہ اے نشتر
١٧١ بات جو دل میں آئی، کر ڈالی ١٩

جو حالت ہے میری، تری ہو بہو تھی — مری آرزو جب تری آرزو تھی
محبت میں کیا صورتِ جستجو تھی — کہ دل اک طرف تھا، نظر چار سو تھی
نکالی نہ تو نے، مگر در حقیقت — مری آرزو ہی تری آرزو تھی
تمہارا تصور تھا، یا تم، شبِ غم — کسی سے مری رات بھر گفتگو تھی
تری یاد میں صرف کرتے، جو ملتی — ہمیں عمرِ رفتہ کی پھر آرزو تھی
جہاں تو نے لی راہ، اے موسمِ گل — نہ کلیوں میں نزہت نہ پھولوں میں بو تھی
نکالا نہ اس کو کبھی ہم نے دل سے — مری آرزو بھی کوئی آرزو تھی
وہ آئے تو یہ ہو گیا حالِ دل کا — نہ کوئی تمنا نہ کچھ آرزو تھی
ہنسی آ رہی ہے مجھے بے خودی پر — مرے پاس تم تھے، مگر جستجو تھی
جسے آرزو اپنی سمجھا میں ہر دم — حقیقت میں وہ تیری ہی آرزو تھی
فریبِ تمنا کھلا مجھ پہ جس دم — تمنا تھی پھر کچھ، نہ کچھ آرزو تھی

یوں ہی کٹ گئی رفتہ رفتہ ہماری — کبھی نامُرادی، کبھی آرزو تھی
نکلنے کو نکلیں تمام آرزوئیں — جو نکلی نہ دل سے وہ ہی آرزو تھی
مٹا کر مری آرزو، مار ڈالا — مری زندگانی، میری آرزو تھی
مری آرزوؤں کو ٹھکرانے والے — وہ دن یاد کر جب تجھے آرزو تھی
یوں ہی کٹ گئی راہِ اُلفت میں اپنی — کبھی آرزو تھی، کبھی جستجو تھی
کبھی اُن کی محفل سے یہ واسطہ تھا — تصوّر کیا اور مرے روبرو تھی
سرِ طُور نکلی جو موسیٰ کے دل سے — مرے دل کی نکلی ہوئی آرزو تھی
نہ کہتا تھا کچھ، اور کہتا تھا سب کچھ — مری خامشی بھی عجب گفتگو تھی
ابھی تک وہ دن مجھکو بھولے نہیں ہیں — تو ملتا نہ تھا اور مجھے جستجو تھی
گئے اے اُمید اب کہاں وہ مرے دن — جدھر دیکھتا تھا، اُدھر تو ہی تو تھی
محبّت کی میری نمازیں بھی کیا تھیں — کوئی باوضو تھی، کوئی بے وضو تھی

وہ تھے یا نہ تھے میرے پہلو میں نشتر
۱۷۲ — ۲۳
مگر اُن سے ہر دم مری گفتگو تھی

وحشتِ دل ہوئی مقبول جو دیوانوں کی — آستینوں نے بھی کی نقل گریبانوں کی
بھیڑ ہر وقت ہی دل میں مرے ارمانوں کی — یورش اس گھر پہ ازل ہی سے ہے مہمانوں کی
ہے جو کچھ دن یہی حالت ترے دیوانوں کی — آستیں کی ہے، نہ ہے خیر گریبانوں کی
فکر محفل میں کسی کو نہیں پروانوں کی — مُفت میں جان گئی سوختہ سامانوں کی

یوں پہونچنا نہیں ممکن مرا میخانے تک راہ میں ڈاک بٹھا دے کوئی پیمانوں کی
اُنکے وعدے پہ یقیں ہے جو دلِ ناداں کو دُھوم دیکھے مرے دلمیں کوئی ارمانوں کی
کچھ تو دیکھا ہے، جو ہر راہ میں رکھا ہے قدم مُفت ہم خاک نہیں چھانتے بتخانوں کی
اور ہی رنگِ طبیعت نظر آیا مجھ کو مسجدیں چھوڑ کے جب راہ لی میخانوں کی
اے جنوں تو بھی نہ ہوتا تو گذر مشکل تھی کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی
بحث کیا خاک کرے حضرتِ واعظ سے کوئی میں کبھی آنکھ کی دیکھی، وہ، سُنی کانوں کی
اپنی آنکھوں سے پلا دیجئے جسطرح بنے مجھ سے اب خاک نہ چھنوائیے میخانوں کی
محفلِ حُسن کی باقی ہے فقط یاد اتنی کچھ پرِ سوختہ، کچھ خاک تھی پروانوں کی

آج دُنیا نہیں سُنتی ہے تو نشتر نہ سُنے
ایک دن قدر کریگی مرے افسانوں کی

۱۷۳ ۱۳

عمر کی کوئی گھڑی یاد سے خالی نہ گئی میرے دل سے تری تصویرِ خیالی نہ گئی
کیا ضرورت تھی بلانے کی سرِ طور آخر ایک حسرت بھی تو موسیٰ کی نکالی نہ گئی
پوری ہو سکتی تھی تعمیرِ محبت کیونکر ایک انداز سے بنیاد ہی ڈالی نہ گئی
ہیچ ہو کر بھی سمجھتا ہے کہ میں سب کچھ ہوں آدمی کی یہ کبھی خام خیالی نہ گئی
آپکے دید کا ارمان تھا کب سے دلمیں وقت آیا تو نظر آپ پہ ڈالی نہ گئی
جان ہم نذرِ قضا کرتے، یہ مشکل تھا مگر خواہشِ دوست سے مجبور تھے، ٹالی نہ گئی
کیا مزیدار محبت کی تھی اپنی یہ شکست ہار کی ہار ہوئی، ہاتھ سے پالی نہ گئی

یہ غلط ہے کہ ہمیں طاقتِ دیدار نہ تھی — ہم سے خود حسرتِ دیدار نکالی نہ گئی

جب میں بیتاب ہوا اُن کیلئے، وہ آئے — دل سے جب آہ نکالی، کبھی خالی نہ گئی

کونسی بات نہ سننی پڑی مجھکو بے عذر — میری کس بات میں اک شاخ نکالی نہ گئی

باغباں یوں تو سمجھتا تھا چمن کو اپنا — جب گیا باغ سے ساتھ ایک بھی ڈالی نہ گئی

عذر کرتے نہ بنی آج انھیں بھی آخر — دل بھر آیا تو مری بات بھی خالی نہ گئی

یادِ ایام، تھے جب اپنے چمن میں ڈیرے — جو گھٹا باغ پہ آئی، کبھی خالی نہ گئی

کیا خبر دل پہ اثر وقتِ اسیری کیا تھا — آخری ایک نظر باغ پہ ڈالی نہ گئی

جھوٹا وعدہ ہی سہی، قول تو ظالم نے دیا — میں تو یوں خوش ہوں، مری بات تو خالی نہ گئی

قتلِ مظلوم کو اے چرخ زمانہ گذرا — تیرے دامن سے مگر خون کی لالی نہ گئی

یاد کیا کرکے ہم اب ہجر کی راتیں کاٹیں؟ — اک نظر آپ سے چلتے ہوئے ڈالی نہ گئی

یوں تو ہر سمت سے گلشن میں گھٹائیں اٹھیں — دل سے لیکن ہوسِ ابرِ شمالی نہ گئی

دائمی ہجر سے پیچھا نہ چھٹا آخر تک — کوششوں سے بھی بلا ہم سے یہ ٹالی نہ گئی

میں ہوں محرومیِ قسمت کا گنہگار، مگر — آپ سے بھی تو کوئی راہ نکالی نہ گئی

رنج و غم کی ہمیں تکلیف سہی تا دمِ مرگ — چونکہ تکلیف ہماری تھی خیالی نہ گئی

ہے وہ ہی آدمی، جینا ہے اُسی کا نشتر

۱۷۴ ہاتھ سے جس کے کبھی ہمتِ عالی نہ گئی ۲۲

یوں بھی کچھ روز محبت میں بسر ہوجاتی — میری بے چینیوں کی اُن کو خبر ہوجاتی

میری جانب جو تری ایک نظر ہو جاتی
شبِ تاریک بھی ہم رنگِ سحر ہو جاتی

متقاضی میں زیادہ کا نہیں تھا اے ضبط
چار آنسو مجھے ملتے تو بسر ہو جاتی

یوں تو دیدار میسر نہ ہوا اور نہ ہو
کچھ بلند اور یہ کمبخت نظر ہو جاتی

کاش اس درجہ محبت میں اثر ہو جاتا
کچھ نہ کہتا میں اُنھیں میری خبر ہو جاتی

پھر سمجھتا میں تجھے، اور جفاؤں کو تری
یہ میری آہ، جو مانوسِ اثر ہو جاتی

صبحدم، گرم خبر ہے کہ وہ آئیں گے ضرور
آج کی رات کسی طرح بسر ہو جاتی

ہو گئی ٹیس جگر کی مرے کچھ کم ورنہ
اور بڑھتی تو یہی دردِ جگر ہو جاتی

دیکھنے والے زمانے کے، مری بھی سنتا
میری جانب بھی کبھی روز نظر ہو جاتی

کیوں تری بزم سے ناکام پلٹتے ہم، اگر
قوتِ دید بہ اندازِ نظر ہو جاتی

تھی جو قسمت میں شبِ غم تو یہی ہو جاتا
جب میں گھبراتا اُسی وقت سحر ہو جاتی

تیرے وعدے کا یقیں تو مرے دلکو تھا ضرور
اور اچھا تھا جو تائیدِ نظر ہو جاتی

لوٹتی بادِ سحر اُنکی گلی سے جدم
کیا بُرا تھا، جو گھڑی بھر کو ادھر ہو جاتی

بچ گیا عاشقِ ناشاد شبِ ہجر ضرور
ورنہ اب تک تو زمانے میں خبر ہو جاتی

کون پاداشِ گنہ سے تھا بچانیوالا
اُنکی رحمت نہ اگر سینہ سپر ہو جاتی

آبروِ عرصۂ محشر میں مری رہ جاتی
مہربانی جو تری دیدۂ تر ہو جاتی

ہے یقیں پھر وہ کبھی ظلم نہ مجھپر کرتے
میرے دل کی اُنھیں اے کاش خبر ہو جاتی

یاد نے تیری جگایا مجھے شب بھر ظالم
دو گھڑی اور نہ آتی تو سحر ہو جاتی

۱۷۵ بچ نہ سکتا تھا مریضِ غمِ فرقت نشتر ۱۹
ٹیس اگر قلب کی ہمرنگِ جگر ہو جاتی

لکھدے تحریر پرانی کوئی تحریر نئی
کردے تقدیر مری کاتبِ تقدیر نئی

روز تکلیف ہمیں دیتی ہے تقدیر نئی
قصد ہے روز کریں ہم کوئی تدبیر نئی

رحمتِ حق مجھے دامن میں لیگی کیونکر
ایک میں نے ہی تو کچھ کی نہیں تقصیر نئی

مسجد و خانۂ خمار میں کیا نسبت شیخ
میری تعمیر پرانی، تری تعمیر نئی

قید ہوں کب سے رہا کر بھی کہیں اے صیاد
ہو گئی کتنی پرانی، مری زنجیر نئی

ایکبار اور ترے ملنے کی کوشش کرتے
ہمیں تقدیر سے ملجاتی جو تقدیر نئی

دل کی تخلیق کے ہمراہ ہوئی ہے کندہ
پردۂ دل پہ نہیں ہے تری تصویر نئی

آمدِ موسمِ گل سن کے ہمیشہ صیاد
ڈالدیتا ہے مرے پاؤں میں زنجیر نئی

خفگی ہو جو مرے کی تو مزہ آئے نیا
آج ممکن ہو تو ایجاد کوئی تقصیر نئی!

خواہشِ حال کبھی، خواہشِ ماضی ہے کبھی
کبھی زنجیر پرانی، کبھی زنجیر نئی

خواہشیں جتنی تھیں سب میں نے فنا کر ڈالیں
اب عنایت ہو مرے واسطے زنجیر نئی

روز مٹ مٹ کے ابھرتی ہے تمنا دل میں
وہ ہی زنجیر پرانی، وہ ہی زنجیر نئی

تازہ کر لیتا ہوں بھولی ہوئی خواہش اپنی
کہنہ زنجیر بھی ہو جاتی ہے زنجیر نئی

روز اک دل میں تمنا مجھے پیدا کرتی
روز دانستہ پہنتی مجھے زنجیر نئی

روز گذری ہوئی افسانوں کو یکجا کر کے
ٹوٹی کڑیوں سے بنا لیتا ہوں زنجیر نئی

عقل کو دخل نہ دے چھوڑ خدا پر سب کچھ — عقل تیار کیا کرتی ہے زنجیر نئی

۱۷۶ ہو گیا ظلم میں کچھ اور اضافہ نشتر — یہ دعاؤں نے دکھائی مری تاثیر نئی ۱۷

کیا جان کا ملال، بلا سے نکل گئی — آئی بکامِ زیست، بکامِ اجل گئی

آئی بہار باغ کی رنگت بدل گئی — ہر برگ سبز ہو گیا، ہر شاخ پھل گئی

کیوں تیرے اک گلے پہ گلے پڑ گئے مرے — اک بات تھی نکل گئی مُنہ سے نکل گئی

توبہ کیو اسطے کہیں واعظ کے نہ پھر — اسوقت تو خدا کی عنایت سے ٹل گئی

رودادِ عشق اب مری سُنتا ہی کون ہے — ہاں بزمِ ناز میں جو کبھی بات چل گئی

ہے اس ہوس میں کی بھوک بھی ظالم غضب کی بھوک — اب بھی ہے منہ کھلا ہوا، دنیا نگل گئی

تھی پاسباں جو گل سے مری آہِ آتشیں — کترا کے آج باغ سے بجلی نکل گئی

اے بوالہوس، ہوس کی یہ مستیوں کو چھوڑ — ہونے کو صبح آگئی، اب رات ڈھل گئی

فصلِ خزاں کی توبہ بھی توبہ بھی واعظو — ہم کیا کریں بہار میں نیت بدل گئی

بیتی ہزار بار کی کہتا ہوں تجھ سے میں — جب تو بدل گیا مری دُنیا بدل گئی

اب لذتِ اسیریِ زنداں نہ پوچھئے — اک پھانس تھی رہائی کی، وہ بھی نکل گئی

سو آرزوئیں ساتھ میں آئی تھی لیکے روح — سو آرزوئیں ساتھ میں لیکر نکل گئی

سب جانتے ہیں موت یقینی ہے ایک دن — پھر بھی جب اُسکا ذکر چلا جان نکل گئی

کیوں مرنیوالے کے لئے ماتم کرے کوئی — کیا کم ہے یہ کہ موت کی حسرت نکل گئی

آہی گئے وہ پوچھنے بیمارِ ہجر کو — اپنا سا منہ لئے ہوئے آخر اجل گئی

پہونچے مزار میں تو قیامت کے خوف سے

١٧٧ نشتر زمین پانوں تلے سے نکل گئی ١٦

کیوں نہ دیکھا میں نے تجھکو، یہ مری تقصیر تھی — ورنہ ہر تصویر دُنیا میں، تری تصویر تھی

ہجر کا باعث ہماری وصل کی تدبیر تھی — چاہتے تھے جس سے ہم بچنا، وہ ہی تقدیر تھی

کاٹنے والے شبِ آلام کے دو ہی تو تھے — ایک میں تھا، ایک میری خاطرِ دلگیر تھی

کس کو یہ اُمید تھی، وہ وقت پر آجائینگے — وہ تو بیمارِ محبت کی بڑی تقدیر تھی

لذّتِ قیدِ قفس نے عمر بھر رکھا اسیر — اور زنجیریں تو تھیں ہی، یہ بڑی زنجیر تھی

قیدِ ہستی بھی عجب اِک قید تھی انسان کو — کوئی زنداں تھا، نہ کچھ پابندیٔ زنجیر تھی

زندگی بھر جو نہ آئے تھے، وہ آئے قبر پر — ہم نہ تھے لیکن ہماری خاک دامنگیر تھی

راتدن اس کے بچانے کی رہا کرتی تھی فکر — میری آزادی بھی میری جان کو زنجیر تھی

دونوں ہی ناکامیٔ نظارہ کے تھے ذمہ دار — کچھ مری تقصیر تھی، کچھ آنکھ کی تقصیر تھی

عرصۂ محشر میں مجھ پر جا کے یہ عقدہ کھُلا — بدنصیبی زندگی میں مانعِ تقصیر تھی

کیا ہوئے وہ دن محبت کے مرے اے جذبِ عشق — با اثر نالے بھی تھے، آہوں میں بھی تاثیر تھی

تیری رحمت کا یقیناً کچھ اشارہ اس میں تھا — ورنہ کیوں ہر دم طبیعت مائلِ تقصیر تھی

اب مری تقریر رکھتی ہے، خموشی کا اثر — ایک دن وہ تھا کہ خاموشی مری تقریر تھی

جب کبھی تقدیر بگڑی، کچھ نہ ہم سے بن پڑی — ہم نے جو تدبیر کی، وہ تابعِ تقدیر تھی

ارتکابِ جُرم سے پہلے، یہ ہی پیدا ہوئی
خواہشِ تقصیر گویا، مادرِ تقدیر تھی

میں اسیر، اور پھر اسیرِ لذتِ قیدِ قفس
یعنی پابندی مری، زنجیر در زنجیر تھی

میں شبِ غم بسترِ غم پہ کہاں تھا ہمنشیں
وہ تو گویا انتظارِ یار کی تصویر تھی

موت میں مستور نکلی اِک حیاتِ مستقل
خواب سے اچھی ہمارے خواب کی تعبیر تھی

کون پابندِ ہوس اِس قیدِ ہستی میں نہ تھا
ساری دُنیا قید تھی اور ایک ہی زنجیر تھی

پار ہونا چاہیئے تھا، دل میں چھِد کر رہ گیا
تھی خطائے دل نہ جانے، یا خطائے تیر تھی

مار ڈالا لذّتِ قیدِ قفس نے کیا کہیں
ورنہ یہ زنجیرِ پا، زنجیر میں زنجیر تھی

وحشتِ دل نے جو چھوڑا بھی تو دو دن کے لئے
چار دن میں پھر وہی پا ہم تھے، وہ ہی زنجیر تھی

ایک کے بس میں نہ تھا جو قید کر لیتا مجھے
آرزوئے قید بھی تو تھی، جہاں زنجیر تھی

میں تمہاری قید میں تھا مجھ سے کیسی بازپُرس
یہ بھی تو سوچو، کہ میرے ہاتھ میں تقصیر تھی؟

رحمتِ حق سے کہو کیوں موڑتی ہے مجھ سے مُنہ
آرزوئے جُرم بھی تو آخر اِک تقصیر تھی

مرگِ عاشق کا نہ ہو ماتم، یہ ممکن ہی نہیں
نعشِ پروانہ پہ آخر شمع بھی دلگیر تھی

کیوں نہ کرتا میں محبت آپ ہی فرمایئے
جب محبت آپ کی وابستۂ تقدیر تھی

دیکھتا اگر شبِ فرقت کوئی نقشہ مرا
دل جہاں تھا اِس جگہ حسرت کی اِک تصویر تھی

جُراتِ عشق آپ نے اپنی جفا پر ٹال دی
کس قدر تھوڑی سزا، کتنی بڑی تقصیر تھی

فطرتِ پروانہ اسکی موت کی باعث ہوئی
شمع کی اِسمیں خطا کیا، شمع بے تقصیر تھی

فی زمانہ منزلِ مقصود ملتی ہے کسے
مل گئی نشتر تجھے، تیری بڑی تقدیر تھی

۱۷۸ حضرتِ نشترؔ عجب حالت میں کل دیکھے گئے
آنکھ میں آنسو بھرے تھے، ہاتھ میں تصویر تھی ۳۲

لاکھ نشترؔ میں رہا ناکامیابِ عاشقی
رہ نہیں سکتا ہوں محرومِ ثوابِ عاشقی

عشق کہتے ہیں کسے، اسکا پتہ کوسوں نہیں
دیکھتا ہے، دیکھیے جسکو وہ خوابِ عاشقی

ہم وفا کو اور جفا کو جانتے ہیں اسعدؔ
اک سوالِ عاشقی ہے، اک جوابِ عاشقی

تو خرابِ عشق پر ہنستا ہے کیوں اے بوالہوس
حاصلِ کونین ہے ہونا خرابِ عاشقی

کسل عاشق کو نہیں ہوتا وہی ہے اسکا کسل
جب پیا وہ ظرف سے پی لی شرابِ عاشقی

ہر وفا پر تو نے میری، سو جفائیں مجھ پہ کیں
کیا یونہی دیتے ہیں اے ظالم جوابِ عاشقی

جس سے ڈرتا ہے زمانہ جسکو سب کہتے ہیں موت
وہ مرے نزدیک ہے کیفِ شرابِ عاشقی

طور کی تعبیر کا ہم پر اثر کچھ بھی نہیں
ہم برابر دیکھتے آئے ہیں خوابِ عاشقی

کیا خبر ہمکو کہ دُنیا جا رہی ہے کس طرف
ہم تو ہیں شام و سحر مستِ شرابِ عاشقی

وہ نمایاں ہیں تو یہ بھی دم زدن میں ہیں عیاں
ہے حجابِ حسن خود وجہِ حجابِ عاشقی

عشق و وحشت کا مزہ ہے اے دلِ ناداں یہی
شوقِ تا حدِ جنوں ہو ہمرکابِ عاشقی

جو ہمارے پاس سرمایہ تھا، اب ہے اُنکے پاس
کہتے ہیں شاید اسی کو انقلابِ عاشقی

ہیں کہیں نالے، کہیں فریاد ہے، آہیں کہیں
بج رہے ہیں ہر طرف چنگ و ربابِ عاشقی

۱۷۹ عرصۂ محشر میں نشترؔ ایک ہل چل مچ گئی
حشر میں جس وقت میں پہونچا خرابِ عاشقی ۱۴

کرلے جو کرنا ہے، جبتک گلستاں ہے زندگی
ایک دن آخر تو بربادِ خزاں ہے زندگی

زندگی اُنکے لئے نشتر کہاں ہے زندگی
موت ہے جنکو سکوں، دردِ نہاں ہے زندگی

دل ہوا گرمی سے خالی، پھر کہاں ہے زندگی
آگ سے اپنی الگ ہو کر دُھواں ہے زندگی

عشق خود ہے زندگی، عاشق فنا کسطرح ہو
موت کا قابو کہاں جب درمیاں ہے زندگی

موت سے بچنا ہے تو ہو واصلِ ذاتِ خدا
موت میں بھی ورنہ اے غافل نہاں ہے زندگی

موت میں مضمر اگر ہے زندگی مستقل
موت کہتے ہیں جسے وہ بیگماں ہے زندگی

موت انسان کو گھڑی بھر بھی نہ زندہ چھوڑتی
وہ تو یہ کہئے کہ ہر دم پاسباں ہے زندگی

زندگی وہ ہے جو تیری یاد میں کٹ جائے صرف
دوسری صورت میں مرنا ہے، کہاں ہے زندگی

دیکھتا اسکو کوئی جب تھی نہ مانوسِ فراق
زندگی جو زندگی تھی، اب کہاں ہے زندگی

میں سمجھتا ہوں کہ ہے اُسکی روانی وجہِ موت
لوگ کہتے ہیں کہ یہ عمرِ رواں ہے زندگی

ایک وہ ہیں چہچہے گلشن میں ہیں جنکو نصیب
ایک ہم ہیں قید میں صرفِ فغاں ہے زندگی

عاشقوں کی زندگی اور موت ہی سب سے جُدا
موت اِن لوگونکی خاموشی، فغاں ہے زندگی

داستانِ زندگی اپنی کسی سے کیا کہیے
جو سمجھتا ہے کہ خود اک داستاں ہے زندگی

دیکھئے جس کو لئے پھرتا ہے اپنے ساتھ موت
موت کا اک چلتا پھرتا کارواں ہے زندگی

آدمی کی زندگی کا ٹھیک اک ساعت نہیں
گو سمجھتا ہے کہ میری جاوداں ہے زندگی

زندگی بھی زندگی کوئی ہے ہجرِ یار میں
لاکھ میں کہنے کو یوں کہدوں کہ ہاں ہے زندگی

وصل ہے اُسکا کبھی قسمت، کبھی فرقت نصیب
فصلِ گُل ہے زندگی، فصلِ خزاں ہے زندگی

موت سے پہلے خزاں کا خوف ہے ہر دم اسے
موت آنے پر بہارِ بے خزاں ہے زندگی

موت میں اور زندگی میں فرق اتنا ہی تو ہے
موت ہے وجہِ سکوں، وجہِ فغاں ہے زندگی

جسم مٹی ہے اگر اس میں نمودِ جاں نہ ہو
جسم اک دریا ہے اور آبِ رواں ہے زندگی

موت میں اور زندگی میں فرق کرنا ہے فضول
اک نہاں ہے زندگی، تو اک عیاں ہے زندگی

شامِ ہستی دیکھئے، روزِ ازل کو دیکھئے
آدمی کو آج تک رازِ نہاں ہے زندگی

زندگی ہی کی طرف تنہا نہ رکھ اپنی نظر
موت بھی اک چیز ہے آخر جہاں ہے زندگی

جب محبت تھی کسی سے زندگی کا لطف تھا
۱۸۰ اب ہماری زندگی نشتر کہاں ہے زندگی ۲۴

دیکھو کسی دن آ کے دلِ داغدار بھی
اس لالہ زار میں ہے خزاں بھی بہار بھی

کیفیتِ الم بھی، فریبِ قرار بھی
کیا چیز ہے خدا کی قسم انتظار بھی

دُنیا میں رہ کے رنج و الم سے گریز کیا
پھُولوں کے ساتھ ہوتے ہیں پیوستہ خار بھی

آنا بھی اُنکا قہر، نہ آنا بھی اُنکا قہر
آئے تو لے گئے مرا صبر و قرار بھی

اے موت تو نے کان میں کیا اُس کے کہہ دیا
اب ہے سکوں پذیر دلِ بیقرار بھی

دو پھُول کون قبر پہ آکر چڑھا گیا
پھُولی نہیں سماتی زمینِ مزار بھی

بھُولیں نہ اے بہار تری گلفشانیاں
کونے میں اک طرف ہے ہمارا مزار بھی

وہ میرے پاس بیٹھے ہیں مجھ سے کھچے ہوئے
یعنی میں نامراد بھی ہوں کامگار بھی

اُس سنگدل کا عشق جو دینا تھا اے خدا
دینا تھا اپنے دل پہ مجھے اختیار بھی

اس تیری خاکسار نوازی کا شکریہ — اک چیز ہو گئی مری مشتِ غبار بھی
شکوہ یہی ہے عشرتِ شامِ وصال سے — لاتی ہے اپنے ساتھ غمِ اختصار بھی
ہر شیر سار کو نہیں ہوتی کبھی نصیب — دل دیکھتی ہے رحمتِ پروردگار بھی
اُس چشمِ مست ناز کے قربان جائیے — میں تارکِ شراب بھی ہوں بادہ خوار بھی
اے دل شبِ وصال پہ اترا نہ اس قدر — آتی ہے اس کے بعد شبِ انتظار بھی
رونا خزاں کو بیٹھ کے نشتر فضول ہے
آئیگی پھر چمن میں کسی دن بہار بھی

۱۸۱ — ۱۵

دو ہاتھ چل کے قاتل و بسمل میں رہ گئی — اُمید دل کی دونوں طرف دل میں رہ گئی
مجھ کو نکال کر کبھی سوچا بھی آپ نے — کیا بات جب سے آپکی محفل میں رہ گئی
کیا میرے دل میں رہ گئی مجھ سے نہ پوچھیے — جو دل میں رہ گئی، وہ مرے دل میں رہ گئی
اے جذبِ شوق، اور لئے چل یونہی مجھے — اب کیا بڑی کسر مری منزل میں رہ گئی
قاتل کبھی خیال اُدھر بھی ترا گیا — تصویر تیری دیدۂ بسمل میں رہ گئی
اے پاسِ ضبط تو نے بچایا ہے بارہا — دل سے شکایت اُٹھ کے مرے دل میں رہ گئی
دیکھیں طریقِ عشق میں دیتا ہے ساتھ کون — شمعِ خرد تو پہلی ہی منزل میں رہ گئی
وہ اور مجھکو پوچھتے، کچھ اے نگاہِ یاس — تیرے سبب سے آبرو محفل میں رہ گئی
دل لیکے انکی بزم سے کیونکر میں لوٹتا — محفل کی اُنکی چیز تھی محفل میں رہ گئی
بسمل کی چشمِ یاس نے کچھ کہدیا ضرور — تلوار کانپ کر کفِ قاتل میں رہ گئی

بھٹکی بھری نگاہ، دمِ قتل ہر طرف — پھر جذب ہو کے چہرۂ قاتل میں رہ گئی
لاکھوں حسیں آپ سے اُس نے بنا لئے — تصویر آپکی جو مرے دل میں رہ گئی
اتنی ہی یاد ہے خلشِ عشق کی مجھے — نکلی کسی کے دل سے مرے دل میں رہ گئی
کتنی ہی اپنے دل کی کہوں نشترؔ اُن سے میں
پھر بھی یہ دیکھتا ہوں، بہت دل میں رہ گئی

۱۸۲ ۱۴

کمالِ عجز کا امکان ہی نہیں باقی — کہ ہونگے سجدے ہزاروں جو ہے جبیں باقی
فلک رہیگا نہ باقی، نہ یہ زمیں باقی — یہ سب مٹیں گے رہو گے فقط تمھیں باقی
نہ دوست ہے کوئی باقی نہ ہمنشیں باقی — بس ایک میں ہوں کہ میرا دلِ حزیں باقی
خودی بھی جائے تو سمجھوں کہ مٹ گئے دشمن — ہے اک یہ اور ابھی مارِ آستیں باقی
نہ مطمئن مری خاموشیوں سے ہو دنیا — ابھی ہے دل میں مرے آہِ آتشیں باقی
ترے وصال کی خواہش نہ ہو کبھی پوری — جو دل میں یہ نہیں باقی تو کچھ نہیں باقی
ہمیں بہارِ گذشتہ دلا رہے ہیں یاد — بہارِ رفتہ کے کچھ چاکِ آستیں باقی
یہ فتنہ رفتہ ہوا دل میں قحطِ صبر و سکوں — کہ اب قرار کہیں نام کو نہیں باقی
ہوس جائیگی انساں کی زندگی میں کبھی — نفس رہیگی ہے جبتک کہ انگبیں باقی
کہاں کی جیب کسے فکر ہے گریباں کی — یہ ہی بہت ہے جو رہ جائے آستیں باقی
تمام عمر رہی صرفِ سجدہ در یار — ہنوز ہے وہ ہی بیتابئ جبیں باقی
کسی کے عشق میں کیا اور ہو گئی تھی جبیں — نہ لطفِ سجدہ وہ اب ہے نہ وہ جبیں باقی

جو تونے مجھ سے محبت نہ کی تو اے بے مہر   میں جانتا ہوں محبت کہیں نہیں باقی
کرونگا نذرِ جنوں فصلِ گل میں کیا اب کے   نہ جیب ہے، نہ گریباں، نہ آستیں باقی
یہی جو زورِ طبیعت ہے کچھ دنوں نشتر   نہ رہنے دیگا کوئی شعر کی زمیں باقی

خدا کے لطف و کرم کا ہے شکر اے نشتر
۱۸۳   ہمارے دل میں کوئی آرزو نہیں باقی   ۱۵

جو معتقدِ پیرِ خرابات نہ ہوگی   کچھ اور بلا ہوگی، مری ذات نہ ہوگی
کیوں ہجر میں ہی جان کے درپے دلِ مضطر   پھر شام نہ ہوگی کبھی یا رات نہ ہوگی
بھولا ہی نہ بھولیگا وہ طولِ شبِ فرقت   معلوم یہ ہوتا تھا کہ اب رات نہ ہوگی
تا عمر جوانی نہ چلیگی دلِ ناداں   اک روز وہ آئیگا کہ یہ رات نہ ہوگی
کب روزِ جدائی کی مرے صبح ہوئی تھی   کیا دن ہی رہیگا کبھی اب رات نہ ہوگی
دُنیا میں کوئی کام وہ کر ہی نہ سکیگا   جس شخص سے پابندیٔ اوقات نہ ہوگی
اُس شخص سے اس رات کی کیفیت پوچھو   دُنیا میں جسے لوٹ کے پھر رات نہ ہوگی
جب بیٹھ گئے پینے پہ خُم کر دئے خالی   مینوشی کبھی ہم سے بدفعات نہ ہوگی
نشتر وہ زمانہ ہے کہ دیکھے گا نہ کوئی   جبتک کہ ترے شعر میں کچھ بات نہ ہوگی

نشتر مری دُنیائے محبت سے زیادہ
۱۸۴   دُنیا کوئی وابستۂ آفات نہ ہوگی   ۱۰

الٰہی کیا وہ ظالم مجھ پہ ہوگا مہرباں پھر بھی   کیدن یہ دلِ ویرانہ ہوگا گلستاں پھر بھی؟

جلا کر خاک کر ڈالا مگر سیری نہیں ہوتی
ابھی منڈلا رہی ہیں گلستاں پر بجلیاں پھر بھی

ہزار اُن کو تسلّی دو، ہزار اُن کو تشفّی دو
فغاں کی جنکو عادت ہو کرینگے وہ فغاں پھر بھی

ہزاروں طرح کے کھٹکوں میں ہوتی ہو بسر لیکن
کیے جاتے ہیں اپنے آشیاں کو آشیاں پھر بھی

شکارِ یاس ہوتے ہیں، ہزاروں روز لٹتے ہیں
رواں ہیں راہ میں تیری ہزاروں کارواں پھر بھی

یہ مانا رازِ دل باہر نہ ہونا چاہیے دل سے
محبّت میں ضروری ہے مگر اک رازداں پھر بھی

ہزاروں طرح کی تکلیف صبح و شام ہوتی ہے
بہت آرام ہے انساں کو زیرِ آسماں پھر بھی

گھڑی میں اسکی کچھ حالت گھڑی میں اسکی کچھ حالت
کیے جاتی ہے دُنیا اعتبارِ گلستاں پھر بھی

ہزار اس کو کہے دُنیا، کہ ہے تاثیر سے خالی
بہت کچھ پُر اثر ہوتی ہے آہِ عاشقاں پھر بھی

قفس میں ہوں، رہائی محتمل ہے، پر شکستہ ہیں
ہمیشہ دیکھتا رہتا ہوں خوابِ آشیاں پھر بھی

ہمیں پہونچا دیا دونوں نے ان ہاڑوں محبّت میں
زمیں پھر بھی زمیں ہے، آسماں ہے آسماں پھر بھی

ہزاروں ہو چکے ہیں امتحاں پر امتحاں میرے
ہزاروں امتحاں پر ہو رہے ہیں امتحاں پھر بھی

فراقِ جسم و جاں ہونا سمجھتا ہے کہ لازم ہے
بہت کھلتا ہے انساں کو فراقِ جسم و جاں پھر بھی

یہ مانا شعر میں تخیُّل لازم ہے مگر نشتر
سخن گوئی میں ہے اک چیز اندازِ بیاں پھر بھی

۱۸۵ ۱۴

شاد کامِ دو جہاں ہے شاد کامِ عاشقی
اختتامِ زندگی ہے، اختتامِ عاشقی

کیا ہوئے وہ رات دن، وہ صبح و شامِ عاشقی
ہر صدا دیتی تھی جب مجھکو پیامِ عاشقی

موت انساں کو نہیں آتی جو ہم سے پوچھیے
پی کے سو جاتے ہیں اک دن لوگ جامِ عاشقی

ظرفِ جامِ عاشقی سے دنگ ہوں حیران ہوں
ساری دُنیا مست ہے اور ایک جامِ عاشقی

عاشقی کو کیوں نہ میں کونین پر ترجیح دوں
بادشاہوں کو بھی دیکھا ہے غلامِ عاشقی

میں حیات و موت کو اتنا سمجھتا ہوں فقط
ایک صبحِ عاشقی ہے ایک شامِ عاشقی

ماجرائے طورِ حسن دنگ ہے سارا جہاں
ہے مری اِک داستانِ ناتمامِ عاشقی

کیا کسے عاشقی میں دلنوازی کو کہوں
صبحِ روشن سے کہیں اچھی ہے شامِ عاشقی

کاش ہو جاتی وفا بھی فطرتِ حُسن و جمال
یوں بھی ہوتا کچھ دنوں یارب نظامِ عاشقی

زندگی اسکی ہے موت اسکی ہے، دُنیا اسکی ہے
جو پیامِ موت کو سمجھے پیامِ عاشقی

وسعتِ عالم کی آزادی کو لیکر کیا کروں
مجھ کو اچھا ہے کہیں حبسِ دوامِ عاشقی

ایک وہ جو عاشقی کے مرحلے طے کر چکے
ایک میری داستانِ ناتمامِ عاشقی

وائے ناکامی کہاں دینے لگی طاقت جواب
آگیا جب سامنے نظروں کے بامِ عاشقی

دیکھئے کیسے نبھے، کیونکر نبھے، کبتک نبھے
وہ تمامِ بے نیازی میں تمامِ عاشقی

اور صورت پنجۂ دُنیا سے چھٹنے کی نہیں
فکرِ دُنیا چھوڑ دے ہو جا تمامِ عاشقی

شورشِ رنج و الم کا کون ذمہ دار ہو؟
روز لکھ لیتا ہوں سارے غم بنامِ عاشقی

رات دن تجھکو جزائے عاشقی کی فکر ہے
بوالہوس کرتا ہے کیوں بدنام نامِ عاشقی

ہر جفائے یار پر اے دل یہ نالے یہ فغاں!
کیوں مٹاتا ہے ارے کمبخت نامِ عاشقی

جلوۂ خالق کجا نشتر کجا طور و کلیم
اللہ اللہ کتنا اونچا ہے مقامِ عاشقی

قبر بھی کیا جگہ ہے راحت کی ۔۔۔ نیند بھی آئی تو قیامت کی
یاد ہے ہم کو رات فرقت کی ۔۔۔ اک گھٹا دل پہ تھی مصیبت کی
ہجر کے روز و شب کو کیا کہیے ۔۔۔ دن قیامت کا رات آفت کی
ہو گئیں خواب میری آنکھوں کو ۔۔۔ وہ نگاہیں تری محبت کی
مٹ گیا دل کا داغ بھی افسوس ۔۔۔ وہ نشانی غمِ محبت کی!
یوں محبت ہو کچھ دنوں اے دل ۔۔۔ لوگ کھائیں قسم محبت کی
بارِ خاطر ہے اُن کو بوئے سمن ۔۔۔ انتہا ہو گئی نزاکت کی
کیا زمانے کو لائیں خاطر میں ۔۔۔ آنکھ دیکھے ہوئے محبت کی
داغہائے دلِ حزیں کیا ہیں ۔۔۔ یادگاریں ہیں کچھ محبت کی
کیا کرے کوئی ایسے دن اور رات ۔۔۔ دن جُدائی کے، رات فرقت کی
ساتھ وہ بھی گئی محبت کے ۔۔۔ تھی جو دُنیا مری محبت کی
دل میں ہو ذوق اگر تڑپنے کا ۔۔۔ ایک نعمت ہے رات فرقت کی
ایک یہ معصیت بھری دُنیا ۔۔۔ ایک دُنیا مری محبت کی
مجھ کو عصیاں سے واسطہ کیا تھا ۔۔۔ یہ بھی چشمک تھی تیری رحمت کی
حُسن اور یہ مرا غریب کدہ! ۔۔۔ یہ کدھر آج تم نے زحمت کی؟
ساکنانِ لحد کا کیا کہنا ۔۔۔ نیند لیتے ہیں سب قیامت کی
جل رہا ہوں ورا اُف نہیں کرتا ۔۔۔ ہائے مجبوریاں محبت کی!

کیوں دلاتے ہو بار بار یقیں
آنکھ چھپتی نہیں محبت کی

پھر فریبِ جہاں کہاں نشتر
کھل گئی جس دن آنکھ عبرت کی

۱۸۷ ۱۹

کوشش نہیں ہوتی یا تدبیر نہیں ہوتی
تبدیل کبھی لیکن تقدیر نہیں ہوتی

نظروں میں تمہاری جب تصویر نہیں ہوتی
ظلمت کدۂ دل میں تنویر نہیں ہوتی

کم تیر سے، واعظ کی تقریر نہیں ہوتی
اور اس پہ یہ شکوہ ہے تاثیر نہیں ہوتی

اب ننگ دعاؤں کا، یہ دیکھ رہا ہوں میں
تسکین تو ہوتی ہے، تاثیر نہیں ہوتی

اس روز سمجھتا ہوں، میں باغیِ رحمت ہوں
جس روز کوئی مجھ سے تقصیر نہیں ہوتی

کیوں فکرِ اسیری میں صیاد پریشاں ہے
زنجیر کبھی مجھ کو زنجیر نہیں ہوتی

دیوانے کا سپنا ہے یہ خوابِ محبت بھی
فی الجملہ کوئی اس کی تعبیر نہیں ہوتی

قسمت میں جو لکھا ہے وہ مٹ ہی نہیں سکتا
تدبیر ہم آثارِ تقدیر نہیں ہوتی

جب ایک ہی کاتب ہے ہر لوحِ مقدر کا
کیوں ایک سی دنیا کی تقدیر نہیں ہوتی

کیوں دل میں نہ رکھیں ہم، تصویر تری پنہاں
ہم سے تو محبت کی تشہیر نہیں ہوتی

تقصیر چھپالی ہے، محشر کے لئے اپنی
اس چیز کی دنیا میں توقیر نہیں ہوتی

ہے مطمئن اس درجہ صیادِ مرا مجھ سے
اب پاؤں میں دو دن زنجیر نہیں ہوتی

ترکیبِ دعا سے خود واقف نہیں یہ دنیا
اور پھر یہ شکایت ہے، تاثیر نہیں ہوتی

تقدیر سے لڑنے کو تدبیر تو کرتا ہوں
قسمت سے مگر پوری تدبیر نہیں ہوتی

کچھ دیر تو زنداں میں آزاد بھی رکھ ظالم — ہر وقت پہننے کو زنجیر نہیں ہوتی
ناراض نہ ہو ہم سے، معلوم نہ تھا ہمکو — ہاتھوں میں پہننے کو زنجیر نہیں ہوتی
زنجیرِ محبت بھی زنجیر انوکھی ہے — ہوتی ہے مگر پھر بھی زنجیر نہیں ہوتی
اُس وقت پہونچتا ہوں مقتل میں ہمیشہ میں — جب ہاتھ میں قاتل کے شمشیر نہیں ہوتی
اِس شمع کا دل آخر پتھر ہے کہ آہن ہے — پروانوں کے جلنے پر دلگیر نہیں ہوتی
ہے قدر وہی دل میں ایمانِ محبت کی — گو روز کے مہماں کی توقیر نہیں ہوتی
صیاد کی خاطر سے وہ لطف ہے زنداں میں — زنجیر اسیروں کو زنجیر نہیں ہوتی
آہیں ہوں کہ نالے ہوں، ہوتے نہیں جب دلسو — ہونے کی طرح ان میں تاثیر نہیں ہوتی
دیکھا تھا اُسے اک دن اور روزِ ازل وہ بھی — پنہاں مگر آنکھوں سے تصویر نہیں ہوتی
تقصیر کا ہونا بھی تقدیر سے ہوتا ہے — تقصیر کو مرتا ہوں تقصیر نہیں ہوتی
زنجیرِ محبت سے، گھبرا نہ دلِ وحشی — ہر شخص کی قسمت میں زنجیر نہیں ہوتی
سب اہل نہیں ہوتے زنجیرِ محبت کے — ہر پاؤں میں موزوں یہ زنجیر نہیں ہوتی
ہے قیدِ عناصر بھی زنجیر حقیقت میں — معلوم بظاہر گو زنجیر نہیں ہوتی
تقصیر نہ کر کے بھی تقصیر کے مجرم ہیں — تقصیر یہ کیا کم ہے، تقصیر نہیں ہوتی
کیوں ہو نہ ادا اُن میں کیوں نہ ہو جفا اُنمیں — سو رنگ نہ ہوں جبتک تصویر نہیں ہوتی
تم انکو تصور میں کیوں کھینچ نہیں لیتے — تسکینِ نظر نشتر تصویر نہیں ہوتی
رحمت پہ بھروسہ رکھ، غمگین نہ ہو نشتر

۱۸۸ دُنیا میں بھلا کس سے تقصیر نہیں ہوتی؟ ۳۱

خوشی قریب جو آئی، تو پھر خوشی نہ رہی
پہونچ گئے لبِ ساحل تو تشنگی نہ رہی

وہ اک خیال وہ مستی، وہ بیخودی نہ رہی
جو زندگی تھی ہماری وہ زندگی نہ رہی

ہمارے حال سے لینے لگی سبق دُنیا
ہماری خامشی دُنیا کو خامشی نہ رہی

سُنا ہے شیخ بھی جانے لگے ہیں میخانے
خدا کا شکر ہے معیوب میکشی نہ رہی

کبھی بہار کے دن تھے، کبھی تھا دورِ خزاں
غرض کسی کی زمانے میں ایک سی نہ رہی

کرے بہار کا کس مُنہ سے شکریہ کوئی
فضائے صحنِ چمن آج ماتمی نہ رہی

گیا جو دل تو گیا دردِ دل کا قصّہ بھی
وہ روز روز کی تکلیفِ دائمی نہ رہی

اُمید سے دلِ تیرہ میں تھی ضیا کیا کیا
رہا نہ چاند جو باقی، تو چاندنی نہ رہی

دیا جو کچھ بھی محبت نے، سیر ہو کے دیا
مجھے کبھی بخدا درد کی کمی نہ رہی

گلے پہ مجھ کو نہ مجبور کر دلِ وحشی
گلہ زباں پہ جو آیا تو عاشقی نہ رہی

یہ کون آج خراماں ہے میری تربت پر
برس رہی تھی جو تربت پہ بیکسی نہ رہی

اُسی کو موت کا دن جانتا ہوں میں اپنی
تمہارے رنج کی جس دن مجھے خوشی نہ رہی

ابھی تو غم ہیں گے نذرِ بیخودی سارے
کہاں رہونگا الٰہی جو بیخودی نہ رہی

حیات کا نہ کرو اعتبار تم نشتر
ہے کوئی ٹھیک بھی کمبخت کا، رہی نہ رہی

۱۸۹ ۱۴

اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہ گئی
شور کرنے سے بھی بیچارہ نوائی نہ گئی

بات بگڑی ہی ہوئی محشر میں بنائی نہ گئی
موج اک اشک کی آنکھوں سے بہائی نہ گئی

عمر بھر چلتی رہی سانس ہماری دن رات
اور پھر لطف یہ دیکھو کہیں آئی نہ گئی

شکریہ بیخودیٔ عشق کا کس منہ سے کروں
میرے نزدیک شبِ ہجر نہ آئی نہ گئی

کر دیا طالبِ دیدار کو تو نے بیہوش
پھر بھی تیری ہوسِ جلوہ نمائی نہ گئی

اجتناب اس سے مناسب ہے تجھے اے انساں
دل میں اک بار جہاں آئی برائی نہ گئی

نام رکھتے نہ مجھے ترکِ محبت پہ کوئی
بات ہی ایسی پڑی تھی کہ بنائی نہ گئی

میرے سودائے محبت کو زمانہ گذرا
آج تک خلق کی انگشت نمائی نہ گئی

جلوۂ یار سے محروم گئے وہ خود بیں
جن سے دنیا میں خودی اپنی مٹائی نہ گئی

رات بھر مجھکو ستاروں نے تڑپتے دیکھا
ان سے بھی کچھ مری تکلیف بٹائی نہ گئی

زندگی جب گئی اکبار تو لوٹی نہ کبھی
اک اجل ہے کہ یہ کمبخت جب آئی نہ گئی

اپنے اعمال ہی ہمراہ گئے دنیا سے
اور دنیا کی کوئی ساتھ کمائی نہ گئی

سوچتے تھے یہ کہیں گے وہ کہیں گے اُن سے
ہم سے صورت بھی قیامت میں دکھائی نہ گئی

خوشنوا دل جو مقدر سے ملا ہے نشتر
١٩٠ کتنے ہی رنج پڑے نغمہ سرائی نہ گئی ١٤

ہوئی کہاں ابھی پینے کی آرزو پوری
پلا بھی دے مرے ساقی ارے سبو پوری

تمام عمر ہوئی ڈھونڈتے تجھے لیکن
ہوئی ہنوز نہ منشائے جستجو پوری

سرورِ عشق کا تکمیلِ آرزو میں کہاں
مزہ ہے اس میں کبھی ہو نہ آرزو پوری

کبھی تو پاؤں تھکیں گے ترے بھی ناکامی ‏ — ‏کبھی تو ہوگی رسائی کی آرزو پوری

یہ سنتے آئے ہیں، ہر شے کی انتہا ہے کمال ‏ — ‏مگر ہوئی نہ کبھی کوئی آرزو پوری

مری وفا کی نہ پوری ہو آرزو نہ سہی ‏ — ‏تری جفا کی تو ہو جائے آرزو پوری

میں جب لذتِ حسرت سے ہو گیا واقف ‏ — ‏تو آرزو ہے نہ ہو کوئی آرزو پوری

تمام عمر ہوئی اُن سے گفتگو لیکن ‏ — ‏کبھی ہوئی نہ تمنائے گفتگو پوری

۱۹۱ نہ آئے موت تو کیا اس کا حشر ہو نشتر
قضا ہی کرتی ہے انساں کی آرزو پوری ۹

وصال سے کہیں اچھا ہے انتظار مجھے ‏ — ‏خزاں بھی دینے لگی ہے بڑی بہار مجھے

نہ دوست چاہیے کوئی نہ غمگسار مجھے ‏ — ‏مگر خدا کرے چھوڑے نہ دردِ یار مجھے

دیا تھا ذوقِ ندامت جو کردگار مجھے ‏ — ‏تو آنکھ بھی مجھے دینی تھی اشکبار مجھے

نہ اب شکیب مجھے ہے نہ ہے قرار مجھے ‏ — ‏یہ کیا بنا دیا تُو نے نگاہِ یار مجھے

نصیب جب سے ہے کیفِ نگاہِ یار مجھے ‏ — ‏تمام خلق سمجھتی ہے بادہ خوار مجھے

خدا کیواسطے مجھکو نہ چھیڑ اے صیاد ‏ — ‏چمن میں ہو کہ نہ ہو جانے پھر بہار مجھے

کبھی خزاں بھی پیامِ بہار دیتی تھی ‏ — ‏اور اب بہار بھی دیتی نہیں بہار مجھے

نشاطِ دہر پہ دُنیا میں کیا کوئی خوش ہو ‏ — ‏خزاں چکیدہ ہے ہر جلوہ بہار مجھے

میں اور عشق میں وارفتہ، قرار غلط ‏ — ‏وہ وقتِ موت ہی، آجائے جب قرار مجھے

مجھے ہے تشنگی کیفِ جاودانی رب ‏ — ‏خزاں کا مُنہ جو نہ دیکھے وہ دے بہار مجھے

قفس میں رہ کے بھی اک افتخار ہے مجھ کو
کہ لوگ کہتے ہیں پروردۂ بہار مجھے

خزاں میں دیکھنے والا ہوں میں بہاروں کا
بہار اپنی دکھاتی ہے کیا بہار مجھے

میں چل رہا تھا اشاروں پر اپنی فطرت کے
وہ نا سمجھ تھے جو سمجھے گناہگار مجھے

یہ اضطراب کی لذت، یہ لطفِ غم توبہ
خدا کرے کہ نہ آئے کبھی قرار مجھے

جگر میں، سینے میں، دل میں، کہیں تو اٹھا ہی درد
تو اُن کے سامنے کرتا ہے شرمسار مجھے!

خرابِ عشق ہی ہونا ہے مقصدِ ہستی
خرابِ عشق ہی کر دے نگاہِ یار مجھے

انھیں ابھی، کششِ دل، ابھی یہاں لے آ
بحالِ زار وہ دیکھیں بحالِ زار مجھے

وفا پرست نے جانا مجھے وفا کردار
ستم شعار نے سمجھا ستم شعار مجھے

بنا دیا مرے دامن کو رشکِ گلزار
کیا نہ آنکھ نے شرمندۂ بہار مجھے

وفا پسند نگاہوں کے کام آئیگی
بنا کے چھوڑ دے تصویرِ انتظار مجھے

سنا تو دوں دلِ مضطر کی داستاں، لیکن
جو دردِ دل نہ کرے اٹھکے بیقرار مجھے

بٹی شراب تو یہ میکدے میں شور ہوا
نگاہِ یار مجھے، اے نگاہِ یار مجھے!

وفورِ شوق میں حال ہے معاذ اللہ
نہ بیقرار ہوں میں نا ہے قرار مجھے

پئے ہیں چھپ کے محبت میں عمر بھر آنسو
کہ دیکھ لے نہ کہیں کوئی بیقرار مجھے

سکونِ روحِ محبت میں مل چکا نشتر
اب ایک موت کا ہے اور انتظار مجھے

۱۹۲ ۲۵

دل جو عرصے سے نہیں دل کہیں پھر دل ہو جائے
محملِ دوست بنے، دوست کی منزل ہو جائے

اک ذرا درد کہیں اور جو شامل ہو جائے
جسے سب کہتے ہیں بجلی، وہ مرا دل ہو جائے

اختیار آپکے دل پر جو مجھے حاصل ہو جائے
آپکے سینے میں جو دل ہے، مرا دل ہو جائے

لطفِ تکمیلِ محبت جو مجھے حاصل ہو جائے
درد بڑھ جائے کچھ اتنا کہ مرا دل ہو جائے

پوچھ منزل نہ رہِ عشق کے سیاحوں کی
جس جگہ چھاؤنی چھائیں وہ ہی منزل ہو جائے

ابھی کھل جائے حقیقت ہوسِ دل کی ابھی
میری مشکل جو کہیں غیر کی مشکل ہو جائے

آج پھر دلمیں تڑپنے کی امنگ اٹھتی ہے
لطف آ جائے اگر ہر رگِ تن دل ہو جائے

خانۂ دلمیں ہے ارمان و تمنا کا ہجوم
یہ ہی انبوہ مرتب ہو تو محفل ہو جائے

عشق کی میرے نہ تکمیل ہوا ہے وائے نصیب
روز بڑھ بڑھکے مہِ نو سے مہِ کامل ہو جائے

اب تو غم ہو کہ تمنا ہو کہ ارمان تیرا
جو ٹھہر جائے مرے دلمیں، مرا دل ہو جائے

خود نہ ڈھونڈے اُسے منزل تو ہمارا ذمہ
پہلے خود قافلہ گم گشتۂ منزل ہو جائے

ہم نے تو باغ کا مفہوم یہی سمجھا ہے
دو گھڑی روز جہاں شورِ عنادل ہو جائے

پاس بیمار کے بیٹھے ہیں وہ با دیدۂ تر
ہوشیاری کو مناسب ہے کہ غافل ہو جائے

ہر قدم پر ہے نئی حسن کی دنیا آباد
کیوں مسافر کا دل آزردۂ منزل ہو جائے

آرزو دلکی نہ رہنے دو پریشاں دل میں
کیا مصیبت ہو اگر یہ بھی کہیں دل ہو جائے

دل کو مانوس جفاؤں سے کئے جاتا ہوں
کیا عجب ہے جو کسی دن کسی قابل ہو جائے

دل جسے کہتے ہوئے شرم سی آتی ہے مجھے
اک نظر آپکی پڑ جائے، تو ہاں دل ہو جائے

غیر ممکن ہے ترے غم کی سمائی دل میں
وسعتیں دو کہ ترا غم ہی مرا دل ہو جائے

جیتے جی بزم سے اُٹھانا نہ جسے ہو منظور — مثلِ پروانہ وہ خاکسترِ محفل ہو جائے
اب یہ حالت دلِ پژمردہ کی ہے آخرکار — پھول مل ڈالئے لیکر، تو مرا دل ہو جائے
ایک دل اور تمنّائیں ہزاروں، یہ کیا؟ — ہر تمنّا کے لئے ایک جُدا دل ہو جائے
کچھ عجب حال ہے فرقت میں کسی کی اپنا — چار دن یوں ہی چلے اور تو مشکل ہو جائے
پھر گرانباریٔ منزل کا کسے ہو احساس — واقفِ راہ جو آوارۂ منزل ہو جائے

کیا قیامت ہے یہ دستورِ محبت نشترؔ
دیکھئے جس کو جگہ دل میں وہ قاتل ہو جائے

۱۹۳ ۲۴

کب دل میں مرے جلوۂ جانانہ نہیں ہے — کب نور سے لبریز یہ کاشانہ نہیں ہے
افسانہ ہے دُنیا، مجھے معلوم ہے، لیکن — محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نہیں ہے
جو تا بہ لب آئے نہ ترے ہاتھ سے ساقی — وہ تو مری دانست میں پیمانہ نہیں ہے
دیکھا تھا ازل میں کوئی رنگین سا جلوہ — قابو میں ابھی تک دلِ دیوانہ نہیں ہے
میرا بھی وہی دل ہے، جو پروانے کا دل ہے — صورت مری گو صورتِ پروانہ نہیں ہے
اے شمعِ ازل تیرے لئے ہم بھی ہیں بیتاب — پُرسوز فقط فطرتِ پروانہ نہیں ہے
دُنیا سے نرالی ہے مری بادہ پرستی — پیتا ہوں مگر ہاتھ میں پیمانہ نہیں ہے
جنّت کو سمجھتے ہیں وہ اک حیلۂ باطل — دیوانے کو کہتے ہیں کہ دیوانہ نہیں ہے
اے شمع بتا دے یہ ہے انصاف کہ اندھیر — محفل میں تری ماتمِ پروانہ نہیں ہے
تیری نگہِ مست کا یہ فیض ہے ساقی — میخانہ ہے اب دل مرا پیمانہ نہیں ہے

ہیں میرے لئے کاتبِ اعمال تو دو دو — افسوس کوئی کاتبِ افسانہ نہیں ہے
عبرت کا سبق اس سے لئے جائیگی دنیا — رودادِ محبت مری افسانہ نہیں ہے
عاشق وہ ہی جو سوزِ محبت کے مزے لے — جو آگ میں جل جائے وہ پروانہ نہیں ہے
قائم جو یہی بے خبری اور ہی کچھ دن — سن لوگے کسی روز کہ دیوانہ نہیں ہے
ٹھکرا کے حقارت سے اسے پھینک نہ ساقی — دل ہے مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ نہیں ہے
آنکھوں سے آپ آنکھوں میں جو آنے لگی مستی — میکش کو ترے حاجتِ پیمانہ نہیں ہے
کیوں بدلیں اسی عارضی خوشیوں سے جہاں کی — بھاری ہمیں اتنا غمِ جانانہ نہیں ہے
تو جلتی ہے اصلی، اسے کیا بغض کسی سے — پروانہ کبھی دشمنِ پروانہ نہیں ہے
ہر شخص کے مینا میں نہیں بادہ رنگیں — ہر شخص کا دیوان صنم خانہ نہیں ہے
خم منہ سے لگا لینے کی خو ڈالئے نشتر
پیمانہ کبھی ہے، کبھی پیمانہ نہیں ہے

۱۹۴ — ۲۰

اے صاحبِ محفل ہم بے جانے چلے آئے — آتے ہوئے کچھ دیکھے پروانے، چلے آئے
جب ہوش سے گھبرائے میخانے چلے آئے — میخانے سے پھر بنکر دیوانے چلے آئے
لو شمع کے پہلو میں، پروانے چلے آئے — خود جان گنوانے کو دیوانے چلے آئے
دیوانوں کی محفل میں جب ہوش نہیں جاتا — کیوں ہوش کی محفل میں دیوانے چلے آئے
تم باتوں ہی باتوں میں بہلا کے گئے تھے کل — پھر باتوں ہی باتوں میں بہلانے چلے آئے
فرہاد گیا گذرا، مجنوں نے لیا رستہ — دنیا میں نگران کے افسانے چلے آئے

جب بیٹھ گئے چشمِ ساقی کے تصوّر میں ۔۔۔ پیمانے نہیں کھینچ کر میخانے چلے آئے
کیا کام تھا مرقدسی، کیوں بھاگتے دُنیا سے ۔۔۔ دُنیا کے تھکے ماندے سستانے چلے آئے
دُنیائے محبت میں قصّے تو بہت نکلے ۔۔۔ جو چلنے کے قابل تھے افسانے چلے آئے
اب جاؤ گذرنی تھی عاشق پہ جو کچھ گذری ۔۔۔ تم قبر پہ کیوں ناحق پچھتانے چلے آئے
سب آ گئے اس دل میں اللہ رے ظرفِ دل ۔۔۔ پیمانے چلے آئے، میخانے چلے آئے
اِن مست نگاہوں کو، دیکھو تو ذرا اپنی ۔۔۔ تم تو لئے ساتھ اپنے، میخانے چلے آئے
میخانے نہیں جاتے، ہم رندِ قدح کش ہیں ۔۔۔ جب ٹھان لی پینے کی میخانے چلے آئے
تقدیر سے مسجد ہے، میخانے سے کچھ آگے ۔۔۔ مسجد سے جو گھبرائے، میخانے چلے آئے
اس عالمِ فانی میں، ہم اور قدم رکھتے؟ ۔۔۔ تھی تشنہ عمر قسمت، غم کھانے چلے آئے
ہیں ساتھ لحد تک سب، پھر کون کسی کا ہے ۔۔۔ لوٹ آئے جو اپنے تھے، بیگانے چلے آئے
ساقی تری محفل میں ہے جذب و کشش کیسی ۔۔۔ جاتے تھے سوئے مسجد میخانے چلے آئے
اپنی تو یونہی گذری، اوروں کی خدا جانے ۔۔۔ مسجد سے اُٹھے سیدھے میخانے چلے آئے

تھا عرصۂ محشر سے کیا کام ہمیں نشتر
195 خود کردہ گناہوں پر، پچھتانے چلے آئے 19

شادکامانِ وفا، وقفِ فغاں کیوں ہو گئے؟ ۔۔۔ تھے بہارِ جاوداں تو، خزاں کیوں ہو گئے؟
پھول پتے باغ کے نذرِ خزاں کیوں ہو گئے؟ ۔۔۔ تو بتا سکتا ہے کچھ اے باغباں، کیوں ہو گئے؟
کر دیا کیا تو نے زخموں کو مرے اے چارہ گر ۔۔۔ خونفشاں تو تھے ہی یہ حسرت فشاں، کیوں ہو گئے؟

اے بلند ایوان والو، تم نے یہ سوچا کبھی — ہم زمیں کیوں ہو گئے، تم آسماں کیوں ہو گئے؟
نعش عاشق پر وہ انکار و کے کہنا بار بار — بولتے ہی بولتے تم بے زباں کیوں ہو گئے؟
دم نکلتے ہی کیا کیوں مرنے والے کو وداع — بے مروت اسقدر اہلِ جہاں کیوں ہو گئے؟
غیر دشمن ہے، تو خیر اس کا سبب معلوم ہے — تم مرے دشمن نصیبِ دشمناں کیوں ہو گئے؟
رہبرو راہِ محبت کو مٹانے کے لئے — متفق باہم زمین و آسماں کیوں ہو گئے؟
بے زباں جو ہو، وہ جانے بے زبانی کے مزے — کیا کہیں اور کیوں کہیں ہم بے زباں کیوں ہو گئے؟
تم تو کہتے ہو ابھی جور و ستم میں ہے کمی — واقعاتِ عاشقی پھر داستاں کیوں ہو گئے؟
کر دیا اے لذتِ غم، تو نے یہ کیا سحر سا — ہیچ اب نظروں میں لطفِ دو جہاں کیوں ہو گئے؟
آشیاں جبتک نہ تھا، ہر شاخ اپنی شاخ تھی — ہائے آزادی، اسیرِ آشیاں کیوں ہو گئے؟
ضبط کی تاکید، جب میرے لئے مقسوم تھی — میری قسمت عشق میں آہ و فغاں کیوں ہو گئے؟
رات دن بجلی کا کھٹکا آشیاں میں کیوں نہ ہو — ہے خطا اپنی، قریبِ آشیاں کیوں ہو گئے؟
پہلے انکے ظلم تھے میرے لئے سوہانِ روح — اب وہ ہی ظلم و ستم، روحِ رواں کیوں ہو گئے؟

دل ہمارا بھی شگفتہ ایک دن ہوگا ضرور
ورنہ اے نشتر بیاباں گلستاں کیوں ہو گئے

۱۹۶ ۱۷

کیوں نہ جرأت مانگ لی پروانہ جانباز سے — ہائے رسوائی، کہ ہم لوٹ آئے بزمِ ناز سے
اب تسلی ہو نہیں سکتی فقط آواز سے — دو گھڑی کو باہر آ جاؤ حریمِ ناز سے
کیا کوئی آگاہ ہو سکتا تھا میرے راز سے — کیا کروں مجبور ہوں اس دیدۂ غماز سے

درد دینا ہی تو دے اے عشق اس انداز سے
ایک سا آئے مزہ انجام تک آغاز سے

دل ہی دل میں گفتگو کیونکر نہ وہ ہم سے کریں
دُور والے سے کیا کرتے ہیں بات آواز سے؟

مُنہ سے کہنا اور ہے، اور جان دینا اور ہے
جاں نثاری سیکھئے پروانۂ جانباز سے

لیکے دل ٹوٹا تو یہ سمجھو کہ دل والا نہ تھا
ورنہ دل لیکر کوئی لوٹا ہے بزمِ ناز سے

اب وہی انداز آنکھوں میں ہے شکلِ آئینہ
دیکھ آئے تھے اُنھیں محفل میں جس انداز سے

بے تکلف خُم کے خُم اب تو لنڈھا دیتے ہیں ہم
ہو گئے وہ دن ہوا، پیتے تھے جب انداز سے

درد جو کل تھا، کچھ اُسمیں اور اضافہ ہو گیا
روگ اچھا مول لے آیا میں بزمِ ناز سے

کیا گلہ اسکا، محبت میں یہ ہوتی آئی ہے
ایک سی کس کی نبھی، انجام تک آغاز سے

در پئے جاں ہو رہی ہے، آرزوئے دیدِ حُسن
اب اُٹھا دو بھی کہیں پردے حریمِ ناز سے

دعوتیں اب بھیجتے ہو کیوں حریمِ ناز کی
پہلے تم نے کیوں نکالا تھا حریمِ ناز سے

ہم ازل کے جرعہ کش ہیں، آج کے میکش نہیں
جام ہو چاہے نہ ہو، پیتے ہیں اک انداز سے

رنج ہو چاہے خوشی، دونوں میں ہم رہتے ہیں مست
کوئی نغمہ ہو ملا لیتے ہیں دل کے ساز سے

ضبط کی طاقت مجھے دے، ورنہ اب کھلتا ہی بھید
پھوٹ نکلے ہیں فسانے پردہ ہائے راز سے

عالمِ جذبات میں اک حشر برپا ہو گیا
سوتے سوتے کون اُٹھ بیٹھا یہ خوابِ ناز سے

آگئے ہیں حضرتِ واعظ بھی میخانے میں آج
میکشو اُٹھو، بٹھاؤ، آپ کو اعزاز سے

آنکھ کھلتے ہی چمن میں، ہمنے دیکھا ہے قفس
اپنے پَر، وہ پَر ہیں جو واقف نہیں پرواز سے

آس تھی تیری، کہ میری آرزو تھی، کیا خبر
دل کے اندر چیز ٹوٹی ہے کوئی آواز سے

لغزشِ پا ہم نے واعظ میں نہ دیکھی تھی کبھی
آج کچھ شاید زیادہ پی گیا انداز سے

ابتدائے عشق میں تم کیا تھے اب کیا ہو گئے
کچھ تو ہوتا واسطہ انجام کو آغاز سے

کچھ دنوں سے دل میں پھر آنے لگی ہے اک صدا
کچھ میں واقف سا نظر آتا ہوں اس آواز سے

اے مؤذن تو نے اپنے دل میں یہ سوچا کبھی
پاس والے کو بلانا عیب ہے، آواز سے

کچھ دنوں سے وہ سکونِ قلب حاصل ہے مجھے
تھپکیاں دیتا ہو جیسے کوئی دستِ ناز سے

حضرتِ نشتر ہمیں ہے بار ہا کا تجربہ
دشمن اچھا ہے کہیں، یارِ زمانہ ساز سے

۱۹۷ ۲۶

یارب مری راتوں کو تجلّیِ ازل دے
دل جس سے ہو روشن، وہ محبت کا کنول دے

دینی ہے مجھے زیست تو آزادِ اجل دے
یہ کیا ہے کہ جب کام کا انساں ہو تو چل دے

سچ کہتے ہو انسان کو کھا لیتی ہیں فکریں
ہے انکی دوا یہ کہ جب آئیں تو کچل دے

چلنے میں بہت دیر نہ للہ لگاؤ
تاخیر سے ڈر ہے کہیں بیمار نہ چل دے

کیفِ نگہِ یار، ہے اب شرم ترے ہاتھ
بیہوش نہ ہو جاؤں، کہیں ہوش نہ چل دے

رہتی تھی کبھی فکر، چلا جائے کہیں درد
اب فکر یہ رہتی ہے، کہیں درد نہ چل دے

ہوتا نہیں خود مرنے پہ تیار یہ انساں
اور اس پہ یہ حسرت ہے کہ مہلت بھی اجل دے

کس درجہ حریص اپنے گناہوں پہ ہے انساں
کیا ہو جو نہ اللہ مکافاتِ عمل دے

یارب نہیں اب اور کوئی بچنے کی صورت
بدلے نہ مرا ذوق، تو دل انکا بدل دے

جبتک نہ وہ آجائینگے، ہم جا نہیں سکتے
کیوں کوششِ بے سود میں جاں اپنی اجل دے

اس دل سے تو ہر طرح میں عاجز ہوں الٰہی
ممکن ہو تو دل کو کسی پتھر سے بدل دے

دنیا مری اب رہنے کے قابل نہیں یا رب
یا اس کو مٹا، یا مری دنیا کو بدل دے

ہر سانس میں آثارِ دمِ بازپسیں ہیں
پھر دیکھ لوں میں انکو جو کچھ وقت اجل دے

کہدے کوئی اُن سے کہ جو آنا ہو تو آجائیں
ہر سانس تیرے بیمار سے کہتی ہے کہ چل دے

یہ کیا کہ ہوں مرنے سے میں نزرات ہر اساں
گر زندگی دی ہے تو مجھے شوقِ اجل دے

بالیں سے وہ بیمار کی یہ کہہ کے اُٹھے ہیں
اب اس کو شفا کوئی اگر دے تو اجل دے

ہم روزِ ازل بھول گئے اُس سے یہ کہنا
دینی ہے اگر زیست تو محفوظِ اجل دے

نشتر کی طبیعت میں اُمنگو نہ ہے مستی
لا ابرِ بہار آج کوئی تازہ غزل دے

۱۹۸ ۱۸

فکرِ دُنیا کیجئے یا فکرِ عقبیٰ کیجئے
زندگی دنیا میں دو دن کی ہے کیا کیا کیجئے

التفاتِ رحم مجھ پر بھی خدارا کیجئے
میری نظروں میں بھی اس دنیا کو دُنیا کیجئے

حُسن کی تنویر سے دل میں اُجالا کیجئے
رات ہو یا دن خیالِ روئے زیبا کیجئے

رو دیئے، پھر اپنے ہر آنسو کو دریا کیجئے
اک تماشا ختم کر کے اک تماشا کیجئے

جس کا ملنا عالمِ امکاں میں ممکن ہی نہیں
کبتک اسکی آرزو، کبتک تمنّا کیجئے؟

ایک ہی جلوے سے چشمِ شوق خیرہ ہو گئی
اب کہاں ہمت کہ ارمانِ تمنّا کیجئے

اے تصوّر تیری رحمت تو یقینی ہے مگر
چاہتا ہے جی، اُسے دنرات دیکھا کیجئے

جب تمنّا ہے تقاضائے محبت کے خلاف
دل کو پھر کیوں مفت مرہونِ تمنّا کیجئے

کیا کہوں کیفیتِ نظارہ حُسن و جمال — دیکھئے اسکو تو حسرت ہو کہ دیکھا کیجئے
حضرتِ دل ہم نہ کہتے تھے کہ خاموشی ہے خوب — بار بار اور اُن سے اظہارِ تمنّا کیجئے!
جب مسلّم ہے کہ دینے والا کوئی اور ہے — کیوں کسی کے در پہ اظہارِ تمنّا کیجئے
مرنیوالا مر چکا، ہونا تھا جو کچھ، ہو چکا — اب قیامت ڈھایئے، یا حشر برپا کیجئے
ہم بھی اب خاموش ہیں، کر لیں جی بھر کر ستم — جس جگہ قابو نہیں اپنا، وہاں کیا کیجئے
رفتہ رفتہ ہو گیا ہیں خوگرِ جور و ستم — اب جفا کم کیجئے چاہے زیادہ کیجئے
ہم تو ہیں روزِ ازل سے آپکے صورت شناس — جو نہ دیکھا ہو، اسے آپ پردا کیجئے
صحنِ گلشن مرکزِ آفت بنا رہتا ہے روز — اب مذاقِ سیر کو مانوسِ صحرا کیجئے
مجھ کو دنیا کے بکھیڑے آپ سے رکھتے ہیں دور — ہو اگر ممکن مجھے بیزارِ دُنیا کیجئے
دم زدن میں چھوڑ دیتی ہے یہ اک مدّت کا ساتھ — زندگی بھر میری دُنیا "میری دُنیا" کیجئے
چاہتے ہیں آپ اگر دے ساتھ دُنیا آپ کا — سہل سی تدبیر یہ ہے، ترکِ دُنیا کیجئے
بجلیاں لیں بھر دیتے ہیں تیرِ آپ تو — دیکھئے ایسی نگاہوں سے نہ دیکھا کیجئے
کامیابیِ تمنّا دل کے حق میں زہر ہے — سب سے اچھا ہے یہی، ترکِ تمنّا کیجئے
لوگ کہتے ہیں کہ ذکرِ عیش نصف العیش ہے — جب نہ ہو صہبا، تو ذکرِ جام و صہبا کیجئے

یوں وصالِ اُس سنگدل کا حضرتِ نشتر کہاں
دل کو پتھر کیجئے، پانی کلیجا کیجئے

۱۹۹ — ۲۳

ساقی تری آنکھوں کو میخانہ بنالیں گے — اپنے دلِ بیخود کو، پیمانہ بنالیں گے

اک روز فضاؤں کو رندانہ بنالیں گے
مسجد کو تری زاہد، میخانہ بنالینگے

دُنیا کے کرشموں کے، نزدیک نہ جائے دل
تجھ کو بھی یہ دیوانے، دیوانہ بنالینگے

دُنیا سے الگ ہو کر، ہو جائیں ہمارے وہ
ہم سارے زمانے کو بیگانہ بنالینگے

بھولے سے نہ کرتے ہم، نظارے حسینوں کے
کیا جانتے تھے ظالم، دیوانہ بنالینگے

کیا حال کہیں اُن سے، ہم اپنی خرابی کا
معلوم ہے وہ سُن کر افسانہ بنالینگے

سمجھے تھے بنالینگے، بیگانوں کو ہم اپنا
اپنوں کو، خبر کیا تھی، بیگانہ بنالینگے

کچھ اور محبت میں حاصل نہ اگر ہوگا
اک دردِ محبت کا، افسانہ بنالینگے

مٹتے ہیں محبت میں، اب اسکو خدا جانے
تقدیر بنالیں گے ہم، یا نہ بنالینگے

ہے سوزِ محبت کا، پیغام اگر جاری
ہم شمع کو بھی اک دن پروانہ بنالینگے

کافر تری نظروں کی، دل پر جو رہی یورش
اس کعبہ کو ہم اک دن بتخانہ بنالینگے

دل توڑ رہے ہیں وہ، یہ اُنکی عنایت ہے
ہم ٹوٹے ہوئے دل کو پیمانہ بنالینگے

جا بیٹھیں گے مسجد میں، ساقی کے تصور میں
کچھ دیر کو مسجد میں، میخانہ بنالینگے

یہ بُعد و مسافت ہی، تفریق کا باعث ہے
مسجد کی بغل ہی میں، بتخانہ بنالینگے

ساتھی نہیں وحشت میں، کوئی تو نہ ہوا اپنا
ہم اپنے ہی سائے کو دیوانہ بنالینگے

ساقی کی نگاہوں کو، اپنے دلِ رنگیں کو
میخانہ بنالیں گے، پیمانہ بنالینگے

جب آئینگے پینے پر، اے ساقیٔ میخانہ
میخانے کو ہم تیرے، پیمانہ بنالینگے

اچھا جو خفا ہے تو، دیں گے نہ تجھے زحمت
ہم دل ہی کو اے ساقی، میخانہ بنالینگے

اس گلشنِ ہستی کے، پھولوں پہ نہ پھول اے دل — ہر رنگ سے یہ تجھ کو، دیوانہ بنا لینگے
گلگشت کو جائیں گے، دیوانے اگر نشترؔ
۲۰۰ گلشن کو بھی دو دن میں ویرانہ بنا لینگے ۲۰

اب ہجر سے غرض ہے، نہ مجھکو وصال سے — بیخود بنا ہوا ہوں کسی کے خیال سے
جو طالبِ کمال ہو پوچھے ہلال سے — کس مرتبہ زوال ہوا ہے کمال سے
جس دن سے آ گئے وہ ہمارے خیال میں — نکلے نہ ایک لمحہ ہمارے خیال سے
عاشق کیواسطے ہے وہ ہی روز موت کا — جس روز تم نکل گئے اُسکے خیال سے
اے چارہ گر یہ دردِ سری ہے تری فضول — مانوس میرے زخم نہیں اندمال سے
لازم تھا میری طاقتِ دیدار کا خیال — شکوہ ہے یہ مجھے تری برقِ جمال سے
بجلی کو اپنی تیز خرامی پہ ناز تھا — آگے نہ جا سکی کبھی میرے خیال سے
محشر میں وہ شکایتِ جور و جفا مری — وہ اُن کا دیکھنا نگہِ انفعال سے
کیا لطف ٹھوکروں میں ہے اس رہگذار کی — پوچھے کوئی ہمارے دلِ پائمال سے
اب کیوں لُبھا رہی ہے نشاطِ جہاں مجھے — واقف ہوں خوب لذتِ رنج و ملال سے
پاسِ جفائے حسن ہے، پاسِ وفائے عشق — خاموش کیا بتاؤں میں کس خیال سے
خوشیوں کا ٹھیک کیا ہے، ابھی ہیں ابھی نہیں — ایدل بدل لے انکے غمِ لازوال سے
کیا کیا شکستِ توبہ کے سامان لئے ہوئے — گھنگھور اٹھ رہی ہیں گھٹائیں شمال سے
اب کس کا رنجِ ہجر، کہاں کی نشاطِ وصل — مدہوش ہو رہا ہوں شرابِ خیال سے

دو باتیں اور ایسی میں واعظ سے میکشو
آنے لگے نظر یہ مجھے ہنجال سے
کہدو کہ میرے دل سے خوشی اپنی ہٹا لے
شرمندہ ہو رہا ہوں کسی کے ملال سے
آتے ہی یاد آ گئی بزمِ جمال پھر
آئے ہی کیوں تھے ہم تری بزمِ جمال سے
نشتر بہت گراں ہے اگر دفترِ گناہ
دھو ڈالو ایک دن عرقِ انفعال سے

۲۰۱ ۱۸

انساں اگر نہ پائے تمنا کہیں جسے
دُنیا نظر نہ آئے وہ، دُنیا کہیں جسے
اے دل کہاں نصیب، تمنا کہیں جسے
دعویٰ ہے تیرا، دعویٰ بیجا کہیں جسے
سب صرف کر دو، طاقتِ دُنیا کہیں جسے
ملتی کہاں کسی کو ہے، عقبیٰ کہیں جسے
ممکن نہیں کہ ڈھونڈھ نکالیں نہ ہم تمھیں
ابتک کیا کہاں ہے، ارادا کہیں جسے
ہم، پہلے یہ کہیں کہ وہ ہو جائیں باوفا
ہو جائے گر، زبان سے جیسا کہیں جسے
کیا تو نے سحر کر دیا اے دشمنِ بہار
اب رنگِ باغ وہ ہے کہ صحرا کہیں جسے
چشمِ کرم ادھر بھی جو ہو جائے آپ کی
دُنیا مرے لئے بھی ہو دُنیا کہیں جسے
پھر کس کی یاد آج ستانے لگی مجھے
اک سلسلہ ہے اشک کا، دریا کہیں جسے
دل کیا ہے، ایک بوند لہو کی ہے ہجر میں
سمٹا پڑا ہے خونِ تمنا کہیں جسے
برباد کر رہے ہیں وہ میرا جہانِ دل
میرے تمام شوق کی دُنیا کہیں جسے
کیا اپنا حال کوئی سنائے بھلا تمھیں
اسطرح جب سنو کہ نہ سننا کہیں جسے
اچھا کسی کو سارا زمانہ کہے تو کیا
اچھا وہ ہی ہے منہ سے وہ اچھا کہیں جسے

غم اپنا ہم کو دو، تو بہ مقدارِ ظرف دو
کم جس کو کہہ سکیں، نہ زیادہ کہیں جسے

پھر آج بیخودی میں کمی پا رہا ہوں میں
ہاں، اک نگاہ، حاصلِ صہبا کہیں جسے

دُنیا سے ہم کو اصل میں کوئی گلہ نہیں
سوہانِ روح ہے، غمِ دنیا کہیں جسے

اے بوالہوس یونہی کہیں ہوتے ہیں کامیاب
دل میں کہاں ہے تیرے تمنّا کہیں جسے

ذرات میں ہوں، اور مری خواہشیں تمام
وہ محشرِ عجیب ہوں، تنہا کہیں جسے

عرصہ ہوا کہ دل میں تمنا نہیں کوئی
ہاں وہ بہت ہے، خونِ تمنّا کہیں جسے

تم کیا مری نگاہ سے اوجھل ہوئے کہ اب
دُنیا ہی وہ رہی نہیں دُنیا کہیں جسے

پوری ہوئی نہ ایک تمنّا کوئی کبھی
ہم تو وہ ہیں خرابِ تمنّا کہیں جسے

دن ہو کہ رات گریۂ پیہم سے کام ہے
وہ سیل آنکھ میں ہے کہ دریا کہیں جسے

دل میں، جگر میں، سینے میں، چشمِ پُرآب میں
چاروں طرف ہے درد کی دُنیا کہیں جسے

پھرتے ہیں دل میں درد کسی کا لئے ہوئے
ملتا نہیں ہے کوئی مسیحا کہیں جسے

نشتر نہ کھا فریب طلسمِ مجاز کا
اک محشرِ خیال ہے، دُنیا کہیں جسے

۲۰۲ ۲۴

کیسے پہنچیں باغ تک ہیں بال و پر ٹوٹے ہوئے
قید سے چھٹ کر بھی ہیں ہم باغ سے چھوٹے ہوئے

خود سے غافل اور خویش و آشنا چھوٹے ہوئے
لُٹ کے بیٹھے ہیں محبت کے مزے لوٹے ہوئے

سوگ کس بلبل کا ہے اے باغباں گلشن میں آج
پھول مرجھائے پڑے ہیں جا بجا ٹوٹے ہوئے

باغباں کچھ تو بتا کیا آشیاں کا حال ہے
ہم ابھی آئے ہیں یہ ہے قید سے چھوٹے ہوئے

بے ثباتی جہاں کا، دل پہ نقشہ کھنچ گیا ہم نے جب دیکھے کسی کے بال و پر ٹوٹے ہوئے
آشیاں میں کچھ تو ہو عمرِ قفس کی یادگار ساتھ لیجائینگے اپنے بال و پر ٹوٹے ہوئے
اب تو لے اپنے حسن کا صدقہ، چلے ہی آیئے ایک مدت ہوگئی ہے آپ سے چھوٹے ہوئے
ہیچ نظروں میں نہ کیونکر ہو نشاطِ دوجہاں عمر بھر ہم ہیں ترے غم کے مزے لوٹے ہوئے
کرلیا کرتے ہیں تیری یاد تازہ اے اجل دیکھکر صحنِ چمن میں پھول کچھ ٹوٹے ہوئے
یہ مری رنگین فطرت تھی، کہ میرے جسم سے قطرہ ہائے خوں گرے گرتے ہی گل بوٹے ہوئے
تیرے دل کا حال ہم پوچھیں گے تجھ سے، بیوفا لیکے جب محشر میں سب پہنچیں گے دل ٹوٹے ہوئے
آمد آمد آج پھر ساقی کی ہے مدت کے بعد جوڑ دے کوئی مرے جام و سبو ٹوٹے ہوئے
دیکھنا یہ کس نے دیکھا نیچی نظروں سے مجھے کون یہ جاتا ہے صبر و ہوش سب لوٹے ہوئے
ٹیس اک ہر وقت ایسی ہے کہ توبہ ہی بھلی کیا قیامت ہیں یہ دل کے آبلے پھوٹے ہوئے
کیوں قفس میں چھوڑ دیں صیاد آخر ہم انھیں لا ہمیں دیدے ہمارے بال و پر ٹوٹے ہوئے
کوئی بھی شہرِ خموشاں کا نہیں پرسانِ حال ہے یہاں اک گھر سلامت، چار گھر ٹوٹے ہوئے
اپنے اشکوں میں ملا کر، نذر کردونگا انھیں کچھ ستارے اپنے دیدے اے فلک ٹوٹے ہوئے
دے رہے ہیں کچھ مری صحرا نوردی کے پتے زخم میرے پاؤں کے اور آبلے پھوٹے ہوئے
دل جہاں ٹوٹے، نہیں رہتے کسی مصرف کے پھر کام آتے ہیں کسی کے، آئینے ٹوٹے ہوئے؟
کل جہاں تھا آشیاں اور نغمہ ہائے عندلیب آج کچھ تنکے وہاں ہیں اور پر ٹوٹے ہوئے

کہئے آزادی پہ بلبل اپنی روئے یا ہنسے

۲۰۳ دل شکستہ اُس پہ نشتر بال و پر ٹوٹے ہوئے ۲۱

چمن ہے جوشِ نمو پہ کیا کیا، فضا بھی پہلو بدل رہی ہے
ہر ایک شاخِ خمیدہ سر سے، حسین کونپل نکل رہی ہے
الٰہی یہ کون سی ہوا ہے، جو آج دنیا میں چل رہی ہے
فلک کا بھی رنگ وہ نہیں ہے، زمیں بھی نقشہ بدل رہی ہے
ذرا تو سوچ اپنے دل میں غافل، یہ عمر ہر وقت ڈھل رہی ہے
کہیں کسی کو ہے آج حاصل، وہ بات جو اسکو کل رہی ہے
مری طبیعت ملی ہے ان سے، انھیں کے سانچے میں ڈھل رہی ہے
اشارے جیسے وہ کر رہے ہیں، انھیں اشاروں پہ چل رہی ہے
ہمارا شوقِ شہادت آخر، کسی کے لب سے سنے یہ کبتک
"ابھی وہ دامن اُٹھا رہے ہیں، ابھی سروہی سنبھل رہی ہے"
فغاں کی شورش بڑھی ہے جب سے، نہ حسرتیں ہیں نہ آرزوئیں
جمیں قدم کیا کسی کے، دل میں کہ ایک آندھی سی چل رہی ہے
ہوا کا بند رہنا ہی سخت مشکل، کنارہ کش اس سے ہو تو اے دل
ہوا بہت ہی خراب ہے یہ، جو آج دنیا میں چل رہی ہے
بُرا ہو اُس وقت کا کہ ہم نے، شراب پینے سے توبہ کی تھی
وہ دن ہے اور آج کی گھڑی ہے، ہمیشہ نیت بدل رہی ہے

کسی سے وعدہ وفا کیا ہو، تو کچھ نہیں اطلاع ہم کو
ہمارے حق میں تو زندگانی بھر آج کل، آج کل رہی ہے
رہا ہمیشہ یہ حالِ دُنیا، کوئی ہے نالاں کوئی ہے خنداں
کسیکی میت نکل رہی ہے، کسی کی حسرت نکل رہی ہے
نکلنا حسرت کا دل سے گویا، ہے باطنی موت آدمی کی
اگر یہ سچ ہے تو مر رہا ہوں، کہ میری حسرت نکل رہی ہے
کہو نہ اس زندگی کو اپنا، کہ اس پہ قابو نہیں کسیکا
ہمیشہ ملکِ اجل رہیگی، ہمیشہ ملکِ اجل رہی ہے
ہے ساری دُنیا فلک کی شاکی، زمیں سے کہتا نہیں کوئی کچھ
تمام دُنیا نگل گئی ہے، تمام دُنیا نگل رہی ہے
خیال میں کچھ سرور سا ہے، نگاہ میں کچھ حسین سے ہیں
یقیناً آئیگا دل کسی پر، کہ پھر طبیعت مچل رہی ہے
میں صبر اس سے سوا کرونگا، کریں وہ کرتے ہیں ظلم کبتک
مری طبیعت اٹل رہیگی، مری طبیعت اٹل رہی ہے
ٹلی ہیں رونے پر آج آنکھیں، نہ اُلٹی مانیں نہ سیدھی مانیں
خبر نہیں کون سی تمنا، یہ اشک بنکر نکل رہی ہے
گئے وہ دن اب، گئیں وہ راتیں، گئے وہ لوگ اب گئیں وہ باتیں

کہ زلزلہ آگیا تو بولے، زمین کروٹ بدل رہی ہے

میں رو رہا ہوں، تو رو بھی لینے دے، مجھکو اے ضبط چپکے چپکے

ترا بگڑتا نہیں کچھ اسمیں، مری طبیعت بہل رہی ہے

یہ ابرِ باراں، یہ برقِ لرزاں، یہ ریزشِ ابر قطرہ قطرہ

کرے نہ ذکرِ شراب کوئی، کہ یونہی نیّت بدل رہی ہے

مریضِ فرقت کہ جنکی سانسیں ابھی گنی جا رہی تھیں کل تک

سُنا ہے جب سے وہ آ گئے ہیں، طبیعت اُسکی سنبھل رہی ہے

نہ جانے کیا ہو مآلِ منزل، ابھی قدم بھی نہیں اُٹھائے

۲۰۴ زمین پیروں تلے سے نشترؔ ابھی سے میرے نکل رہی ہے ۲۱

ہر موئے تن کو عشق سراپا بنائینگے — جس طرح ہوگا ہم تمھیں اپنا بنائینگے

پیدا کرینگے وسعتِ دل ہر سرشک میں — اِس قطرۂ حقیر کو دریا بنائینگے

ہم اور ترکِ میکشی، توبہ جنابِ شیخ! — کیا عاقبت بگاڑ کے دُنیا بنائینگے!؟

پھیلاؤ آرزو کے مبارک ہیں عشق میں — ہر آرزو سے اک نئی دُنیا بنائینگے

وعدہ تو ہم سے جلوہ نمائی کا کیجیے — ہم اپنی ہر نگاہ کو موسےٰ بنائینگے

دیوانہ تم بنا کے اِنھیں خوش ہوے ہو کیا — دیوانے اک دن تمھیں لیلےٰ بنائینگے

میکش ہیں، اِنکا چھیڑنا واعظ نہیں روا — بیباک ہو گئے تو زیادہ بنائینگے

پیدا کریں گے مرکزِ جنت میں انقلاب — صحرا کو باغ، باغ کو صحرا بنائینگے

دیوانہ تو ابھی سے انھوں نے بنا دیا — کیا جانیں آگے چل کے ہمیں کیا بنائینگے
مانینگے غرق ہو کے محبت میں ہم تری — دریا اگر نہیں ہے، تو دریا بنائینگے
سیماب کا جو فیض ہے نشتر شریکِ حال — ہم ہر زمیں کو عرشِ معلیٰ بنائینگے
نشتر نہ دیتے دل انھیں ہم بھول کر کبھی
کیا تھی خبر وہ اس کا تماشا بنائینگے

۲۰۵ ۱۲

غم میں انسان بگڑ جائے تو تقدیر بنے — جو خوشی چاہے یہاں، پہلے وہ دلگیر بنے
قسمتِ غیر کے انداز پہ تقدیر بنے — جب کہیں جا کے، ترے وصل کی تدبیر بنے
ہو قلم کو مرے اے حسن عطا کر وہ کمال — کوئی تصویر بناؤں، تری تصویر بنے
لکھدے کچھ اور غمِ دوست مری قسمت میں — جب کہیں بات مری، کاتبِ تقدیر بنے
دوسروں کو متحیر ہی اگر کرنا ہے — پہلے انسان خود اک درد کی تصویر بنے
میں الجھ کر یونہی رہ جاؤں محبت میں تری — میری ہر آرزو میرے لئے زنجیر بنے
خود غرض میں نہیں اوروں کا بھلا چاہتا ہوں — سب کی تقدیر بنے، پھر مری تقدیر بنے
جاگتے سوتے جو نظروں سے نہاں ہو نہ کبھی — پردۂ دل پر اک ایسی تری تصویر بنے
لذتِ قید بھی زنجیر سے کم مجھکو نہیں — کیا ضرورت ہے کہ میرے لئے زنجیر بنے
عشق وہ ہے کبھی شاہد ہو، کبھی ہو مشہود — کبھی تصویر بنائے، کبھی تصویر بنے
نہیں آتا تجھے دراصل دعا کرنا ہی — ہو دعا دل سے، تو پیرایۂ تاثیر بنے
ایک بار اور ارادہ ہے کہ تدبیر کروں — نہ بنے پھر مری تقدیر، کہ تقدیر بنے

نازِ تیرا ہو، کہ انداز، کہ عشوہ، کہ ادا
میرے دلمیں جو سما جائے وہ ہی تیر بنے

آمرے دلمیں وہ تصویر دکھاؤں تجھ کو
تو جسے دیکھ کے خود صورتِ تصویر بنے

قصد کرتا ہوں کہ اب ترکِ دُعا بھی کردوں
کہیں یہ بھی نہ مری دشمنِ تقدیر بنے

گا ہے گا ہے جو اسیری میں نہ گذرے میری
میری آزادی مرے پانوکی زنجیر بنے

نہیں جلوؤں کی کمی، دیکھنے والا ہو کوئی
تیر موجود ہیں لاکھوں، کوئی نخچیر بنے

کوئی مفہوم نہ اعمال کا دُنیا میں رہے
حسبِ منشا و خواہ جو انسان کی تقدیر بنے

بن کے تقدیر بگڑتی ہے ہمیشہ نشتر
وہ بگڑنے کو ہو تیار، جو تقدیر بنے

۲۰۶ 19

یہ حال تیرے عاشقِ خستہ جگر کا ہے
گذری جو یہ شام تو خطرہ سحر کا ہے

لاکھوں شبِ فراق، ہزاروں شبِ وصال
قصہ عجیب زندگیٔ مختصر کا ہے

میں دیکھتا ہوں جلوۂ محبوب میں آج
جانے یہ واقعہ ہے کہ دھوکا نظر کا ہے

قلت نہیں ہے جلوۂ محبوب کی یہاں
دُنیا میں قحط تو فقط اہلِ نظر کا ہے

ٹھکیلیاں تو دیکھے کوئی اسکی ہر طرف
گویا تمام بلغ نسیمِ سحر کا ہے

فصلِ خزاں کو باغ میں آنے ہی کیوں دیا
کیسا یہ انتظام نسیمِ سحر کا ہے

کیا پوچھتے ہو حال، مریضِ فراق کا
ہر سانس کہہ رہی ہے ارادہ سفر کا ہے

بیہوش ہم ہوئے تو ہماری خطا نہیں
سارا قصور اسمیں تمہاری نظر کا ہے

خوشبو تمام پھولوں کی غائب ہی باغ سے
اسمیں ضرور ہاتھ نسیمِ سحر کا ہے

اللہ کیسے ہو گی بسر رات ہجر کی
انداز آج اور ہی دردِ جگر کا ہے

مسجد تمھاری یہ ہے۔ وہ میخانہ میرا شیخ
ایمان سے کہو اب ارادہ کدھر کا ہے؟

واللہ زندگیِ لحد بھی ہے خوب چیز
کھٹکا نہ شام کا ہے نہ دھڑکا سحر کا ہے

بڑھتا ہے ہمیں درد تو بڑھتی ہے ہمیں ٹیس
کتنا لحاظ دل کو ہمارے جگر کا ہے

کچھ دن سے ہی سوچتے ہیں دعاؤں سے کام لیں
لیکن سوال اس میں بھی کمبخت اثر کا ہے

نشتر یہ جرأتِ دلِ دیوانہ دیکھیے
۲۰۷ مشتاق پھر تبسمِ دیوانہ گر کا ہے ۱۵

مایوس، ہمارا دلِ رنجور نہیں ہے
جو کچھ ہو محبت کا یہ دستور نہیں ہے

کب قلب مرا جلوہ گہِ طور نہیں ہے
کب جلوۂ مستور سے معمور نہیں ہے

یہ جھوٹ نہ بولوں گا کہ مخمور نہیں ہے
دل نشۂ الفت سے مگر چور نہیں ہے

تم ملنے کو کہتے رہو "منظور نہیں ہے"
دل میرا یہ کہتا ہے وہ دن دور نہیں ہے

قایم رہی اک حال پہ کیوں زندگی میری
دنیا کا کوئی حال بدستور نہیں ہے

ہم بھولتے ہی بھولیں گے اپنی خلشِ عشق
دو دن میں بھر آئے یہ وہ ناسور نہیں ہے

دل منزلِ مقصود کی دیتا ہے گواہی
منزل پہ پہونچ جاؤں تو کچھ دور نہیں ہے

کیوں حضرتِ موسیٰ کی طرح جان پہ کھیلوں
جلوے کے لئے تیرے فقط طور نہیں ہے

کہہ دو کہ جفاؤں میں اضافہ ہو ذرا اور
زخمِ دلِ عاشق ابھی ناسور نہیں ہے

بےخوف میسر ہے یہاں جلوۂ محبوب
دل ہے، یہ کوئی جلوہ گہِ طور نہیں ہے

کیوں کرنے لگا شکوۂ ناکامیٔ قسمت
مجبورِ محبت، ابھی مجبور نہیں ہے

کیوں اس پہ نظر ہے تری، ای برقِ شرر بار
یہ شاخِ نشیمن، شجرِ طور نہیں ہے

اب مجھکو ملے، یا نہ ملے، یہ مری قسمت
یہ ہو گیا تحقیق، کہ وہ دُور نہیں ہے

اللہ غنی، شورش و ہنگامۂ دُنیا
شاید سحرِ حشر بہت دُور نہیں ہے

آخر یہ فنا قبلِ فنا کیوں نہیں ہوتا
جینے کے لئے آدمی مجبور نہیں ہے

دراصل کمی دیکھنے والوں کی ہی، ورنہ
جلوہ نہیں، یا جلوہ گہِ طور نہیں ہے

آنکھیں مری ہوں خواب میں مصروف، کہ بیدار
جو دُور نہیں ہے، وہ کبھی دور نہیں ہے

دُنیائے محبت میں یہ انصاف ہے کیسا؟
مجبور میں جتنا ہوں، وہ مجبور نہیں ہے

دل لیکے کبھی تم نے نہ پروائے وفا کی
تم کیا کرو یہ حُسن کا دستور نہیں ہے

واعظ میں کہاں دم کہ اسے پی سکے نشتر
۲۰۸ ۲۰
یہ بادۂ غم، بادۂ انگور نہیں ہے

بہم نشاط و غمِ روزگار دیکھا ہے
گلِ شگفتہ کے پہلو میں خار دیکھا ہے

کسی کے وعدوں کو نااستوار دیکھا ہے
جب اعتبار کیا، انتظار دیکھا ہے

عجیب تیر ہے، تیرِ نگاہ بھی ظالم
نگاہ ملتے ہی سینے کے پار دیکھا ہے

پسِ فنا تو قیامت کا انتظار نہ ہو
تمام عمر ترا انتظار دیکھا ہے

اب اضطرابِ تجلی کو ہو کہ حد ہی نہیں
بس ایک بار مجھے بیقرار دیکھا ہے

مری تڑپ کے مزے کچھ سمجھ سکیگا وہ ہی
تڑپ میں جس نے جہانِ قرار دیکھا ہے

وصالِ یار کی ہم کو نہیں خبر، ہم نے
تمام عمر غمِ انتظار دیکھا ہے

کلیم و طور کے قصے کا ماحصل یہ ہے
کہ مطلقاً نہیں دیکھا، ہزار دیکھا ہے

وہ ہی مرے غمِ فرقت کا لطف سمجھیں گے
جنھوں نے دورِ خزاں کو بہار دیکھا ہے

خوشی کے لطف لئے ہیں غمِ محبت میں
خزاں کو ہم نے برنگِ بہار دیکھا ہے

اب انتظار مرا، تو بھی تا قیامت دیکھ
کہ میں نے بھی تو ترا انتظار دیکھا ہے

اُمنگ پینے کی آئی ہے جب مرے دل میں
تمام باغ پر ابرِ بہار دیکھا ہے

خوشی و غم ہیں زمانے میں واقعی توام
وصال میں بھی غمِ انتظار دیکھا ہے

ہوا ہے مجھ کو گماں یہ کہ قافلہ ہے مرا
جہاں غبارِ سرِ رہگذار دیکھا ہے

مجھے ستاروں سے آخر نہ رشک ہو کیونکر
تمھیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے

ہمیں بہار و خزاں کیا، کہ ایک ہیں دونوں
ہزار بار خزاں کو بہار دیکھا ہے

نثار مست نظر پر تری، بتا ساقی
ہمارے پائے کا بھی بادہ خوار دیکھا ہے؟

نگاہِ یار نے کیا کر دیا، خدا معلوم
اور اس پہ لطف یہ ہے ایکبار دیکھا ہے

نہیں ہیں بس میں ہم اپنے تو ہم پہ حیرت کیا
کسی کو عشق میں با اختیار دیکھا ہے؟

تڑپ وہ دل میں ہوئی ہے کہ برق جیسے تڑپا
کبھی جو دل میں سکون و قرار دیکھا ہے

صبا بغیر بجھائے نہیں رہی ہے اسے
جہاں لحد پہ چراغِ مزار دیکھا ہے

مچل رہی ہے تمنا گناہ کی دل میں
ہوا کی گود میں دامانِ یار دیکھا ہے

ہے حسن کی ہمہ شوخی کا اعتراف مجھے
جدھر اُٹھی ہے نظر روئے یار دیکھا ہے

قسم نہ کھا کہ تو مستور ہے نگاہوں سے ہزار بار تجھے حسنِ یار دیکھا ہے
یہ انکی قبر نہیں وصل گاہ ہے نشتر جنھوں نے قبر کو آغوشِ یار دیکھا ہے

شکایتِ غمِ ہستی فضول ہے نشتر
خزاں بھی دیکھ، جو دورِ بہار دیکھا ہے

۲۰۹ ۲۶

تیار کہاں کوئی مصیبت کے لئے ہے دیوانہ جسے دیکھئے راحت کے لئے ہے
یہ زندگی دُنیا کی قناعت کے لئے ہے انسان سمجھتا ہے کہ دولت کے لئے ہے
اللہ کے بندے، کبھی سوچا ہے یہ تو نے کچھ پاس ترے روزِ قیامت کے لئے ہے
جس دل میں نہ ہو عشق وہ رخصت ہو یہاں سے دُنیا ہے محبت کی، محبت کے لئے ہے
پتھر ہے وہ دل، جس میں نہ ہو دردِ محبت انسان کا دل دردِ محبت کے لئے ہے
کہنے کو شبِ ہجر ہے میری انداز مگر روزِ قیامت کے لئے ہے
کھاتے ہیں سب اس ہستیٔ موہوم سے دھوکے انداز بظاہر، جو حقیقت کے لئے ہے
شہرت کی حقیقت نہیں معلوم کسی کو بیتاب جسے دیکھئے شہرت کے لئے ہے
ہم ہیں کہ قیامت ہے ہمارے لئے ہر صبح سنتے تھے کہ اک روزِ قیامت کے لئے ہے
ہم کو گلہ جور سے کیا عشق میں مطلب کیا منہ میں زباں انکی شکایت کے لئے ہے
کہدو کہ ہمیں وصل کے ارمان نہ چھیڑیں دل وقف ہمارا غمِ فرقت کے لئے ہے
کیا پوچھتے ہو راہِ محبت کے مظاہر جو ذرہ ہے، اندازِ قیامت کے لئے ہے
دُنیا سے کہو اپنا کرشمہ نہ دکھائے یہ ہیچ مری چشمِ حقیقت کے لئے ہے

کس طرح کروں انکی جفاؤں کی شکایت — ہر جور کچھ اندازِ محبت کے لئے ہے
انسان نہ دیکھے تو یہ تقصیر ہے اُس کی — سامان بہت دیدۂ عبرت کے لئے ہے
کہتے ہیں انھیں حور، تو کہدیتے ہیں ہنس کر — کہتے ہیں جسے حور وہ جنت کے لئے ہے
مطلب کی محبت کو محبت نہیں کہتے — نادان محبت تو محبت کے لئے ہے
جلتا ہوں اگر سوزِ محبت میں تو غم کیا — اسکی بھی ضرورت مری فطرت کے لئے ہے
ممکن نہیں تاثیر دکھائے نہ محبت — ہاں شرط مگر ضبط، محبت کے لئے ہے

راحت کی تجھے فکر مناسب نہیں نشتر
تکلیف یہاں طالبِ راحت کے لئے ہے

۲۱۰

۲۱

دل تیری تمنا سے بیزار نہ ہوجائے — یہ ہستی بے معنی، دشوار نہ ہوجائے
حق میں تری زہر اے دل اصرار نہ ہوجائے — "اقرار" کہیں انکا "انکار" نہ ہوجائے
واعظ کی زباں پر ہے، ہر دم مے و میخانہ — اک روز کہیں یہ بھی میخوار نہ ہوجائے
ہر سعی جو کرتا ہوں، ہوجاتی ہے لاحاصل — دل سعی تمنا سے بیزار نہ ہوجائے
انسان کو جینے کا کچھ لطف نہیں آتا — مرنے کے لئے جبتک تیار نہ ہوجائے
جینا تو محبت میں دشوار ہی ہے مجھ کو — مرنا بھی کہیں اکدن دشوار نہ ہوجائے
کب سے یہی چرچا ہے وہ آئے، وہ آپہونچے — دنیا سے کہیں رخصت بیمار نہ ہوجائے
موسیٰ نہ سمجھ لینا، جھپکیں گی نہ یہ آنکھیں — جبتک رخِ روشن کا، دیدار نہ ہوجائے
اے فطرتِ غم پیرا، غم دے، مگر اتنا دے — عاشق کی طبیعت پر، جو بار نہ ہوجائے

یہ مست نظر مجھ سے اپنی نہ ہٹا ساقی
ہر موئے بدن جبتک سرشار نہ ہوجائے

ہے شرم وحیا انکی، اک پردۂ روز افزوں
پردہ یہ کہیں بڑھکر، دیوار نہ ہوجائے

جینا مرا فرقت میں، اے ضبط تری ہاتھوں
آسان تو کیا ہوگا، دشوار نہ ہوجائے

میخانے میں آتا ہے اب ساقیِ میخانہ
اعلان یہ کردو "جو میخوار نہ ہوجائے"

مرنے ہی پہ ملنے کا وعدہ نہ کرا ے ظالم
مرنے کے لئے دنیا تیار نہ ہوجائے

بیتابیٔ نظارہ، اتنی بھی نہیں اچھی
یہ ذوقِ نظر خود ہی دیوار نہ ہوجائے

اس ڈر سے نہیں آتے، وہ خواب میں بھی نشتر
خوابیدہ مری قسمت، بیدار نہ ہوجائے

۲۱۱ ۱۶

وہ آئے تو رخصت کی، اے دیدۂ تر تونے
کیوں کر نہ دیئے صدقے، سب لعل و گہر تونے

رکھا ہے مجھے مضطر، آٹھ آٹھ پہر تونے
بے طرح ستایا ہے، اے دردِ جگر تونے

پڑتے ہی نظر لوٹے، سب قلب و جگر تونے
یہ سیکھ لئے کس سے اندازِ نظر تونے

سوچا کبھی اتنا بھی کوتاہ نظر تونے؟
کس کام یہ آئیں گے، بنوائے جو گھر تونے؟

دنیا کی نظر بدلی، پھیری جو نظر تونے
سب آئے خبر لینے، لیلی جو خبر تونے

وہ خواب میں تھے میرے کچھ تجھکو خبر بھی ہے
کس وقت جگایا ہے، اے مرغِ سحر تونے

بھولے ہیں نہ بھولینگے، جب وقت پڑا ہم پہ
احسان کئے، کیا کیا اے دیدۂ تر تونے

تو بندۂ خالق تھا، تو مالکِ ہستی تھا
اس کو بھی کبھی سوچا، اے بندۂ زر تونے

محرومیٔ نظارہ قسمت میں جو لکھی تھی
کیوں مجھ کو دیا تھا پھر، ارمانِ نظر تونے

اک روز دکھانا تھا، تجھ کو رخِ روشن بھی — جب راہ دکھائی تھی، یوں شام وسحر توُنے
تو مجھ کو سُلاتی تھی، کل تھپکیاں دے دے کر — اب خاک اُڑا ڈالی، اے بادِ سحر توُنے
سب راز محبّت کے، دُنیا پہ کئے ظاہر — کچھ دیدۂ تر توُنے، کچھ دردِ جگر توُنے
تاریکئ مرقد میں، کیا حال مرا ہوتا — احسان، کہ بخشے ہیں، کچھ داغِ جگر توُنے
ارمانِ تجلّی میں آنکھوں کو بھی رو بیٹھا — رکھّا نہ کہیں کا بھی، اے ذوقِ نظر توُنے
ہے حرف تری او پر، یہ ہوش ترا اے دل — سمجھا ہی نہیں اُنکا، ایمائے نظر توُنے
آثار محبّت کے، آدابِ محبّت کے — اُٹھ اُٹھ کے بتائے ہیں، اے دردِ جگر توُنے
برداشت کی طاقت بھی، یا رب مجھے مل جائے — بخشا ہے اگر مجھ کو، یہ دردِ جگر توُنے
جب اُن کو ترے غم میں، بے کیف گذرنا تھا — دُنیا میں بنائے تھے کیوں شام وسحر توُنے
پیری کا یہ عالم اور، یہ بے خبری نشتر
اب سونے کی ٹھانی ہے، ہنگامِ سحر توُنے

۲۱۲ 18

یوں ہی سو ٹکڑے دل رنجور ہے — اب اگر چھیڑا تو چکنا چور ہے
آنکھ تیرے نور سے معمور ہے — ساری دُنیا اب نظر میں طور ہے
شمع ڈالے کاش اس پر روشنی — کیوں حسینوں سے وفا کا فور ہے؟
لاکھ تدبیریں کرے، کیا فائدہ — آدمی تقدیر سے مجبور ہے
دیکھتی ہے آنکھ، دل کو ہے سرور — کوئی پیتا ہے، کوئی مخمور ہے
زخمِ دل رِستا رہا یوں ہی اگر — کچھ دنوں میں دیکھنا ناسور ہے

دل نے اب منزل کی ہمت باندھ لی — اب کہاں منزل ہماری دُور ہے
دیکھیے کیونکر کٹے فرقت کی رات — ایک میں ہوں، اک دلِ رنجور ہے
عشق کی سب خامیاں جاتی رہیں — اب تغافل بھی مجھے منظور ہے
جا تجھی پر چھوڑتا ہوں اپنے کام — جو تجھے منظور ہے، منظور ہے
ایسی سج دھج - اللہ اللہ یہ نکھار — آج آخر کیا تمھیں منظور ہے؟
محویت دیکھو، پہونچکر اُن کے گھر — پوچھتا ہوں سب سے، کتنی دُور ہے
اُٹھ رہے ہیں ہر طرف شور و فساد — کون کہتا ہے قیامت دُور ہے
واعظ اور بادہ کشی، توبہ کرو — یہ بھی کوئی شربتِ انگور ہے
دل سے ملنے کو وہ کہتے ہیں، مگر — دل یہی کہتا ہے، دلّی دُور ہے
کر بھی دے مجھ کو شہیدِ تیغِ ناز — زندگی میری اگر منظور ہے
ناروا ہے بے وفائی کا گلہ — بے وفائی حسن کا دستور ہے
ہو نہ ہو وہ آج آئیں گے ضرور — شام ہی سے دردِ دل کافور ہے
وسوسوں سے بڑھ گئیں دشواریاں — ورنہ منزل میری کتنی دُور ہے
اللہ اللہ یہ ترا رنگِ شباب — حُسن یوسف ہے، جمالِ حور ہے

منزلِ مقصود نشترؔ کیا ملے
۲۱۳ راہ کا ملنا ہی کوسوں دور ہے ۲۱

نہ سب فلک کیلئے ہیں، نہ سب زمیں کے لئے — کوئی کہیں کے لئے ہے، کوئی کہیں کے لئے

نہ یہ فلک کے لئے ہے، نہ یہ زمیں کے لئے ہے اُنکا نقشِ کفِ پا، مری جبیں کے لئے

ہے دل تمہارے لئے، تم دلِ حزیں کے لئے مکیں مکاں کے لئے ہی، مکاں مکیں کے لئے

تمام ملک پہ قبضہ کرے تو کیا حاصل ہے عاقبت تو بس چند گز زمیں کے لئے

خدا کرے، وہ ہمارے یہاں بھی ہو جائیں جو اپنے گھر سے چلے ہیں ابھی کہیں کے لئے

جہاں تمہارے قدم پڑ گئے ہیں دُنیا میں فلک بھی آج تڑپتا ہے اُس زمیں کے لئے

ہماری پیش نہیں چلتی، اپنے دل سے کبھی الٰہی کیا کریں اس مارِ آستیں کے لئے

یہ، روز اہلِ جہاں کے خلاف رہتا ہے کوئی فلک ہو نیا، اب تو اس زمیں کے لئے

تجھے جگہ بھی بتانی تھی سجدے کی یارب جو شوقِ سجدہ دیا تھا مری جبیں کے لئے

سوال میں کسی اُمید پر نہیں کرتا ہے اک بہانہ فقط آپ کی "نہیں" کے لئے

لگانے کو تو لگا آسمان میں پیوند مگر نہ بھول کہ آخر ہے تو زمیں کے لئے

جنوں کے جوش میں جب کچھ کمی ہوئی محسوس گلوں سے مانگ لئے چاک، آستیں کے لئے

جب آستاں ہے ترا ایک، پھر یہ کیوں یارب جگہ جگہ ہے تعیُّن، جبیں جبیں کے لئے

وفائے یار بھی ہو گی جفائے یار کے بعد ہے یعنی زہر مقدم اس انگبیں کے لئے

نہ جانے آج میں قدموں پہ گر پڑا کس کے کہ میرے سجدوں نے بوسے مری جبیں کے لئے

خدا کے واسطے اک بار اور جلوۂ حُسن ہیں فہم میں ابھی گنجائشیں یقیں کے لئے

کہو فضائے چمن سے کہ اب اجازت دے میں بیقرار ہوں، اک آہِ آتشیں کے لئے

خدا کے ہاتھ ہے، پہونچائے یا نہ پہونچائے چلا ہوں لے کے دل اک محفلِ حسیں کے لئے

خدا کے واسطے کہہ دو وہ جلد آجائیں
لگا رکھی ہے بس اک سانس واپسیں کے لئے

کبھی کبھی ہے ظہورِ جمال بھی لازم
ثبوت چاہئے دُنیا کو کچھ یقیں کے لئے

طفیلِ حضرتِ سیماب اکبرآبادی
نہیں ہے بند طبیعت کسی زمیں کے لئے

نہ جانے ضبطِ محبت نے کیا کئے نشتر
وہ میرے اشک، جو تھے میری آستیں کے لئے

۲۱۴

بہت مایوس ہو کر کل اُٹھے تھے اُنکی محفل سے
نگاہیں اسپہ جب ڈالی ہیں ہم نے دیدۂ دل سے
جہاں منزل کی جانب دو قدم بھی رکھ دیے دل سے
شکایت ہی رہی ہم کو ہمیشہ تیری محفل سے
کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ واپس آئے ہوں دل سے
ملیگا کوئی ہم سا بھی تجھے محروم مشکل سے
مری گمراہیٔ منزل کوئی پوچھے مرے دل سے
ہمارے بعد محفل میں کوئی رونق نہیں رہتی
تلاطم بھی وہی ہے، اور موجوں کے تھپیڑے بھی
بُلایا ہے شبِ فرقت، نہ آئیں وہ تو اچھا ہو
ارادہ ہے کہ کشتی ڈالدوں طوفانِ ہستی میں
نہ جانے کب نجات اس آمد و شد سے مجھے ہوگی

۲۲

الٰہی پھر اُسی محفل میں اب ہم جائیں کس دل سے!
نظر آئے ہیں سارے رنگ اس دُنیا کے باطل سے
صدا لبیک کی آنے لگی ماحولِ منزل سے
کبھی لوٹے نہ اُس دل سے، گئے محفل میں جس دل سے
وہیں رہتا ہے دل اور ہم چلے آتے ہیں محفل سے
جو ارماں لیکے آئے تھے، لئے جاتے ہیں محفل سے
نہ میرا راہبر کوئی، نہ میں آگاہ منزل سے
کہ ہم اُٹھتے ہیں محفل لیکے، جب اُٹھتے ہیں محفل سے
نہیں معلوم ہم نزدیک ہیں یا دور ساحل سے
نہ جانے کیا نکل جائے، ہمارے غم بھرے دل سے
تماشا عمر بھر دیکھا کرے یوں کون ساحل سے؟
کبھی جاتا ہوں محفل میں کبھی آتا ہوں محفل سے

نہ برہم ہو مری بیباکیوں پر صاحبِ محفل — نہیں واقف ہیں، گستاخی معاف، آدابِ محفل سے

کہاں جاؤں، اُٹھاتا ہے مجھے کیوں صاحبِ محفل — بنونگا خاکِ محفل پھر، بنا تھا خاکِ محفل سے

ذرا توفیق دے اِس دل کو یارب اور ہمّت کی — قریبِ منزلِ مقصود، ہے بیزار منزل سے

نہیں ملتی ہے مجھ کو منزلِ مقصود کیوں آخر — کہیں بھٹکا ہوا تو میں نہیں ہوں راہِ منزل سے؟

شبِ غم کاٹ دیتے ہیں یونہی ہم باتوں باتوں میں — تری تصویر سے کچھ مشورے ہوتے ہیں کچھ دل سے

مری سانسیں نہیں ہیں دعوتِ شوقِ شہادت ہیں — بُلاوے پر بُلاوے آرہے ہیں کوئے قاتل سے

ضرورت کب نویدِ بزم کی ہوتی ہے عاشق کو — کہیں پروانے لیتے ہیں اجازت شمعِ محفل سے

یقیناً اُسکے دلمیں بھی ہے سوزِ عشقِ پروانہ — نتیجہ یہ نکالا اضطرابِ شمعِ محفل سے

قیامت ہو گیا محفل میں اُنکا بے نقاب آنا — نظر آتے نہیں اب اہلِ محفل، اہلِ محفل سے

خدا جس روز ہو جائیگا میرا نا خدا نشتر — مری کشتی غم مل جائیگی آغوشِ ساحل سے

بہت دشوار ہے ملکِ عدم کا راستہ نشتر
ملے تو مانگ لو تھوڑا سا دمِ شمشیرِ قاتل سے

۲۱۵ ۲۳

ہر چیز میں چھپ چھپ کر، یہ جلوہ گری کیوں ہے؟ — مرغوبِ جب پردہ ہے، پھر پردہ دری کیوں ہے؟

دُنیائے محبت تو، جلووں سے بھری کیوں ہے؟ — جب سے تجھے دیکھا ہے، دُنیا نظری کیوں ہے؟

خود بے خبر دُنیا کرتا ہے ہمیں ظالم — پھر پوچھتا ہے خود ہی، یہ بیخبری کیوں ہے؟

کیا شاخِ نشیمن ہی سے لاگ خزاں کو تھی — یہ شاخ ہری کیوں ہے، وہ شاخ ہری کیوں ہے؟

بیمارِ محبت پر، کچھ بیت گئی شاید — خاموش فضا، ساکن، بادِ سحری کیوں ہے؟

قسمت کی طرح میری، کیا خواب میں ہے تو بھی
خاموش ابھی تک اے مُرغِ سحری کیوں ہے؟

اللہ نہیں آتا کیوں آج بھی وہ ظالم
تعبیر سے بے بہرہ، خوابِ سحری کیوں ہے؟

ڈر اِس کو نہ پانے کا، خوف اس کو نہ تپھر کا
اعمال کی یہ کھیتی، ہر وقت ہری کیوں ہے؟

عاشق کو مٹا کر تو آرام سے سونے دو
اس سوگ کے میں صدقے، یہ نوحہ گری کیوں ہے؟

کب سمجھے گی یہ دُنیا مرنے کی حقیقت کو
مر جانے پر آئے دن، یہ نوحہ گری کیوں ہے؟

نشتر ترا دل کیونکر سمجھوں کہ نہیں آیا
جو بات تو کہتا ہے، وہ درد بھری کیوں ہے

۲۱۶ ۱۱

لُطف انجام میں کچھ ہے، نہ کچھ آغاز میں ہے
ہاں اگر ہے تو نگاہِ غلط انداز میں ہے

نغمۂ حُسن ترا جب سے مرے ساز میں ہے
ایک رومانِ محبّت مری آواز میں ہے

حسرتیں بھی ہیں، تمنائیں بھی، مایوسی بھی
جانے کیا کیا مری ڈوبی ہوئی آواز میں ہے

جن کو ہے موقعِ پرواز وہ کیا سمجھیں گے
مجھ سے پوچھو جو مزہ حسرتِ پرواز میں ہے

راندن ہے جو اسیری میں تصوّر اس کا
لُطفِ پرواز سمجھے حسرتِ پرواز میں ہے

دوسرا نام قضا کا، ہے حیاتِ جاوید
میرا انجام نہفتہ، مرے آغاز میں ہے

آج کرنا ہی پڑا رحم اُنھیں آخر کار
سچ کہا ہے کہ اثر درد کی آواز میں ہے

روز یہ کہہ کے دلِ زار کو بہلاتا ہوں
چار دن کی ہے یہ تکلیف جو آغاز میں ہے

آستاں تیرا بلندی میں کوئی عرش نہیں
نقص جو کچھ ہے، مری ہمّتِ پرواز میں ہے

کچھ دنوں سے نہیں آتیں وہ صدائیں دل کی
نقص ہے میری سماعت میں کہ آواز میں ہے؟

میری آواز نہیں ہے مری تنہا آواز
تیری آواز بھی شامل مری آواز میں ہے

جانے انجامِ محبت میں ہو کیا حال مرا
شدتِ مرگ، مری کاہشِ آغاز میں ہے

عشق تیرا میں چھپاؤں تو چھپاؤں کس سے؟
ساری دُنیا تو مرے دائرۂ راز میں ہے

ظلم کرنے تو لگے ہیں وہ، مگر رُک رُک کر
میرا انجامِ محبت ابھی آغاز میں ہے

جان کو کھیل سمجھنا، نہیں ہر شخص کا کام
کوئی تو ولولہ پروانۂ جانباز میں ہے

کیا کروں چلکے طریقوں پہ ترے اے زاہد
تیرے انجام میں جو ہے، مرے آغاز میں ہے

عشق سے حُسن کا دیکھے تو کوئی استغنا
ہم پریشان ہیں، وہ جلوہ گہِ ناز میں ہے

کس زباں سے ہو ادا شکر تصور تیرا
میں اسیری میں ہوں، دل عالمِ پرواز میں ہے

عمر بھر کوئی پکارا کرے لاحاصل ہے
ہو اگر دل سے تو کام ایک ہی آواز میں ہے

کاش اس وقت وہ آجائیں، تو کہہ لوں دل کی
آج کچھ درد زیادہ مری آواز میں ہے

تم اور آواز کو سُنکر نہ تڑپ جاؤ مری
کیا کروں اس کو کہ خامی مری آواز میں ہے

اک نظر دیکھ لیا جس کو، اُسے جیت لیا
جانے کیا سحر تمہاری نگہِ ناز میں ہے

آرزوؤں سے گھرے قلب کا ہیجان نہ پوچھ
ایک نغمہ ہے کہ جو کشمکشِ ساز میں ہے

عمر بھر ہم کو تو فرقت میں تڑپتے گذری
لوگ کہتے ہیں اثر درد کی آواز میں ہے

ہر نفس کشمکشِ دل کا پتہ دیتا ہے
آج نغمہ کوئی بیتاب مرے ساز میں ہے

کیا کہوں لطف جو گویائی کا حاصل ہے مجھے
جب سے خاموشی بھی داخل مری آواز میں ہے

دے کے انسان کو سب کچھ، نہ دیا کچھ تو نے
راز کی بات تھی جو کچھ، وہ ابھی راز میں ہے

بجلیوں سے نہ شکایت، نہ خزاں سے شکوہ
یعنی تقدیرِ چمن، دستِ چمن ساز میں ہے

میں نے جب دل سے پکارا ہے سُنا ہے اُس نے
ایک تاثیر کی دُنیا مری آواز میں ہے

بے مزہ درد نہیں یوں تو کبھی بھی نشترؔ
وہ مزہ اور ہے، جو درد کے آغاز میں ہے

دیکھتا ہوں یہ تماشائے چمن اے نشترؔ
کوئی اُڑتا ہے کوئی حسرتِ پرواز میں ہے

۲۱۷ ۳۱

ایک قاتل، کہ نہیں رحم بھی بسمل کے لئے
ایک بسمل، کہ مرا جاتا ہے قاتل کے لئے

داغ کیوں عشق مہیا نہ کرے دل کے لئے
روشنی چاہیئے تاریکیٔ منزل کے لئے

ذبح کرتا ہے تو کر ذبح مجھے ہنس ہنس کر
کچھ تو تفریح کا ساماں ہو بسمل کے لئے

چار چھ جام لبالب، مجھے اچھے ساقی
گھر سے نکلا ہوں، ذرا وعظ کی محفل کے لئے

قعرِ دریا میں کوئی سانحہ شاید گذرا
آج بیتاب ہر اِک موج ہے ساحل کے لئے

جان پر دانت قضا کا ہے بہت مدت سے
کاش محفوظ رہے خنجرِ قاتل کے لئے

کیوں خفا ہے جو فنا ہو گئے پروانے چند
تجھ کو ساماں تو ملا گرمیٔ محفل کے لئے

کوئی پروانہ نہ مرنے کی ہوس میں مرتا
شمع اِک ایسی بھی ہوتی تری محفل کے لئے

اس کو تو سیبِ نظر کھا گیا ہوتا کب کا
آج اگر داغ نہ ہوتا مہِ کامل کے لئے

وعدہ دید قیامت پہ اگر تھا موقوف
کچھ تجھے صبر بھی دینا تھا مرے دل کے لئے

کیوں نہ پروانے بنے، عبرتِ محفل یارب
یہ تو آئے تھے یہاں زینتِ محفل کے لئے

مُتلاشی جو خدا کے ہیں غمِ دُنیا میں
مضطرب رہتے ہیں دریا میں بھی ساحل کے لئے

نہ کوئی ساتھ میں رہبر ہے، نہ منزل کا پتہ
کون آوارہ مری طرح ہے منزل کے لئے

باغباں اس سے تو بہتر ہے کہ لے چل کانٹے
پھول کھلائے ہوئے اور عنادل کے لئے

دیدے دونوں کو برابر سے، تو مٹ جائے گلہ
کچھ جگر کے لئے، کچھ درد مرے دل کے لئے

فرق انسان و بہائم میں نہ ہوتا نشتر
درد ملتا نہ مقدر سے اگر دل کے لئے

۲۱۸ ۱۶

تمام درد نہ کر چشم ناز رہنے دے
دل اور درد میں کچھ امتیاز رہنے دے

نہ کھینچ دل مرا اے چشم ناز رہنے دے
بہت ہیں اسمیں نشیب و فراز رہنے دے

ابھی جگر میں مرے تیر ناز رہنے دے
ٹھہر ٹھہر ارے او جلد باز رہنے دے

نگاہِ ناز کو مصروفِ ناز رہنے دے
کسی کو بھی نہ کہیں پاکباز رہنے دے

نہ دے الٰہی ہر اک بوالہوس کو جذبۂ شوق
مذاقِ عشق میں کچھ امتیاز رہنے دے

کر التفات نہ ظاہر حجاب کے پردے میں
جو ہے یہ راز تو اب اسکو راز رہنے دے

میں اپنے رازِ محبت کو راز ہی رکھوں
تری نگاہِ محبت جو راز رہنے دے

سرود نے ترے مطرب ابھار دی وحشت
یہ ہی ہے ساز جو تیرا، تو ساز رہنے دے

کسی کو اور ہوئی ہو تو ہو مجھے بھی شفا
علاجِ دردِ جگر، چارہ ساز رہنے دے

نہیں ہو دل سے اگر روزہ و نماز ترے
خدا کیواسطے روزہ نماز رہنے دے

میں جانتا ہوں حقیقت کو بھی مجاز کو بھی
جنونِ شوق ابھی امتیاز رہنے دے

میں لطف سے تری مستی کے کیوں ہوں محروم
ذرا سا ہوش تو اے چشم ناز رہنے دے

عجب سکون سا محسوس کر رہا ہوں میں — تو میرے دل پہ یونہی دستِ ناز رہنے دے

جو بے نیازِ خرد کر دیا ہے، جوشِ جنوں — تو کچھ دنوں مجھے اب بے نیاز رہنے دے

وداعِ ہوش کا ڈر ہے اگر بڑھے آگے — نگاہِ ناز کو تا حدِّ ناز رہنے دے

دلِ حزیں کی فغاں کے مزے اٹھا نشتر

دراز ہے جو شبِ غم دراز رہنے دے

۲۱۹ ۱۶

کیوں ہم کسی سے پوچھیں، تیرا کہاں نشاں ہے — آخر تو ایک دن ہم، پہونچیں گے، تو جہاں ہے

تیرا سمجھنے والا، کوئی یہاں کہاں ہے؟ — تشویش میں زمیں ہے، چکر میں آسماں ہے

ہر آدمی پہ یارب یکساں تو مہرباں ہے — دُنیا ہے باغ تیرا، تو اس کا باغباں ہے

دل پر یہ ظلم ہر دم، شایاں نہیں ہے تجھکو — مانا کہ دل مرا ہے، لیکن ترا مکاں ہے

عشق اور بدگمانی شاید الگ نہیں ہیں — میں اس سے بدگماں ہوں وہ مجھ سے بدگماں ہے

ہر چند دل کو اپنے رکھتا ہوں خوش میں لیکن — جو بات پیشتر تھی، وہ بات اب کہاں ہے؟

صیاد اس کی دُھن میں، بجلی کو اسکی حسرت — اور دیکھنے کو ظالم، تنکوں کا آشیاں ہے

قیدیِ فصلِ گل سے، شغلِ قفس نہ پوچھو — یا ذکرِ آشیاں ہے، یا فکرِ آشیاں ہے

پہلو میں دل ہے، دل میں گھر ہے مرے خدا کا — یعنی وہیں ہوں میں بھی، میرا خدا جہاں ہے

گرمیِ زیست میری، قایم ہے جب اسی سے — کیونکر کہوں کہ میری ہر سعی رائیگاں ہے

جب سے زباں نے میری، سیکھی ہے بے زبانی — میں ہوں زباں مجسم، ہر موئے تن زباں ہے

غم کے مقابلے میں، دُنیا کا عیشِ باطل — اک بے بہار گلشن، اک باغِ بے خزاں ہے

دُنیا تمام بدلی، کمبخت یہ نہ بدلا
پہلے جو آسماں تھا، اب بھی وہ آسماں ہے

ہر پھر کے دردِ تیرا ہے دلیں اور جگر میں
دو چار دن یہاں ہے، دو چار دن وہاں ہے

کب آزما چکیں گے، یارب وہ میری اُلفت
ہر وقت آزمائش، ہر وقت امتحاں ہے

جو کہدیا زباں سے، وہ کہدیا زباں سے
تیری زباں نہیں ہے، ظالم مری زباں ہے

دل خوش اگر ہے اپنا، دشت و چمن ہیں یکساں
دل ہے اگر شگفتہ، ہر چیز گلستاں ہے

اے برق دیکھ ظالم، اسپر نہ آنچ آئے
یہ شاخِ نے نہیں ہے، یہ شاخِ آشیاں ہے

بیزار ہو چلا پھر، میں جستجو سے تیری
اے پردہ دار مجھ کو آواز دے کہاں ہے؟

گھبرا کے میں جو بھاگوں، تو جاؤں کسطرف کو
چاروں طرف زمیں ہے، ہر سمت آسماں ہے

برباد کیوں ہے غافل، تو آشیاں کے پیچھے
اس آشیاں سے بہتر اک اور آشیاں ہے

جنکی طلب تھی صادق، وہ پا گئے ہیں تجھ کو
اور کہنے والے یونہی کہتے رہے کہاں ہے؟

کیا اُس چمن سے اپنا، دنیا میں دل لگائیں
ہر وقت جس چمن کو اندیشۂ خزاں ہے

وہ نزع کی خبر سے خاموش ہو گئے ہیں
لو سعیٔ آخری بھی عاشق کی رائگاں ہے

مانوس کس قدر ہوں میں اپنے آشیاں سے
اک سمت ساری دُنیا، اک سمت آشیاں ہے

کتنا ہی راز کوئی اپنا چُھپا کے رکھے
دو دن میں دیکھ لیگا ہر شخص رازداں ہے

کیا ہم کو قید کر کے حاصل ہوا کسی کو
ہم ہیں قفس کے اندر، نظروں میں آشیاں ہے

نشتؔر مجھے شکایت کرنے کی خو نہیں ہے
اور وہ سمجھ رہے ہیں شاید یہ بے زباں ہے

مانا گناہ میرے ہیں بے حساب نشتؔر

۲۲۰ رحمت بھی تو خدا کی، اک بحرِ بیکراں ہے ۲۹

کیا کہوں تجھ سے کہ مجھ کو درد کتنا چاہیئے
جو ملا ہے سب جہاں کو، مجھ کو تنہا چاہیئے

یاد تیری دل کو، اور آنکھوں کو جلوا چاہیئے
جسکو دونوں میسّر ہوں اُسے کیا چاہیئے!

پوچھیئے دل سے ہماری زندگی کا ماحصل
جسکو ہم چاہیں، جو وہ چاہے، تو پھر کیا چاہیئے؟

کیوں جفا سے باز آئیں، کیوں جفائیں چھوڑ دیں
اُنکو مطلب ہے تماشے سے، تماشا چاہیئے

تم جفا چھوڑو، نہ چھوڑو، یہ تمھیں ہے اختیار
آدمی کے دل میں لیکن درد ہونا چاہیئے

کیوں نہ میں کہوں، ہجومِ آرزو چاروں طرف
عشق والوں کو خدا اک اپنی دُنیا چاہیئے

عشق تیرا فطرتاً انسان کی قسمت میں ہے
موت کو بھی تو بالآخر اِک بہانا چاہیئے

ابتدائے عشق میں تم نے وفائیں کیں فضول
نبھ سکے جو عمر بھر، وہ کام کرنا چاہیئے

وہ مِرا آنے کے بارے میں کسی سے پوچھنا
وہ کسی کا ہنس کے کہدینا کہ "دیکھا چاہیئے"

نا اُمیدی اسقدر بھی عشق میں اچھی نہیں
کچھ دنوں تو حضرتِ دل اور دیکھا چاہیئے

موت بھی آتی ہے، ملتے ہیں مزے بھی زیست کے
عشق میں کیا کچھ نہیں ممکن، دل آنا چاہیئے

چار دن میں بھول جاؤں کسطرح رودادِ عشق
بھولنے کیواسطے بھی اِک زمانا چاہیئے

اور بڑھ جاتے ہیں ظلم اُنکے، جو کرتا ہوں فغاں
اب میں سمجھا مجھ کو شاید ضبط کرنا چاہیئے

جور کچھ دن کے لئے روکو کہ اب دلکو مرے
کچھ تسلّی، کچھ تشفّی، کچھ دلاسا چاہیئے

آرزوئے دیدِ جاناں کر کے نشتر کیا کروں
۲۲۱ آنکھ بھی پہلے بہ اندازِ تمنّا چاہیئے ۱۵

جو اوروں کے لئے زندہ رہے، چرچا اُسی کا ہے — فنا ہو جائے جو قبلِ فنا جینا اُسی کا ہے

یہ دلچسپی یہ بیزاری ہے کیوں باغ اور صحرا سے — ارے ناداں جس کا باغ ہے صحرا اُسی کا ہے

طلب اُسکی ہے، جو پروانہ ساں جل جل کے مر جائے — نہ لوٹے جاکے اُنکی بزم سے، جانا اُسی کا ہے

بھٹکتا کس لئے کوئی پھرے دیر اور کعبے میں — کسی کو چشمِ دل سے دیکھ تو، جلوا اُسی کا ہے

بشر جینے کو یوں سمجھا کرے دلمیں کہ ہے زندہ — جو مر جاتا ہے اُسکی راہ میں جینا اُسی کا ہے

پہونچ جائے جو چل کر منزلِ مقصود تک اپنی — بساطِ عشق و اُلفت میں قدم رکھنا اُسی کا ہے

جسے کہنے کی عادت ہے نہیں سُنتا کوئی اُسکی — نہ کہکر کچھ سکے سب کچھ یہاں کہنا اُسی کا ہے

پتنگے شمع پر یوں تو جلا کرتے ہیں محفل میں — جو اپنے سوز سے جلجائے جل جانا اُسی کا ہے

نشاط و غم کا جس پر کچھ اثر ہونے نہیں پاتا — ہمارا آپ کا جینا نہیں، جینا اُسی کا ہے

جو زاہد وعظ کہتا ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے — کہ دُنیا بے خدا کی ہے، خدا گویا اُسی کا ہے

جو اِس کو اِس طرح دیکھے کہ جیسے کچھ نہیں نشتر — یہ دُنیا ہے اُسی کی گلشنِ دُنیا اُسی کا ہے

۲۲۲ ۱۱

کہیں یوں انتظامِ گلشنِ ایجاد ہوتا ہے! — جو دس برباد ہوتے ہیں تو ایک آباد ہوتا ہے

اسیرِ زندگی جو انسان کو رکھتا ہے دُنیا میں — چمن بھی اک طرح کا خانۂ صیاد ہوتا ہے

ہزاروں قید ہیں سب کی انساں کے لئے قیدیں ہیں دنیا میں — خیالِ انسان سے اچھا ہی جو آزاد ہوتا ہے

نہیں اِس قالبِ خاکی کا اطمینان دم بھر بھی — یہ ہی گھر ہم نے وہ دیکھا، جو بے بنیاد ہوتا ہے

مزہ قیدِ قفس کا راس آیا ہے طبیعت کو — کہ اب جو چھوڑ دیتا ہے مجھے، صیاد ہوتا ہے

ابھی وہ جان لینے کے طریقے جانتے کیا ہیں — کہیں جلاد کہنے سے کوئی جلاد ہوتا ہے
ابھی تک جنگلوں میں تعزیت ہوتی ہے مجنوں کی — پہاڑوں پر ابھی تک ماتمِ فرہاد ہوتا ہے
مصیبت اپنی کس کے سامنے روؤں، کہاں جاؤں؟ — کسی کو کب خیالِ خاطرِ ناشاد ہوتا ہے
محبت میں جہاں سب اور رہا اک یہ بھی مشکل ہے — کہ مایوسی کے قابو میں دلِ ناشاد ہوتا ہے
یقیناً کامیابی عشق میں تیرے ہوئی مجھکو — جہاں جاتا ہوں اک شورِ مبارکباد ہوتا ہے
ارے ناداں کسی کی موت پر، ماتم سے کیا حاصل — یہ وہ دن ہے کہ قیدی قید سے آزاد ہوتا ہے
عبث ہے آشیاں کا رنج، بجلی کا گلہ ناحق — جو بستا ہے وہ ہی تو خانماں برباد ہوتا ہے
زمانے کو شکایت ہے کسی کے جورِ پیہم کی — یہاں حسرت ہے، کب وہ مایلِ بیداد ہوتا ہے
تسلی دلکو ہو جاتی ہے، بندھ جاتی ہے ڈھارس سی — جو تیرا غم شریکِ خاطرِ ناشاد ہوتا ہے
یہ کیا کم ایک شاعر کے لئے ہے فخر کا باعث — نہ ہو اولاد پھر بھی صاحبِ اولاد ہوتا ہے
سخن گوئی زمانہ کر رہا ہے اور کئے جائے — وہ ہی شاعر ہے جسپر سایۂ استاد ہوتا ہے
تڑپنے، کوندنے، گرنے سے، نشتر برق کو مطلب
۲۲۳ بلا سے اُس کی، کوئی خانماں برباد ہوتا ہے ۱۷

صبح تک مجھ کو جگانا شام سے — میں تو عاجز ہوں دلِ ناکام سے
نام پر جن کے مٹے جاتے ہیں ہم — اُن کو نفرت ہے ہمارے نام سے
نام تیرے سیکڑوں ہیں، یہ بتا — ہم تجھے آواز دیں کس نام سے
کوچۂ قاتل میں اللہ رے ہجوم — بند ہو جاتا ہے رستہ شام سے

صبح مثلِ شام ہے اب، یا کبھی — صبح شرماتی تھی میری شام سے
صبح کی رنگینیوں کے شیفتہ — بے خبر ہیں اپنی اپنی شام سے
یہ نہ ہو تو شادمانی پھر کہاں — کیوں ڈروں میں کاہشِ آلام سے
جان چھوڑے گی کبھی تو زندگی — ہم کبھی تو سوئیں گے آرام سے
تشنہ کامی یوں تو میری جا چکی — اپنی جھوٹی دو لبِ گلفام سے
دیکھئے کس طرح ہوتی ہے سحر — آج گھبراہٹ بہت ہی شام سے
شام کا وعدہ ہے اُس سے ایخدا — صبح کی سرحد ملا دے شام سے
وصل کی شب کا کہیں کیا اختصار — صبح آجاتی ہے ظالم شام سے
چھپ گیا ہے دل تمناؤں میں یوں — جس طرح سورج غبارِ شام سے
ظرفِ چشمِ ساقی مستانہ دیکھ — خُم بھرے جاتے ہیں روز اس جام سے
چار دن کی زندگی کا کیا گلہ — کٹ گئی تکلیف یا آرام سے
تجھ کو کیا ایدل جو وہ ہیں بیوفا — کام رکھ نادان اپنے کام سے
تیری بھی سن لینگے واعظ ایک دن — ملگئی فرصت جو شغلِ جام سے
آنہ جائے اس میں دُنیا کی خوشی — دل کو بھر لے عشق کے آلام سے
یونہی کیا کم تھے حجاب اندر حجاب — دل بھی تو نے بھر دیا اوہام سے
خُم کا خُم ساقی خدا کیواسطے — اسطرح کھیلونگا کبتک جام سے
ایک ساتھی چاہئے فرقت کی رات — دل میں آجا درد بنکر شام سے

اُسکا ملنا ہے، ملے جو بے غرض — یوں تو سب ملتے ہیں اپنے کام سے

جو اُتر جاتی ہے قسمت سے مری
۲۲۴ خود چھلک جاتی ہے نشتر جام سے ۲۴

رات گذری میری کس آرام سے — پوچھ لو آ کر چراغِ شام سے

کُلفتِ شبہائے فرقت کچھ نہ پوچھ — صبح تک بیداریاں ہیں شام سے

صبح سے تا شام تیرا انتظار — رات بھر اختر شماری شام سے

اُن کو دھوکے سے بلالے ہمنشیں — وہ نہ آئیں گے ہمارے نام سے

روز جل جل کر جلاتا ہے ہمیں — سخت عاجز ہیں چراغِ شام سے

کامیابی گر تجھے منظور ہے — عشق میں رکھ کام اپنے کام سے

دن محبت کے وہ مجھ کو یاد ہیں — صبح کی تیاریاں تھیں شام سے

جب ہوئی تیری عنایت کی نظر — کٹ گئی تکلیف بھی آرام سے

ہائے یہ ہر وقت تیرا انتظار — باز آیا ایسی صبح و شام سے

آج ساقی آنکھوں آنکھوں میں پلا — جام میں آنے دے سیدھی جام سے

مست نظریں روک اپنی ساقیا — چھلکی جاتی ہے ہمارے جام سے

موت کہتے ہیں جسے وہ ہے فقط — سیر ہو جانا غمِ ایام سے

کس نے شورِ حشر برپا کر دیا — سو رہے تھے ہم بڑے آرام سے

جب وہ میرے گھر پہ سوتے ہیں کبھی — صبح ہو جاتی ہے ظالم شام سے

ہائے یہ غم اور یہ یاس و ہراس — موت کے آنے لگے پیغام سے
مستیٔ دُنیا کو کافی ہے وہ ہی — جو چھلک جاتی ہے میرے جام سے
ہیں جو مستِ چشمِ ساقیٔ ازل — کیوں ڈریں وہ گردشِ ایام سے
چھوڑ کر سب کچھ خدا کیواسطے — آج وہ باتیں دلِ ناکام سے

بیوفاؤں سے تجھے چشمِ وفا
باز آ نشترؔ خیالِ خام سے

۲۲۵ — ۱۹

سفاک ہے جو آنکھ تو قاتل نظر بھی ہے — دیدہ و جان میں تو کروں کیا مفر بھی ہے!
اللہ کیا بلا ترا تیرِ نظر بھی ہے — مجروح صرف دل ہی نہیں ہے، جگر بھی ہے
زخمی تری نگاہ کے لاکھوں سہی، مگر — کوئی ہماری طرح خرابِ نظر بھی ہے؟
یہ دیکھنے کا ڈھنگ تو دیکھے کوئی ذرا — اُنکی، نظر بھی مجھ پہ نہیں ہے، نظر بھی ہے
ارمانِ دیدِ یار تو بیجا نہیں، مگر — پہلے یہ دیکھ لوں کہ مجالِ نظر بھی ہے
خوفِ خدا نہیں جسے، وہ آدمی نہیں — دُنیا اُسی کی ہے جسے خالق کا ڈر بھی ہے
آخر ہمارے واسطے بخلِ گناہ کیوں — تیری ہی تو نہیں ہے، ہماری نظر بھی ہے
ہے دُہوم فصلِ گُل کی چمن میں اُٹھو چلو — اے میکشو بسنت کی تم کو خبر بھی ہے؟
مانا کہ میرے دلکو بھی تھا فطرتاً لگاؤ — لیکن قصوروار تمہاری نظر بھی ہے
دل لیکے عاشقوں کے ستاتے ہو رات دن — آخر تمھیں کسی کا زمانے میں ڈر بھی ہے؟
جی چاہتا ہے دل کیلئے کچھ دُعا کروں — اِسوقت کچھ سکوں بھی ہے وقتِ سحر بھی ہے

کمبخت آفتاب کہاں جا کے سو گیا
یارب ہماری رات کی آخر سحر بھی ہے؟

قیدِ قفس میں گھر کے لئے رو رہا ہے کیوں
سمجھا ہے تو نے گھر جسے غافل وہ گھر بھی ہے؟

آمد جو ہے چمن میں کسی مستِ حسن کی
اٹھکھیلیوں پر آج نسیمِ سحر بھی ہے

سارا جہان جلوہ گہِ طور ہے تو کیا
ہم کیا کریں ہمیں بھی فروقِ نظر بھی ہے

ممکن جو کچھ ہے عشق میں وہ کر رہا ہوں میں
نالے بھی ہیں فغاں بھی دعائے سحر بھی ہے

اس کشمکش میں خاک ملے لطفِ زندگی
عقبیٰ کا ڈر بھی ہے ہمیں دنیا کا ڈر بھی ہے

آنے سے جنکو عذر تھا، لو وہ خود آ گئے
اِک معجزہ ہماری دعائے سحر بھی ہے

نشترؔ گلہ ہے اُس کے تغافل کا ناروا
سب کی خبر جسے ہے، تمہاری خبر بھی ہے

۲۲۶ ۱۹

بے شک کوئی شے صبر سے بہتر تو نہیں ہے
لیکن یہ محبت میں میسّر تو نہیں ہے

مانا کہ قفس باغ سے باہر تو نہیں ہے
مانوس تھا جس گھر سے میں وہ گھر تو نہیں ہے

عقبیٰ سے یہ دُنیا کبھی بہتر تو نہیں ہے
ہوتا مگر انسان کو باور تو نہیں ہے

مانا ترے قابل دلِ مضطر تو نہیں ہے
ارشاد سے لیکن ترے باہر تو نہیں ہے

ہم کیا کریں کس طرح کریں ضبطِ محبت
قابو میں ہمارے دلِ مضطر تو نہیں ہے

ہم راہ پہ لائیں نہ انھیں ہو نہیں سکتا
مشکل سہی، امکان کے باہر تو نہیں ہے

شنوائی یہاں بھی نہیں ہوتی نظر آتی
انکی ہی طرف داورِ محشر تو نہیں ہے

مانا کہ تصوّر میں ہیں ساقی کی نگاہیں
وہ سامنے بھیگا ہوا منظر تو نہیں ہے

ہنس ہنس کے نہ سنئے مری روداد محبت
یہ قصۂ دارا و سکندر تو نہیں ہے

ہوتا ہی نہیں ترک، کروں ترک میں کیونکر
عشق بت مغرور مقدر تو نہیں ہے؟

ملتی ہے تڑپ اسکی، تڑپ سے مرے دلکی
بجلی بھی کسیکا دل مضطر تو نہیں ہے

انصاف یہیں کیوں نہیں ہوتا مرا یارب
رحمت تری وابستۂ محشر تو نہیں ہے

جاتا ہوں نہیں لیکن کوئی اتنا تو بتا دے
اس بزم میں کچھ دل کے لئے ڈر تو نہیں ہے

برداشت کئے جائیں ترے ظلم کہاں تک
دل ہی تو ہے آخر کوئی پتھر تو نہیں ہے

مانا کہ مجھے باغ کو چھوڑے، ہوئی مدت
پنہاں مری نظروں سے وہ منظر تو نہیں ہے

میں تجھ کو ستم کے لئے تکلیف نہ دیتا
مجبور ہوں دل عیش کا خوگر تو نہیں ہے

مانا کہ ترا درد بڑی چیز ہے ظالم
اب زندگی لیکن مجھے دوبھر تو نہیں ہے

راتوں کو نظر اس سے ہٹائے نہیں ہٹتی
چاند آپ کا عکس رخ انور تو نہیں ہے

جو عشق میں گھبرائے، وہ کچھ اور ہے نشتر
دریائے محبت کا شناور تو نہیں ہے

جائے کوئی گھر پر تو وہ باہر نہیں آتے
یہ پوچھتے ہیں پہلے کہ نشتر تو نہیں ہے؟

۲۲۷ ۲۰

خاموش رہیں گے، کبھی فریاد کرینگے
ختم اپنی یونہی قید کی میعاد کرینگے

کچھ روز ہم اب خاطر صیاد کرینگے
کھنچیں گے کوئی آہ نہ فریاد کرینگے

جس دن کوئی تازہ ستم ایجاد کرینگے
اس روز وہ دانستہ مجھے یاد کرینگے

کہتا ہوں پکاریں، بڑے بول سے توبہ
بھولے ہیں جو مجھکو، وہ کبھی یاد کرینگے

برداشت کیے جا، ستم اُنکے یونہی اے دل
یہ اہلِ ستم بھی تجھے کیا یاد کرینگے!

کامل ہے اگر جذبِ محبت تو کسی دن
بھولینگے ہم اُن کو وہ ہمیں یاد کرینگے

جب موسمِ گُل ہو گیا گلزار سے رخصت
کیا قید سے ہم چھُوٹ کے صیاد کرینگے

کیا جانتے تھے، ہم جو چلے جاؤ گے گھر سے
جس چیز کو دیکھیں گے تمھیں یاد کرینگے

دی ضبطِ محبت نے اگر ہمکو اجازت
وا، ہم بھی کسی دن لبِ فریاد کرینگے

کوتاہی جفاؤنیں بدستور ہے اُنکی
کچھ اور علاجِ دلِ ناشاد کرینگے

کافر ہوں اگر قید کا ہو دل میں ذرا ڈر
اُس روز سے ڈرتا ہوں جب آزاد کرینگے

کچھ روز نباہینگے ستم آپ کے یوں بھی
خاموشیوں کو داخلِ فریاد کرینگے

آئے جو قفس میں تو سُنا منع ہے فریاد
سمجھے تھے کہ جی کھول کے فریاد کرینگے

خوشیوں نے تو ہر وقت ہمیں رنج میں رکھا
اب دل کو غمِ دوست سے آباد کرینگے

ہمنے بھی محبت میں یہ اب سوچ لیا ہے
جو ہم سے کہے گا دلِ ناشاد، کرینگے

آنے جو لگا لُطفِ اسیری ہمیں نشتر
اب روز یہ دھمکی ہے کہ آزاد کرینگے

۲۲۸ ۱۶

یہ ہمنے کیا کیا کہ گلستاں میں آ گئے
اک رنگ و بُو کے حشرِ پریشاں میں آ گئے

صد شکر مر کے کوچۂ جاناں میں آ گئے
بچھڑے ہوئے چمن کے، گلستاں میں آ گئے

خوشیاں نہ دے سکینگی مجھے اب فریبِ لطف
سارے مزے مرے غمِ پنہاں میں آ گئے

نکلے خزاں میں باغ کی جانب تو ہمنشیں
معلوم یہ ہوا کہ بیاباں میں آ گئے

اللہ کس غضب کی ہے طاقت خیال میں
بیٹھے رہے قفس میں، گلستاں میں آ گئے

آزادیاں وہاں تھیں میسر نہیں یہاں
قیدِ قفس سے قیدِ گلستاں میں آ گئے

باغِ جہاں بھی کوئی ٹھہرنے کی تھی جگہ
کیا کیجئے فریبِ گلستاں میں آ گئے

صیاد اور خزاں سے ہمیں واسطہ نہ تھا
یہ کیوں ہمارے صحنِ گلستاں میں آ گئے

ایمان کی یہ ہے کہ فرشتوں سے جو بچے
اوصاف سب وہ فطرتِ انساں میں آ گئے

اے دل چل آج تجھکو دکھائیں بہارِ باغ
آئے تھے جتنے پھول گلستاں میں آ گئے

اچھے وہ ہی رہے کہ جنھوں نے نہ کی تمیز
ہم ہی فریبِ باغ و بیاباں میں آ گئے

دم بھر کی بھی جدائی گوارا نہیں ہمیں
اتنے مزے کہاں سے گلستاں میں آ گئے

مانوس ہم نے کر لی طبیعت جو رنج سے
گلشن کے لطف ہمکو بیاباں میں آ گئے

اس کا پتہ لگا نہ ہمیں آجتک کہ ہم
لائے گئے کہ عالمِ امکاں میں آ گئے

قیدِ قفس کا رنج ہماری بلا کرے
جب کر لیا خیال گلستاں میں آ گئے

بیمارِ غم میں کچھ بھی نہ باقی تھا شامِ غم
تم جان بنکے قالبِ بیجاں میں آ گئے

یارب یہ کیا ہوا مرا جوشِ جنوں میں حال
سارے جہاں کے تار گریباں میں آ گئے

راہِ مفر دکھائی نہ دی جب کہیں ہمیں
اُٹھے اور اُٹھ کے گورِ غریباں میں آ گئے

آباد کیوں نہ باغ یہ نشتر رہے، کہ پھول
جتنے گئے تھے پھر وہ گلستاں میں آ گئے

۲۲۹ ۱۹

جب اپنے دل میں اُنکی چاند سی تصویر دیکھیں گے
تو ہم خلوت میں اپنی عالمِ تنویر دیکھیں گے

فغانِ بے اثر، فریادِ بے تاثیر دیکھیں گے
مقدر جو دکھائیگا، بہ ہر تقدیر دیکھیں گے

نہ تدبیر اب، نہ اب تدبیر کی تاثیر دیکھیں گے
دکھائیگی جو ہم کو گردشِ تقدیر دیکھیں گے

کبھی تو دھندلے دھندلے نقش ابھرینگے تصور کے
کبھی تو صفحۂ دل پر تری تصویر دیکھیں گے

جوانی خواب ہی، تعبیر ہے اُس خواب کی پیری
ہمیں نے خواب دیکھا ہے، ہمیں تعبیر دیکھیں گے

عطا ہوگی کبھی آنکھوں کو بھی توفیقِ نظارہ
کبھی ہم بھی تمہارا حُسنِ عالمگیر دیکھیں گے

ہماری یہ اسیری بھی اسیری ہے اُسی دن تک
کہ جبتک اپنی زنجیروں کو ہم زنجیر دیکھیں گے

خیالِ فصلِ گل سے شاد تھے ہم، یہ خبر کیا تھی
بہار آتے ہی اپنے پاؤں میں زنجیر دیکھیں گے

ابھی تو کچھ نہیں کہتے، مگر فصلِ گل آنے دو
کہاں تک سخت ہے یہ پاؤں کی زنجیر دیکھیں گے

بچا کر ہم سے دامن چلنے والے، یہ سمجھ رکھیں
پسِ مُردن ہماری خاک دامنگیر دیکھیں گے

یہی مشقِ تصور ہے تو ہم کچھ روز میں نشترؔ
۲۳۰ نمایاں اپنی ہی صورت میں اک تصویر دیکھیں گے ۱۱

خراب ہونے کو پھر رہا ہوں، خراب کردے خراب کردے
قسم تجھے اپنی چشمِ میگوں کی، مجھکو مستِ شراب کردے
نہیں یہ انصاف، حُسن کو تو اگر سکوں انتساب کردے
کیا ہے مجھکو تو اے محبت، اُسے بھی خانہ خراب کردے
بڑھا دے اور اضطرابِ دل اب، مجھے تمام اضطراب کردے
یہ تجھ سے کِس نے کہا تھا، بجلی کو میرے دل کا جواب کردے

بنا نہ آئینہ انجمن کا، تو پھر شریکِ نقاب کر دے
مری نگاہوں کو چھپنے والے کسی طرح کامیاب کر دے

کہاں تک آخر یہ تیرہ بختی، رہیگی قایم یوں ہی الٰہی
مری شبِ تارِ ہجر کو بھی، کبھی شبِ ماہتاب کر دے

ہمیشہ سوئی ہوئی رہی ہے، ہماری تقدیر عاشقی میں
الٰہی بدقسمتی کو بھی چند روز مجبورِ خواب کر دے

کہاں پھنسا ہے تو اَنیس ایدل، یہی ہیں سب زحمتوں کے باعث
اُٹھ اور ہوش و خرد کو اپنے، نثارِ جامِ شراب کر دے

بناہ کی شکل اب کہاں ہے، الٰہی تجھ سے یہ چاہتا ہوں
کہ اُن میں کچھ انقلاب کر دے، کہ مجھ میں کچھ انقلاب کر دے

محبت اپنی تمام قوت کے ساتھ، انسان پر ہے حاوی
کسی کو خانہ بدوش کر دے، کسیکو خانہ خراب کر دے

ذرا درختوں کا جھومنا تو، یہ کوئی صحنِ چمن میں دیکھے
کہ پتی پتی کو جیسے کوئی، پلا کے مستِ شراب کر دے

نہ ہو جو ممکن حصولِ عقبیٰ بغیر اِسکے کسی طرح بھی
ہماری عقبیٰ بنا دے یارب، ہماری دُنیا خراب کر دے

محبت اور اُسکے راز نشتر سمجھ میں آئیں گے آتے آتے

۲۳۱ کتاب تو ہی نہیں محبت، جو کوئی نقلِ کتاب کر دے ۱۲

چمن جو تیرا حقیقتاً ہے چمن یہ مرغِ چمن نہیں ہے
جسے وطن فرض کر لیا ہے، وہ اور کچھ ہے وطن نہیں ہے
وہ آج اِدھر آرہے ہیں شاید کہ دل میں رنج و محن نہیں ہے
سکون محسوس ہو رہا ہے، وہ روز والی جلن نہیں ہے
نہیں کوئی وقت اب کہ جس وقت، دل میں رنج و محن نہیں ہے
چمن بظاہر ہی چمن ہے، مگر وہ رنگِ چمن نہیں ہے
گھٹائیں کالی نہیں ہیں ظالم، کہ رنگ و بوئے چمن نہیں ہے
وہ کون سی چیز ہے جو کمبخت آج تو بہ شکن نہیں ہے
یہاں نہیں حد خوشی کی کوئی، کچھ انتہائے محن نہیں ہے
کسی کے تن پر لباسِ زرّیں، کسی کو دو گز کفن نہیں ہے
مزے بہارِ چمن کے لیلے، بہار پر ہے بہار جب تک
کبھی بہارِ چمن ہے غافل، کبھی بہارِ چمن نہیں ہے
تمام پروانے بے کفن ہیں، یہ کیا ہے اندھیر شمعِ محفل
کسی کو ہو یا نہ ہو، مگر کیا، تجھے بھی فکرِ کفن نہیں ہے
خدا کی قدرت پہ دم بخود ہوں، نہ کچھ میں بولوں نہ کچھ میں سمجھوں
وہاں کروں کیا بجز خموشی، جہاں مجالِ سخن نہیں ہے

نہیں یہاں کوئی چیز ایسی، بتا سکے جس کو کوئی اپنی
بدن بھی ملک لحد ہے، یعنی بدن بھی اپنا بدن نہیں ہے
یہ میرے لیل و نہارِ غربت، بڑی مصیبت، بڑی مصیبت!
کہ شامِ شامِ وطن نہیں ہے، تو صبح صبحِ وطن نہیں ہے
جو ان سب اُٹھتے جا رہے ہیں، اجل سے کوئی نہیں یہ کہتا
یہ شاخِ نو ہے ارے ستمگر، یہ شاخِ شاخِ کہن نہیں ہے
ابھی سے کیوں مرنے والے کو سب، عزیز اقارب بھلا رہے ہیں
ابھی تو دو دن کا بھی پُرانا، لحد کے اندر کفن نہیں ہے
یہ موسمِ گُل اور اس میں واعظ، تری یہ تلقینِ ترکِ بادہ
بتا دے تو ہی پھر اور کیا ہے، اگر یہ دیوانہ پن نہیں ہے
رہوں نہ غربت میں کیوں میں غمگیں کہاں سے لاؤں نشاطِ رنگیں
وطن کی جب وہ زمیں نہیں ہے، وہ آسمانِ وطن نہیں ہے
نہیں ہم اُن میں، جو اعتبارِ بہار پر شادیاں منائیں
بہار کا اعتبار کیا ہو، جب اعتبارِ چمن نہیں ہے
غریب نو عمر کیا کہے شعر، لطف لائے کہاں سے اس میں
شراب تو اُس کے جام میں ہے، مگر شرابِ کہن نہیں ہے
مرے تصوّر کو قید کر لے، تو جھ کو صیّاد قید سمجھے

نہیں تو وہ کون وقت ہے، جب نظر میں میری چمن نہیں ہے
کوئی بتائے کہ قیس و لیلیٰ، ہوئے زمانے میں کتنے پیدا؟
حقیقتاً عشق اور محبت بھی، کارِ ہر مرد و زن نہیں ہے
کوئی بتائے پسِ فنا، فرق ہے امیر و غریب میں کیا؟
امیر اگر حاملِ کفن ہے، غریب بھی بے کفن نہیں ہے
مصیبتیں لاکھ ہوں وطن میں، ہزار غربت میں راحتیں ہوں
وہ آدمی آدمی نہیں ہے، جو بیقرارِ وطن نہیں ہے
جہاں گیا میں، وہاں سر آنکھوں پر اپنی، دُنیا نے مجھکو رکھا
کسے کہوں میں وطن ہے میرا، کسے کہوں میں وطن نہیں ہے
نہ زندگی پر کسی کی خوش ہو، نہ موت پر ہو کسی کی نالاں
وہ انتہائے خوشی نہیں ہے، یہ انتہائے محن نہیں ہے
فنِ سخنگوئی آج نشتر فروغ پائے تو پائے کیونکر
مذاق تو ہے سخن کا، لیکن صحیح ذوقِ سخن نہیں ہے

۲۳۲

اب تو لے شوخ کسی روز ملاقات رہے
فصل ہو کوئی بھی، میخانے میں برسات رہے
بھول کر بھی نہ کبھی راہ سے انساں بھٹکے
ڈھونڈتے تجھ کو زمانے میں پھریں ہم دن رات

۲۳

بات پر اپنی اڑا ہوں، تو مری بات رہے
دور رہنے کا مزہ یہ ہے کہ دن رات رہے
دل میں ہر وقت اگر خوفِ مکافات رہے
اور مزہ یہ کہ ترے ساتھ ہی دن رات رہے

جانتا کوئی نہیں بات کسے کہتے ہیں
سب کو لیکن یہ پڑی ہے، کہ مری بات رہے

آپ جاتے ہیں جسے دیکھنے، اب صبح کے وقت
وہ تو سنتے ہیں کہ چلتا ہوا، کچھ رات رہے

چھپ کے آنکھوں سے، خیالوں میں ہیں وہ میرے
کچھ دنوں یوں بھی مری اُنکی ملاقات رہے

بات رہنے کی کریگا نہ کبھی بات کوئی
چاہتے سب ہیں کہ دُنیا میں مری بات رہے

اور کیا چاہیے ہم بادہ گساروں کے لئے
ہاتھ میں جام رہے، جوش میں برسات رہے

چاہیے تھا کہ مئے عشق سے بیخود رہتے
مُفت پابندِ حکایات و شکایات رہے

اور تھا کون، اگر پاس نہ تھے تم شبِ غم
کس سے پھر تذکرہ شکر و شکایات رہے؟

اور ہوگا کوئی راس آئی محبت جسکو
ہم تو ہر وقت گرفتارِ صد آفات رہے

یہ جو باقی ہے، تو اک روز ملا دیگا ہمیں
وہ ملیں یا نہ ملیں، شوقِ ملاقات رہے

اپنی محرومئ قسمت کو کہاں تک روئیں
پاس رہ کر تیرے، محرومِ ملاقات رہے

محفلِ وعظ سے جس وقت چلے ہم اُٹھ کر
ہم رہے وہ، نہ ہمارے وہ خیالات رہے

تونے رفتارِ زمانہ پہ کبھی کی نہ نظر
تیرے واعظ وہی فرسودہ خیالات رہے

چھوڑ دوں عشق کو منجدھار میں کیوں اے نشتر
اب تو مجھ کو یہ پڑی ہے کہ مری بات رہے

۲۳۳ ۱۷

دل سے اب عشق کا ارمان نہ جانے پائے
ہاتھ آیا ہوا میدان نہ جانے پائے

دل میں آجائے جو ارمان نہ جانے پائے
گھر سے باہر کوئی مہمان نہ جانے پائے

کبھی بھولے سے بھی مایوس نہ ہونا اے دل
وصل ہو، یا نہ ہو، امکان نہ جانے پائے

تجھ کو لازم ہے مداراتِ تمنّا اے دل
گھر سے ناخوش کوئی مہمان نہ جانے پائے

ایک آنسو بھی نہ ہو آنکھ سے باہر لے دل
ضبطِ غم کی یہ مرے شان نہ جانے پائے

صاحب بزم ہے تو، اسکا بھی لازم ہے خیال
کوئی محفل سے پریشان نہ جانے پائے

حسرتِ دید خدا کے لئے پوری کرنا
میرے ہمراہ یہ ارمان نہ جانے پائے

آج اک جام کچھ اس طرح پلا دے ساقی
پی بھی لوں اور مرا ایمان نہ جانے پائے

اُس کا پینا ہے کہ جو ڈٹ کے پیئے بھی نشتر
اور ایمان کا ایمان نہ جانے پائے

۲۳۴ ۹

دلمیں اب اُسکا نور رہتا ہے
عالمِ کوہِ طور رہتا ہے

اک غم ایسا ضرور رہتا ہے
جسکا ہر دم سرور رہتا ہے

غیر کی ہو خطا، کہ اُن کی ہو
سر ہمارے قصور رہتا ہے

جس کے دُنیا قریب ہتی ہے
وہ ہی دُنیا سے دُور رہتا ہے

جب بچھڑتے ہیں مل کے وہ ہمسے
رنج کچھ دن ضرور رہتا ہے

تیرے جلوؤں کی یاد میں ہر دم
سامنے کوہِ طور رہتا ہے

حُسن جب بے نیاز ہے اتنا
عشق کیوں ناصبور رہتا ہے؟

صبر سے بھی طمانیت دل کو
وہ بھی اب دُور دُور رہتا ہے

آپ ہوں یا خیال آپ کا ہو
کوئی دل میں ضرور رہتا ہے

چھیڑتی ہے اُسے تمنّا بھی
جو تمنّا سے دُور رہتا ہے

زندگانی میں یاد کے قابل　　اک زمانہ ضرور رہتا ہے
اُس کی بدقسمتی کو کیا کہیے　　جو ترے دل سے دُور رہتا ہے
کون مرنے پہ پوچھتا ہے کسے　　ذکر کچھ دن ضرور رہتا ہے
خاکساری ہے فطرتِ انساں　　اور محوِ غرور رہتا ہے
اے غمِ عشق، تیرا کیا کہنا　　قلب دار السُّرور رہتا ہے
وہ کہاں ہے نشاط میں نشتر
غم میں جو اک سرور رہتا ہے

۲۳۵　　۱۶

غیر خوش ہیں دُور کرکے اُنکی محفل سے مجھے　　میں تو جب جانوں نکلوا دے کوئی دل سے مجھے
پاس اِسکا بھی نہ اے صیّاد کچھ تُو نے کیا　　چاہتے تھے ہمصفیرانِ چمن دل سے مجھے
بھٹکا جاتا ہوں، پہونچکر منزلِ مقصود پر　　ہے اگر کوئی تو دے آواز منزل سے مجھے
شوق دریا کا دیا ہے تو ذرا ہمت بھی دے　　لوٹنا پڑتا ہے سو سو بار ساحل سے مجھے
آنے والا ہے نیا کوئی قریبی انقلاب　　مِل رہا ہے کچھ پتہ آثارِ محفل سے مجھے
چاہتا ہوں ہر اشارے پر، کہ جاں کردوں نثار　　وہ اشارے مل رہے ہیں چشمِ قاتل سے مجھے
مستحقِ سیرِ طوفاں اور مجھ سا کون ہے　　موج خود آآکے لیجاتی ہے ساحل سے مجھے
رشک ہے کیا آگیا مجھے، ہمت پہ پروانے کی آج　　کیوں نہ فطرت نے بنایا خاکِ محفل سے مجھے
عمر میں نے جب اسی محفل میں سب کردی تمام　　اب تم آئے ہو اُٹھانے اپنی محفل سے مجھے
ہر قدم پر چھیڑ دیتی ہیں مجھے مایوسیاں　　کر نہ دیں ظالم کہیں بیزار منزل سے مجھے

عاشقِ جانباز بھی دُنیا میں کوئی چیز ہے
تم اُٹھا کر خوش ہوگئے اپنی محفل سے مجھے

غرقِ دریائے محبت ہو گیا جب میں تو پھر
واسطہ کیا رہ گیا دریا و ساحل سے مجھے

سیرِ طوفاں سے ابھی سیری کہاں حاصل ہوئی
کیوں ندا لبیک کی آتی ہے ساحل سے مجھے

درد دینے والے مجھکو کچھ گلہ تجھ سے نہیں
جو شکایت ہے وہ ہے کوتاہئ دل سے مجھے

اضطرابِ دل یہ تونے معجزہ کیا کر دیا
جتنے اعضا ہیں نظر آنے لگے دل سے مجھے

عینِ دریا میں مزہ وہ تھا کہ میں لوٹا نہ پھر
لوگ دیتے ہی رہے آواز ساحل سے مجھے

اب سرِ منزل پہونچنے میں کہاں نشتر ہے دیر
لو صدا آنے لگی منزل کی، منزل سے مجھے

۲۳۶ ۱۷

جو کام کر یہاں وہ بہت دیکھ بھال کے
جو پاؤں رکھ یہاں، وہ نہایت سنبھال کے

یہ ابر، یہ بہار، یہ بادل شمال کے
ساقی خدا کے واسطے لا خُم نکال کے

ہم لُطف اُٹھا چکے ہیں تمہارے ملال کے
ارماں ہوں دشمنوں کو نشاطِ وصال کے

بحرِ جہاں میں خطرۂ طوفاں ہے ہر قدم
لیجا یہاں سے اپنا سفینہ سنبھال کے

کس طرح تجھ کو میری محبت کا ہو یقیں
کیونکر دکھاؤں اپنا کلیجہ نکال کے

انبار موتیوں کے ہیں، تارے نہیں ہیں یہ
قدرت نے رکھ دیئے ہیں خزانے نکال کے

کہتے ہیں جس کو گلشنِ ہستی، ہے خار زار
اے مائلِ خرام، ذرا دیکھ بھال کے

اچھا ہوا جو قیس سے حاصل ہوا نیاز
عرصے سے ہم خیال میں تھے ہمخیال کے

واعظ مزہ تو وعظ کا جب ہے کہ بزم میں
کچھ اِس خیال کے ہوں تو کچھ اُس خیال کے

منظور دیکھنا ہو اگر دل مرا، کبھی — اک روز دیکھیے مرے ارماں نکال کے
کیوں آشیاں بنانے کا آخر کریں خیال — ہوں سارا باغ چھوڑ کے کیوں ایک ڈال کے
ہر چند سن چکے ہیں بہت وارداتِ طور — تشنہ ہیں پھر بھی جلوہ برقِ جمال کے
سنتے ہیں پھر بہار گلستاں میں آگئی — باقی یہاں ہیں چاک ابھی پار سال کے
جو کام آپڑا اسے چھوڑا نہ، ناتمام — قایل نہ ہم کبھی ہوئے قیدِ محال کے
مدت سے ہم ہیں اور اسیری کی زندگی — کیا پھینکدیں یہ سب پر و بازو، نکال کے
وہ آج حشر میں بھی نہ دیدیں کہیں جواب — لائے ہیں رفتہ رفتہ یہاں تک تو ٹال کے
انسان کیا ہے اپنی تمناؤں کے سوا — دل کیا ہے دیکھیے، اگر ارماں نکال کے
آزردہ باغباں نہ ہو، جانے کو آئے ہیں — چل دینگے، تھوڑی دیر چمن دیکھ بھال کے
ارمانِ دید اگر نہیں نکلا یہاں تو کیا — محشر میں ہم رہیں گے یہ حسرت نکال کے
تیور بدل کے مجھ سے، وہ خاموش ہو گئے — کیا خوب دو جواب تھے میرے سوال کے

تکمیلِ عشق کر کے یہ مانے گا ایک دن
۲۳۷ نشتر ہمارے دل میں ہیں تیور ہلال کے ۲۱

دینے پہ غم جو آئے تو چھلکا دیا مجھے — اک قطرہ چاہیے تھا تو دریا دیا مجھے
دل لیکے میرا، عشق میں دھوکا دیا مجھے — افسوس تم نے کیا لیا اور کیا دیا مجھے
توبہ بھی تھا اگر کوئی قانونِ لازمی — کیوں تم نے ذوقِ ساغر و صہبا دیا مجھے؟
تنہا خوشی تو مجھکو نہ دی سب کو بانٹ دی — دنیا تھا غم جو سب کو وہ تنہا دیا مجھے

یہ درد یہ قلق مری قسمت میں تھے اگر — پتھر کا تو نے کیوں نہ کلیجا دیا مجھے؟
تھی یاد اگر نہ تیری شبِ غم تو کون تھا — کس نے تمام رات دلاسا دیا مجھے؟
ہر رات انتظار میں اختر شماریاں — یہ مشغلہ بھی آپ نے اچھا دیا مجھے!
تھی مجھ کو تیرے غم کے سوا کون شی عزیز — پھر کیا سمجھ کے یہ غمِ دُنیا دیا مجھے
تھا انتظارِ حشر، قیامت کا انتظار — تنہائیوں نے اور بھی گھبرا دیا مجھے
اسوقت دیکھنا کوئی رحمت کا اُسکی جوش — جب آنسوؤں نے حشر میں نہلا دیا مجھے
میں تھا کہ جا کے منزلِ مقصد پہ دم لیا — کیا کیا نہ گمرہی نے بھٹلا دیا مجھے
اب ضبطِ غم کی کیوں ہے یہ تاکید بار بار — کیوں پہلے ظرفِ ہمتِ دریا دیا مجھے
ساون کی بجلیاں بھی ستم تھیں بہار میں — تڑپیں جو تیرے ہجر میں تڑپا دیا مجھے
رنج و خوشی میں ایک سا آتا ہے مجھے مزہ — کیوں امتیازِ گلشن و صحرا دیا مجھے
جب ہر نفس پہ اسکو کچلنا تھا یاس سے — تم نے فضول ذوقِ تمنّا دیا مجھے
ستّر ہزار پردوں میں چھپنا تھا گر تجھے — کیوں تو نے دلمیں شوقِ تمنّا دیا مجھے
کیونکر ہو شکر یہ ترا اے خالقِ جہاں — دل واقفِ حقیقتِ دُنیا دیا مجھے

نشترؔ مجھے کسی سے شکایت نہیں کوئی
۲۳۸ در اصل میرے دل ہی نے دھوکا دیا مجھے ۱۷

یہ مآلِ بہار ہوتا ہے — پھول مرجھا کے خار ہوتا ہے
مانتا ہے رُلا کے دُنیا کو — دل سے جو اشکبار ہوتا ہے

وہ ہی لمحہ ہے بیقراری کا — دل کو جب کچھ قرار ہوتا ہے
صبر کر صبر اے دلِ مضطر — یوں کوئی بیقرار ہوتا ہے!
موت بھی پوچھتی نہیں اُسکو — جس کو جینے سے عار ہوتا ہے
اب کئے جائیں ورد وعدے آپ — اعتبار ایک بار ہوتا ہے
اور ہوتا ہے زندگی میں کیا — موت کا انتظار ہوتا ہے
کاش اُنکی سمجھ میں آجائے — کوئی چیز اعتبار ہوتا ہے
عشق کا خون حُسن کے ہاتھوں — روز پروردگار ہوتا ہے
لاکھ مشتِ غبار ہو انسان — عکسِ پروردگار ہوتا ہے
عشقِ انساں بھی اک طرح دراصل — عشقِ پروردگار ہوتا ہے
کیوں خمِ شتی میں نہ رنج کی ہو نمود — پھول کے ساتھ خار ہوتا ہے
نشتر انسان زندگی کھو کر — دوست سے ہمکنار ہوتا ہے

۲۳۹ ۱۳

داغ سینے میں جو رہتے تھے ہمارے، کیا ہوئے — جن سے راتیں تھیں منور وہ ستارے کیا ہوئے
غم سے ناواقف تھے ہم، نا آشنائے رنج تھے — زندگانی کے وہ دن یارب ہمارے کیا ہوئے
تو نے تو چوری نہیں کی اُنکی، اے جیبِ سحر — تھے ابھی بکھرے ہوئے لاکھوں ستارے کیا ہوئے
جب ہمیں صورت دکھانے سے بھی تم کو عار ہے — تم ہمارے کیا ہوئے پھر، ہم تمھارے کیا ہوئے
جن سے تھیں راتیں جوانی کی منور ہمنشیں — وہ محبت کے ہمارے چاند تارے کیا ہوئے

کیا ہوئے اے ضبطِ غم نالے گئے آہیں مری / آہ، وہ ایامِ فرقت کے سہارے کیا ہوئے
مرگ اگر ہے ابتدائے زندگی مستقل / اور دریا میں چلے آئے، کنارے کیا ہوئے
دل چلا انکی طرف اور ہم بیاباں کیطرف / آنکھوں آنکھوں میں خدا جانے اشارے کیا ہوئے
قلب کا احساس ہوتا ہے، نہ احساسِ جگر / آج یہ دونوں غریب آفت کے مارے کیا ہوئے
دیکھئے جس کو وہ دیتا ہے سر آنکھوں پر جگہ / ہو گئی دنیا ہماری، تم ہمارے کیا ہوئے
ابتدائے عشق میں بجز محبت کچھ نہ تھا / اب کوئی دیکھے ذرا دونوں کنارے کیا ہوئے
تم تو کہتے ہو، نہیں بدلی محبت کی نگاہ / ہیں وہی نظریں تو پھر انکے اشارے کیا ہوئے
ہم تو جو سیرِ دریا عین دریا میں رہے / کیا خبر ہم کو جو تھے دریا کنارے کیا ہوئے
اے فلک کیا رات ہی بھر کے لئے تھا یہ طلسم / چاند تیرا کیا ہوا، تیرے ستارے کیا ہوئے؟
پانوں رکھتے ہی محبت میں نہ تھا میرا پتہ / قعرِ دریا ہو گئے ظالم، کنارے کیا ہوئے
ہم سے دریا کی حقیقت پوچھ، ہم دریا میں تھے / کیا خبر ہے سانحے دریا کنارے کیا ہوئے

آسماں پر گر وہی تارے نہیں نشتر تو پھر
قلبِ سوزاں سے جو نکلے تھے شرارے، کیا ہوئے

۲۴۰ ۱۷

محبت میں جو دیکھا دونوں پابندِ ستم نکلے / نہ ہم کچھ ان سے کم نکلے، نہ وہ کچھ ہم سے کم نکلے
لیا جب جائزہ دل کا مسلسل رنج و غم نکلے / کیدن دو زیادہ تھے، کسی دن چار کم نکلے
جدا دونوں کو سمجھے تھے، مگر دونوں بہم نکلے / الگ ہم سے نہ وہ نکلے، الگ ان سے نہ ہم نکلے
ہماری لذتِ بادہ کشی کو، کوئی کیا جانے / گئے جب شام کو ہم، میکدے میں صبحدم نکلے

ہمارے پاؤں کا نکلا نہ کوئی اُن کی محفل میں / ہمیں سب سے زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے
بوقتِ دادخواہی حشر میں عقدہ کھلا آخر / ستمگر جو بظاہر تھے، وہ مجروحِ ستم نکلے
ہوا اچھا جو اُن کے سامنے دامن نہ پھیلایا / جنھیں اہلِ کرم سمجھے تھے، محتاجِ کرم نکلے
اُسی دن دل میں اک حسنِ تمنا ہو گیا پیدا / ہماری آنکھ سے جس روز آنسو چار کم نکلے
اُمیدِ کامیابی کیا محبت میں ہمیں ہوتی / جنھیں اہلِ وفا سمجھا کئے، اہلِ ستم نکلے
نہ جانے کس قدر مجھکو یہ غم میں مبتلا کرتے / بہت اچھا ہوا ارمانِ دل میرے جو کم نکلے
ہزاروں آرزوئیں لیکر آئے تیری محفل میں / ہزاروں حسرتیں لیکر تری محفل سے ہم نکلے
نشاطِ دائمی میں اُن کو حصّہ مل گیا آخر / بڑے تقدیر والے عاشقی میں اہلِ غم نکلے
بسر ہوتی رہی جنکی ہمیشہ عیش و عشرت میں / وہی اہلِ کارزارِ دہر سے باچشمِ نم نکلے
ہزاروں طرح کے دنیا نے فتنے کر دیے پیدا / جہاں منزل کی دُھن میں شوق سے ہم دو قدم نکلے
نہ جانے کتنے ہمت ہارتے رہتے ہیں روزانہ / ہمیں تھے جو محبت میں تری ثابت قدم نکلے
عجب منزل ہے تیری، ہو گئے گمراہِ منزل ہم / مزہ یہ ہے نہیں باہر ابھی گھر سے قدم نکلے
سمجھتے تھے کہ تجھ کو پاس ہو گا اپنے وعدوں کا / مگر میخوار کی توبہ، ترے قول و قسم نکلے
جنھوں نے عیش و عشرت کی جگہ سمجھا تھا دُنیا کو / وہ جب دُنیا سے نکلے، شکوہ سنجِ صد الم نکلے
جہاں اب تک رہے ہیں اشک آنکھوں میں وہیں ٹھہریں / کہیں ایسا نہ ہو میری محبت کا بھرم نکلے

نہ ہوتا حسن اگر تو کون سلجھاتا انھیں نشتر
نہ جانے قسمتِ عاشق میں کتنے پیچ و خم نکلے

ممکن ہو تو بدلو یہ محبّت کے قرینے
ہوتا ہے بہت رنج تو پھٹ جاتے ہیں سینے

عشّاق کو یہ مرنے ہی دیتے ہیں نہ جینے
دیکھے کوئی ان پردہ نشینوں کے قرینے

طوفانِ محبت سے نکل لے دلِ مضطر
غارت ہوئے، اس بحر میں آئے جو سفینے

قدرت کی تری حد نہیں، اے قادرِ مطلق
پوشیدہ ہیں ذرّوں میں ستاروں کے خزینے

اک لمحے کو دیکھی تھی تمہاری نگہِ شرم
ابتک چلے آتے ہیں پسینے پہ پسینے

جب تم سے رہ و رسم ہو جب تم سے ملاقات
ہیں سال وہ ہی سال، مہینے وہ مہینے

وہ دل نہیں جس دل میں نہ نیکی نہ وفا ہو
دل ایک انگوٹھی ہے تو یہ اس کے نگینے

کیا کیا دلِ ویراں میں ہے، دیکھے کوئی اگر
ملجاتے ہیں ایسے ہی خرابوں میں خزینے

دو روز کی فرقت بھی قیامت سی نہیں کم
کیا ہو نہ ملو مجھ سے جو دو چار مہینے

بیتابیٔ نظارہ اگر اس کی یہ ہی ہے
۲۴۲ نشتر نگہِ شوق نہ دیگی ہمیں جینے ۱۰

ہوس اس کی اسکو لئے پھر رہی ہے
کمی ورنہ انساں کو کس بات کی ہے

جو کچھ ہے یہاں شیخ، وہ میکشی ہے
تری زندگی بھی کوئی زندگی ہے!

مرے دل میں دیکھو ہجوم آرزو کا
خدا کی قسم ایک دُنیا بسی ہے

نہ ساغر، نہ بادہ، پئے جا رہا ہوں
مری میکشی بھی عجب میکشی ہے

نہیں دل میں کوئی خوشی اس کا غم کیا
ترا غم ہی دل میں یہ کیا کم خوشی ہے

وہ اے دل نہ آئیں گے کیا حسبِ وعدہ؟
طبیعت میں اُلجھن سی کیوں ہو رہی ہے؟

ستم تم کو اچھے، تو ہم کو بھی اچھے
تمہاری خوشی میں ہماری خوشی ہے

نہ ہم کو ستا اس قدر باغباں تو
نہیں اک یہی باغ، دُنیا پڑی ہے

کہے کون کس سے، سُنے کون کس کی
ہر اک کو یہاں اپنی اپنی پڑی ہے

ترے ہجر میں بے قراری ہمیشہ
کبھی کم، کبھی کچھ زیادہ رہی ہے

ہمیں کیا سروکار دیر و حرم سے
جہاں لو لگی ہے، وہاں لو لگی ہے

لگایا ہے دل اب تو گھبرا نہ نشتر
یہ دل کا لگانا کوئی دل لگی ہے!

۲۴۳ ۱۱

غم ترا میرے لئے باعثِ راحت ہو جائے
درد بھی دل میں جو آئے وہ طبیعت ہو جائے

خوگرِ رنج جو عاشق کی طبیعت ہو جائے
وصل کی رات سے بہتر شبِ فرقت ہو جائے

لطف آجائے جو وا چشمِ حقیقت ہو جائے
میری صورت بھی کبھی آپکی صورت ہو جائے

سب کی خواہش کہ حجاب آپکا رخصت ہو جائے
مجھکو یہ ڈر کہ اُسی دن نہ قیامت ہو جائے

غمِ جاناں سے نہ رکھ دل کبھی خالی غافل
فکرِ دُنیا کا گذر ہو تو قیامت ہو جائے

خوگرِ غم کا ترے، حال محبت میں یہ ہے
آئے دو دن نہ مصیبت تو مصیبت ہو جائے

اُس محبت کی مری قدر نہیں ہے اُن کو
جس کے سائے سے محبت کو محبت ہو جائے

منحصر ہیں اُسی اک روز پہ سارے انصاف
اگر آئے نہ قیامت تو قیامت ہو جائے

سب کو یہ خوفِ قیامت ہے کہ آئے نہ کبھی
مجھ کو یہ فکر کہ روز ایک قیامت ہو جائے

قصۂ طور کی آواز ابھی کان میں ہے
کیوں نہ چاہوں کہ حجاب آپکا رخصت ہو جائے

باقی رہ جاتی ہے ہر روز تڑپنے کی ہوس
اور کچھ طول نصیبِ شبِ فرقت ہو جائے

رات وہ حال تھا بیمارِ محبت کا خراب
دو گھڑی بعد وہ آئیں تو قیامت ہو جائے

ہو کے خواباں غمِ فرقت کا بھی یہ ڈر ہے مجھے
کہیں آ بھی نہ ترے وصل کی حسرت ہو جائے

صبر بھی ساتھ لے لے رہروِ منزل اپنے
جانے کس چیز کی کس وقت ضرورت ہو جائے

بادہ پیمائی کی ٹھانی ہے چمن میں ہم نے
ابر آ جائے تو در پردہ اجازت ہو جائے

موسمِ گل میں بہت ضبط سے لیتا ہوں میں کام
کہیں ایسا نہ ہو رسوائیِ وحشت ہو جائے

واقفِ طولِ قیامت ہوں بخوبی نشتر
اور بڑھ جائے تو میری شبِ فرقت ہو جائے

۲۴۴ ۱۷

غم اگر اس نے دیے، غم کا مداوا بھی تو ہے
قعرِ دریا ہے جہاں ساحلِ دریا بھی تو ہے

غمِ جاناں ہی نہیں ہے، غمِ دنیا بھی تو ہے
باغ ہی باغ نہیں سینے میں صحرا بھی تو ہے

پھر وہی ہوش کے لالے ہوں، وہی منظرِ طور
سامنے وہ نہیں آتے ہیں، یہ اچھا بھی تو ہے

روزِ محشر سے ہراساں ہوں ہمارے دشمن
کچھ سہی، اُنکی عنایت کا بھروسا بھی تو ہے

میں نے مانا کہ مرے دل میں ہے مسکن اُسکا
جو اُٹھا ہی نہیں اُٹھتا ہے، وہ پردا بھی تو ہے

پھر جفاؤں کی کہاں پائیگا لذت اے دل
وہ وفائیں نہیں کرتے ہیں یہ اچھا بھی تو ہے

آنے دے یاس کو کیا کرتی ہے آ کر اے دل
دشمنِ یاس ترے پاس تمنا بھی تو ہے

نہ سنی اُس نے یہاں میری تو غم کیوں ہو مجھے
جورِ امروز کے انصاف کو فردا بھی تو ہے

ہے ارادہ تو پہنچ جاؤنگا منزل پہ کبھی
چیز آخر کوئی دنیا میں ارادا بھی تو ہے

دل میں خوشیاں ہی تو آباد نہیں ہیں غافل
ایک گوشہ ترے اس باغ کا صحرا بھی تو ہے

کیا کہوں مست نگاہوں کو تری اے ساقی
انہیں صہبا ہی نہیں، نشۂ صہبا بھی تو ہے

تیری آنکھوں کے لئے ہی نہیں مستی ساقی
دیکھ انصاف سے حق اسمیں ہمارا بھی تو ہے

اُسنے خوشیاں جمع بنائیں، تو بنائے غم بھی
باغ ہے اُسکا بنایا ہوا صحرا بھی تو ہے

تجھے کھٹکا جو چمن میں ہے، تو کر ترکِ چمن
آخر اک چیز بیاباں دامنِ صحرا بھی تو ہے

آج کے عیش کو انسان کرے کیا نشتر
عیشِ امروز میں اندیشۂ فردا بھی تو ہے

۲۴۵ ۱۵

دو دن لگا اور اُن کو سروکار نہیں ہے
سُن لوگے کسی وقت کہ بیمار نہیں ہے

اے شانِ کرم، تیرے اس انداز کے صدقے
دم بھر میں گنہگار، گنہگار نہیں ہے

کیوں نہ پر زمیں جائیں نہ انسان بالآخر
سُنتے ہیں وہاں چرخِ ستمگار نہیں ہے

مستی تری آنکھوں سے برستی ہے شب و روز
وہ کون ہے دُنیا میں جو میخوار نہیں ہے

افسانۂ ایمن سے ہے سہمی ہوئی دُنیا
اب کوئی ترا طالبِ دیدار نہیں ہے

عالم جو تری مست نگاہوں کا یہی ہے
ہو جائیگا میخوار، جو میخوار نہیں ہے

کیوں آپنے دی دعوتِ دیدار کسی کو
جب جانتے تھے طاقتِ دیدار نہیں ہے

واعظ کو مرے سامنے محشر میں ہوا حکم
لیجاؤ اسے یہ مرا میخوار نہیں ہے

پھر میرے تڑپنے میں کمی ہو گئی شاید
مائل بہ ستم پھر وہ دل آزار نہیں ہے

ہر شخص نہیں قابلِ کیفیتِ جلوہ
ہر شخص کا دل جلوہ گہِ یار نہیں ہے

توبہ کا خیال اب تو مجھے صرف ہے اتنا
اصرار کرے کوئی تو انکار نہیں ہے

کچھ تیرے حجابات کی پروا نہیں مجھکو
پردا ترا اب مانعِ دیدار نہیں ہے

بیدار ہوا انساں تو کیا خاک ہو بیدار
تقدیر ہی انساں کی بیدار نہیں ہے

جب سے مجھے خوشیوں کی حقیقت ہوئی معلوم
غم مجھ کو محبت میں گرانبار نہیں ہے

ہے حسن سے اصرارِ وفا عشق کو اب تک
اور لطف یہ ہے حسن وفادار نہیں ہے

ہوتا نہ وفادار تو کرتا نہ کوئی عشق
کہنے کو فقط حسن وفادار نہیں ہے

جو زیست پہ ترجیح نہ دے موت کو نشتر
وہ عشق و محبت کا سزاوار نہیں ہے

۲۴۶ ۱۷

ملتفت پھر نگہِ یار ہوئی جاتی ہے
اب دوا اے دلِ بیمار ہوئی جاتی ہے

دل کے پار ابر کی بوچھار ہوئی جاتی ہے
یہ بھی تیرِ نگہِ یار ہوئی جاتی ہے

لذتِ غم میں ہو کچھ اور اضافہ ظالم
زندگی ہجر سے بیزار ہوئی جاتی ہے

شوقِ منزل نے کہاں چھوڑ دیا ساتھ مرا
سعیِ منزل مری بیکار ہوئی جاتی ہے

آمد اس غیرتِ گل کی جو سنی ہے میں نے
ہے طبیعت کہ سمن زار ہوئی جاتی ہے

ناز پر ان کی حیا اور ستم ڈھاتی ہے
اور دیوار پہ دیوار ہوئی جاتی ہے

لوگ تو عشق کو کہتے ہیں یہی حاصلِ زیست
زندگی کیوں مجھے دشوار ہوئی جاتی ہے

مرنے والے ہے تجھے خوابِ مسلسل کی نوید
آج قسمت تری بیدار ہوئی جاتی ہے

سوزِ فرقت نے مگر رنگ جمایا اپنا
آہ کیوں ورنہ شرربار ہوئی جاتی ہے

آج اظہارِ تمنّا کا جو موقع بھی ملا
سلب سب قوتِ اظہار ہوئی جاتی ہے

فطرتِ انساں کی خوشیوں نے بگاڑی ایسی
زندگی غم سے گرانبار ہوئی جاتی ہے

کوئی فتنوں کا، تری چال میں عالم دیکھے
اک قیامت تری رفتار ہوئی جاتی ہے

اب جفاؤں سے بہت کم ہیں وفائیں اُنکی
کچھ نہ کچھ تو نہیں یہی رفتار ہوئی جاتی ہے

آج مستی کا یہ عالم ہے کہ اللہ اللہ
جامِ بادہ نگہِ یار ہوئی جاتی ہے

دیکھئے جسکو خوشی پر ہے دل و جاں سے فدا
میری خاطر پہ مگر، بار ہوئی جاتی ہے

نزع میں ساتھ کہاں چھوڑ رہا ہے اے ضبط
محنت اک عمر کی بیکار ہوئی جاتی ہے

بزمِ عالم کے نظاروں کا نتیجہ معلوم
صرف سب طاقتِ دیدار ہوئی جاتی ہے

فکرِ پرہیز گنہ میں ہے زمانہ مشغول
مُفت میں خلق گنہگار ہوئی جاتی ہے

آرزوؤں کی نہیں دل میں کہیں گنجایش
رو گئے رو گئے بھرمار ہوئی جاتی ہے

مرنیوالے، ہے اسی میں تو حیاتِ ابدی
موت کیوں تجھکو گرانبار ہوئی جاتی ہے

جسقدر اپنی محبّت کو چھُپاتا ہوں میں
اُتنی ہی اور نمودار ہوئی جاتی ہے

ہوئی جاتی ہے مجھے دیر و حرم سے فرصت
آنکھ خود جلوہ گہِ یار ہوئی جاتی ہے

آرزوؤں سے کہو ایک کنارے ہو جائیں
کیوں کھڑی سامنے دیوار ہوئی جاتی ہے

پاس منزل کے پہونچکر یہ بھٹکنا میرا
جیت کر آج مری ہار ہوئی جاتی ہے

ناامیدی سے بچا میرے حریمِ دل کو
ورنہ تعمیر یہ مسمار ہوئی جاتی ہے

دل گنہگار تو تھا ہی، سرِ محشر نشتر

۲۶ آنکھ بھی آج گنہگار ہوئی جاتی ہے ۲۴۷

مرے دل میں لاکھ ہیں رنج و غم مرے دل میں درد ہزار ہے
غمِ عشق تیری بدولت آج خزاں میں لطف بہار ہے
جو بلا کی آج گھٹا میں ہے، تو غضب کی آج پھوار ہے
یہی وقت بادہ کشی کا ہے، یہی جشنِ بادہ گسار ہے
مجھے کیا غرض کہ تلاش میں، درِ یار کے پھروں دربدر
جدھر آنکھ اٹھا کے میں دیکھتا ہوں، مرے لئے درِ یار ہے
جو خوشی کو سمجھے نہ تو خوشی، تو خوشی ہو تجھ کو ملال بھی
جو بہار ہی پہ نہ ہو نظر، تو خزاں میں رنگِ بہار ہے
کہو اس چمن سے لگا کے جی، کوئی خاک پائیگا زندگی
جہاں چار دن میں خزاں کا دور ہے، چار دن میں بہار ہے
وہ ہزار ہم پہ ستم کرے، وہ ہزار ہم پہ جفا کرے
کبھی ہم کریں گے نہ کچھ گلہ، کہ خیالِ خاطرِ یار ہے
ہمیں اپنی قید سے کام ہے، جہاں زندگی کو دوام ہے
ہمیں کیا جو باغ میں ہے خزاں، ہمیں کیا جو فصلِ بہار ہو
کرے رہ کے باغ میں کیا کوئی، کبھی رنج ہے تو کبھی خوشی
کبھی جشنِ فصلِ بہار ہے، کبھی داغِ فصلِ بہار ہے

یہ بہار مست، گھٹائیں مست، فضائیں مست، ہوائیں مست
جسے دیکھو آج ہے بادہ کش، جسے دیکھو بادہ گسار ہے
ترا رات دن کا ہو سامنا، تو نہ جانے حشر ہو کیا مرا
ترے اک اشارۂ چشم سے، نہ سکون ہے نہ قرار ہے
نہیں فرق شاہ و گدا میں کچھ، جو نگاہِ غور سے دیکھئے
وہ ہی اِس کی راہگذار ہے، وہ ہی اُسکی راہگذار ہے
مجھے ساری عمر گذر گئی، یہ خبر نہیں کہ سکوں ہے کیا؟
کوئی اضطراب سے مضطرب، مجھے اضطراب قرار ہے
نہ خوشی سے کچھ انھیں واسطہ، نہ کسیکے رنج سے کچھ غرض
نہ خزاں کی فصل کسی کی ہے، نہ کسی کی فصلِ بہار ہے
مجھے امتیازِ نشاط و غم، مری بیخودی نے بھلا دیا
جو خزاں ہے سارے زمانے کی، وہ ہی مجھکو فصلِ بہار ہے
تمہیں اپنی شوخیوں کی قسم، کرو مجھ پہ تازہ کوئی ستم
مرا اضطرابِ دل و جگر، کئی دن سے محوِ قرار ہے
کٹے کیونکر آہ یہ شامِ غم، کٹے کس طرح یہ شبِ الم
نہ ٹھہر سکا ہے مری نیند ہی، نہ شکیب ہی نہ قرار ہے
مرے دلمیں کیا ہے یہ جلوہ گر، ہو کسی کو علم تو دے خبر

یہ فروغِ جلوۂ یار ہے، کہ فریبِ جلوۂ یار ہے
مرے دل کو یوں نہ ستاؤ تم، مرے دل کو یوں نہ جلاؤ تم
کہ اسی سے کام تمام عمر، تمھیں بھی آخرِ کار ہے
جسے تم نے ایک نگاہ سے، سرِ بزم کر دیا مضطرب
یہ وہی تو نشتر زار ہے، یہ وہی تو سینہ فگار ہے

۲۴۸ 19

کاش ہم پھر آشیانِ زنداں سے چھوٹ کر دیکھتے
پھر چمن میں چاندنی راتوں کا منظر دیکھتے
قدر کرنی تھی محبت کی ہماری آپ کو
تنگ محبت میں اگر تھا امتحاں کر دیکھتے
کن عناصر سے ہوئی ہے اِس کی ترتیبِ وجود
آسماں اک دن اگر آتا زمیں پر، دیکھتے
ماہ و اختر ہی سے پوچھو، وہ بتائیں گے تمھیں
کتنی راتیں ختم کی ہیں، ماہ و اختر دیکھتے
آرزو ہی رہ گئی ایسے پھنسے دنیا میں ہم
ایک دن دنیا کو دنیا سے نکل کر دیکھتے
طور پر اک بار کے کھائے ہوئے ہیں ہم فریب
اب اگر موقع کبھی ملتا تو بچ کر دیکھتے
کیا کریں کمبخت آنکھوں کو مروّت آگئی
ورنہ شکوئے روزِ محشر، اہلِ محشر دیکھتے
کیا بتائیں حشر کے دن کس مزے کا تھا سماں
پھر رہے تھے ہر طرف ایوانِ محشر دیکھتے
کس مزے سے ہم بڑھے جاتے ہیں راہِ عشق میں
ایک منظر کو بھلاتے، ایک منظر دیکھتے
جی میں ہے کچھ روز کرتے آرزوئے ہجرِ یار
اِس تمنا کو بھی کچھ دن دل میں رکھ کر دیکھتے
سنتے ہیں فصلِ بہار اب کے بہت زوروں پہ ہے
ہم بھی ہوتے آج اگر زنداں کے باہر دیکھتے
دل کے اندر دیکھتے ہیں کب سے ارمانِ وصال
وہ بھی فن ہوتا کہ اس کو دل سے باہر دیکھتے

ناروا ہے عشق میں لینا کسی سے انتقام
ورنہ تجھ کو ایک دن چرخِ ستمگر دیکھتے

اضطرابِ دل کا عالم کیا سمجھ سکتے تھے وہ
خود نہ جبتک آ کے نبضِ قلبِ مضطر دیکھتے

آہ کرتے کرتے اکثر رک گیا ہوں ہجر میں
ورنہ ابتک آسماں کو تم زمیں پر دیکھتے

کون دونوں میں زیادہ واقعی بیچین ہے
برق اگر ملتی تو دل کے پاس رکھکر دیکھتے

کیا دلاتا ہے ہمیں تو روز امیدِ وفا
عمر گذری ہے یوں ہی تجھ کو ستمگر دیکھتے

کیا کہیں فرصت نہیں ہے ہمکو نشتر ورنہ ہم
اس زمینِ شعر کو بھی آسماں کر دیکھتے

۲۴۹ ۱۸

پیشتر کچھ ہوش تھا سنتے ہیں اب بیہوش ہے
اب ترا بیمار ہے، اور موت کی آغوش ہے

کچھ خبر تجھ کو بھی اے برقِ تغافل کوش ہے؟
طالبِ دیدار تیرا طور پر بے ہوش ہے

ہوش ہوتا ہے جنھیں بیہوش رہتے ہیں وہی
کون کہتا ہے کہ بیہوشی کا دشمن ہوش ہے

ہم کو میخانے میں جا کر بیٹھنے کا ہے خیال
سامنے ساقی کی نظریں تھیں بس اتنا ہوش ہے

جو سمجھتے ہیں مجھے بیہوش، خود بیہوش ہیں
میری بیہوشی میں پنہاں اک جہانِ ہوش ہے

کر دے اے جوشِ جنوں للہ آزادِ خرد
عشق کیا جب آدمی پابندِ عقل و ہوش ہے

اب ترے بیمار کا تجھ کو بتائیں حال کیا
دو گھڑی میں بیخبر ہے، دو گھڑی میں ہوش ہے

کر رہا ہے تو کسے تلقینِ ترکِ میکشی
میں ہوں میخوارِ ازل، واعظ تجھے کچھ ہوش ہے؟

دیکھ لو خود آنکھ سے دیوانگانِ عشق کو
بے ہوشی کہتے ہیں جس کو انتہائی ہوش ہے

زندگانی عشق میں ہے ابتدائے جوشِ عشق
موت کہتے ہیں جسے، وہ انتہائے جوش ہے

لیکے اسکو کرے مجھے آزادِ فکرِ دو جہاں
اور میرے پاس ساقی کیا سوائے ہوش ہے

دلکو لایا ہوں ترے پاس اِن نگاہِ مستِ دوست
بیخبر کر دے کہ مدت سے خرابِ ہوش ہے

ہجر کی شب سامنے ہے، کسطرح کاٹوں اسے
صبر بھی غائب ہے ظالم ضبط بھی روپوش ہے

چھوڑ کر بیمار کو ایسے میں کیا جاتے ہیں آپ
سامنے جبتک تو ہے، جبتک اسکو ہوش ہے

دعوتِ دیدار دے رکھی ہے برقِ حسن نے
امتحانِ چشم ہے آج امتحانِ ہوش ہے

مستیاں اپنی نگاہِ مست کی روکے ہوئے
اب ذرا آگے بڑھیں تو پھر سوالِ ہوش ہے

واردِ وادیٔ ایمن پہ حیرت کیوں کروں
سامنے جلووں کے تیرے کیا بساطِ ہوش ہے

میرے دل پر بھی کبھی ساقی عنایت کی نظر
تیرے میخانے کا آخر یہ بھی اک مینوش ہے

عارضی خوشیوں پہ دیوانہ نہ ہو اے بوالہوس
قبر کو بھی دیکھ جو کھولے ہوئے آغوش ہے

کیوں مری بیہوشیوں پر طعنہ زن ہیں اہلِ بزم
کیا مری بیہوشیوں میں تھا انھیں کچھ ہوش ہے؟

۲۵۰ طور پر کچھ دیر کو میں ہو گیا تھا محوِ دید
مجھکو بیہوشی نہ تھی نشتر جہانتک ہوش ہے ۲۱

ترکِ دنیا سے اثر روح پہ کیا ہوتا ہے
پوچھئے اُس سے جو دنیا سے جُدا ہوتا ہے

دہر میں ملتی نہیں فرصتِ آرام و قیام
ہر نفس راہروِ راہِ فنا ہوتا ہے

جس کو آتا نہیں مرنے کی طرح مر جانا
آخرِ کار وہ محتاجِ قضا ہوتا ہے

چارہ گر چارۂ دردِ دلِ ناشاد نہ کر
چھیڑ دینے سے یہ کچھ اور سوا ہوتا ہے

مارنے والا کوئی اور ہی ہے در پردہ
کہنے سننے کو فقط نامِ قضا ہوتا ہے

اب وفائیں وہی مرغوب مجھے ہوتی ہیں — جن وفاؤں میں کچھ اندازِ جفا ہوتا ہے
دل کی تعریف کروں میں کہ جگر کی تعریف — ایک سے ایک محبت میں سوا ہوتا ہے
دل کی تسخیر میں کچھ خاص ہے حصہ اسکا — وہ جو اک حُسن میں اندازِ جفا ہوتا ہے
کوئی آسودہ جفاؤں سے تری ہو کیوں کر — ہر جفا میں تری اندازِ نیا ہوتا ہے
بیکسوں کو نہ سمجھ انکا نہیں ہے کوئی — جس کا کوئی نہیں ہوتا ہے خدا ہوتا ہے
مرنے والے کے لئے نوحہ و ماتم کیسا — یہ تو وعدہ ازلی ہے جو وفا ہوتا ہے
کس توقع پہ کرے دید کی حسرت کوئی — تیرا نظارہ بھی تو ہوش رُبا ہوتا ہے
"خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر" — فی الحقیقت انہیں بندوں میں خدا ہوتا ہے
بادہ نوشی کہیں چھوٹی ہے جنابِ واعظ — آپ اپنی سی کئے جائیے کیا ہوتا ہے
مرگ ہے چیز نہ کوئی نہ کوئی چیز حیات — قید ہوتا ہے کوئی، کوئی رہا ہوتا ہے
جو فنا ہوتی ہیں، ہوتی ہوں وہ چیزیں کچھ اور — کون کہتا ہے کہ انسان فنا ہوتا ہے

مجھ کو اندیشۂ عصیاں ہو تو کیوں ہو نشتر
۲۵۱ ہر جگہ ساتھ مرے خوفِ خدا ہوتا ہے ۱۷

تیرے ملنے کا ہمیں ارمان ہے — زندگی میں ہے تو اتنی جان ہے
جس کو دیکھو دنگ ہے حیران ہے — ہر جگہ تیری نئی اک شان ہے
خاکساری کو نہ چھوڑ اے بیخبر — آدمی کی اک یہی پہچان ہے
ختم جس دن زندگانی ہو گئی — آدمی ہے اور گورستان ہے

موت، جس کے نام سے ڈرتے ہیں سب
فی الحقیقت زندگی کی جان ہے

کر چکے لاکھوں ستم وہ عشق پر
پھر بھی اُن کو ظلم کا ارمان ہے

عاشقی میں دیکھ تو چاہے جہاں
ایک ہی دل ایک ہی ارمان ہے

چار دن کی ہے یہ فانی زندگی
چار دن کا آدمی مہمان ہے

ہم وہاں ہیں حضرتِ واعظ جہاں
کفر بھی اک طرح کا ایمان ہے

پاس سے ہٹتا ہے کیوں اے چارہ گر
درد بڑھنے کا ابھی امکان ہے

بول بالا ہے ستم کا تیرے آج
کل ہو یہیں اور حشر کا میدان ہے

شاکیٔ جور و جفا ناحق ہے تو
یہ بھی اے دل حسن کی اک شان ہے

تھا ترے نشتر کا استحقاق کیا
جو دیا تو نے ترا احسان ہے

۲۵۲ ۱۳

لطفِ آغازِ محبت نہیں انجام میں ہے
یعنی جو کچھ ہے مری کوششِ ناکام میں ہے

وعدۂ وصل کسی کا سحر و شام میں ہے
ابھی تقدیر مری گردشِ ایام میں ہے

بیقراری دلِ ناکام کی دیکھے کوئی
برقِ پنہاں کوئی شاید دلِ ناکام میں ہے

لوگ تکلیف اٹھاتے ہیں تو پائیں آرام
مجھکو تکلیف ہی اسلئے دلِ آرام میں ہے

یورشیں ہیں مری اُمید پہ مایوسی کی
صبحِ امید مری کشمکشِ شام میں ہے

شام کو آنیکا وعدہ جو کیا ہے اُسنے
مجھ سے پوچھو جو مزہ آج مری شام میں ہے

مجھ سے بڑھ بڑھ کے بہت بات نہ کر اے واعظ
وہ ترے خم میں نہ ہوگی جو مرے جام میں ہے

۲۵۳ ۸

چشمِ ساقی کی عنایت جو ہے مجھ پر نشتر
سینکڑوں طرح کی ہر وقت مئے جام میں ہے

شکستہ پر نہ ہم سے چھین اے صیاد رہنے دے
ہمارے پاس بھی تو کچھ قفس کی یاد رہنے دے

خدا کا واسطہ تجھ کو، دلِ ناشاد رہنے دے
ہے آئینِ ہوس فریاد، تو فریاد رہنے دے

جو میں چپ ہوں، تو مجھکو مائلِ فریاد رہنے دے
مجھے اتنا تو ظالم قید میں آزاد رہنے دے

کیا ہے تو نے دل آباد تو آباد رہنے دے
نہ رہنا ہو ترا ممکن تو اپنی یاد رہنے دے

رہائی کی مری فکر اے مرے صیاد رہنے دے
غنیمت ہے قفس ہی میں اگر آزاد رہنے دے

طریقہ موسمِ گل تک یہ اے صیاد رہنے دے
جو اک دن قید رکھ تو اک دن آزاد رہنے دے

ابھی فکرِ اسیری کچھ دنوں صیاد رہنے دے
چمن میں فصلِ گل جب تک ہو اور آزاد رہنے دے

یہ اپنی انقلاب اے گلشنِ ایجاد رہنے دے
کسی کو تو زمانے میں گھڑی بھر شاد رہنے دے

نویدِ وصل کیوں دیتی ہے اے امید تو ناحق
جو بربادِ تمنا ہے اُسے برباد رہنے دے

ہمیں نے جب بنایا ہے ستمگر تجھکو اے ظالم
کہیں کس مُنہ سے پھر یہ ہم کہ تو بیداد رہنے دے

نہ کر پیدا قفس اندر قفس قیدِ تعلق سے
کرم کر مجھ پر احساں اپنے اے صیاد رہنے دے

قفس میں میری پُر تاثیر فریادوں کے سنتے ہی
صدا ہر سمت سے اُٹھنے لگی "فریاد رہنے دے"

جفا میں اُس ستمگر کی نہیں ایسی کہ ہم بھولیں
مگر جب خود فراموشی ہماری، یاد رہنے دے!

ہنسی فریاد پر آتی ہے اے دل سننے والوں کو
یہی فریاد ہے تیری تو یہ فریاد رہنے دے

نہ کر اُسکی جفاؤں کی شکایت اے دلِ وحشی
وہ ہی ناشاد رہتا ہے جسے وہ شاد رہنے دے

ہزاروں طرح کے ہم رنج و غم لائے ہیں دُنیا سے
زمینِ گور سے کہدو ابھی آباد رہنے دے

یہ مانا میں نے آزادی ہی میرا حقِّ فطری ہے
مگر ذوقِ اسیری جب مجھے آزاد رہنے دے!

گرفتارِ قفس گھٹ کر نہ اے صیاد مر جائے
ابھی کچھ روز تک آزادیٔ فریاد رہنے دے

یہ دکھتی رگ ہے تو کیوں چھیڑتا ہے اسکو اے ہمدم
بیانِ لکھنؤ، ذکرِ امین آباد رہنے دے

نہ کہنا آج سے نشتر زباں پر اُف اگر لاؤں
قسم تجھ کو اگر باقی کوئی بیداد رہنے دے

۲۵۴ ۳۰

ضروری کیوں ہوں یہ دیر و حرم بشر کیلئے
یہیں سے راہ نکلتی ہے تیرے گھر کے لئے

بقدرِ تشنگیٔ ذوق تو اگر دیکھے
تو اک نظر تری کافی ہے عمر بھر کے لئے

الٰہی عذر اگر ہے انھیں، تو شامِ فراق
مجھے سکون ہی ملجائے رات بھر کے لئے

جو ہو سکے تو فلک کو کچھ اور کر دے بلند
کہ اور چاہئیں کچھ وسعتیں نظر کے لئے

کبھی وہ دن تھے کہ میں ضبط کو ترستا تھا
اب آنسوؤں کو ترستا ہوں چشمِ تر کے لئے

بس ایک آہ کی عادت سی ہے محبت میں
خدا گواہ جو مرتے ہوں ہم اثر کے لئے

ہزار پردوں میں چھپکر جو بیٹھنا تھا تجھے
فضول حسرتِ دیدار دی نظر کے لئے

الٰہی کیا کروں کسطرح وہ سنیں میری
کہاں سے لاؤں اثر آہِ بے اثر کے لئے

بھری ہی کیوں گئی لیں ہوائے باغ و بہار
قفس میں جب مجھے رکھنا تھا عمر بھر کے لئے

کہاں دعائے سحر میں پڑا ہے تو اے دل
شبِ فراق میں وسعت نہیں سحر کے لئے

ترا مریض ہے اور نیند ہے قیامت کی
غرض کہ رات اسے آئی تو عمر بھر کے لئے

مری طرف بھی کبھی التفات او ظالم — گراں ہو جو تری شوخیٔ نظر کے لئے

غمِ حبیب پہ مر جان دے نہ خوشیوں پر — یہ دو گھڑی کے لئے ہیں وہ عمر بھر کے لئے

مرے حواس گئے ہوش، میرا صبر و قرار — کسی کے عشق نے سب ایک ایک کر کے لئے

نظر کی نذر نہ کرتا تو اور کیا کرتا — مجھے حواس ملے تھے تری نظر کے لئے

مری نظر سے چھپانی نہ تھی نظر تجھ کو — کہ دل ہے دل کیلئے اور نظر نظر کے لئے

کرے جو صرفِ مناسب تو کم نہیں نشتر — بہت ہے زندگیٔ مختصر بشر کے لئے

۲۵۵ ۱۷

مجروح جگر بھی ہے وہ کیا دل کی خبر لے — بسمل سے کہے کون کہ بسمل کی خبر لے

کوئی نہیں جو انجمنِ دل کی خبر لے — ہے تیری ہی محفل تو ہی محفل کی خبر لے

اب ہوش بھی میں چھوڑ چکا یاد میں تیری — غافل ہوں تری یاد میں غافل کی خبر لے

کچھ آس جگر کی تھی سو مجروح ہے وہ بھی — اب تو ہی بتا کون مرے دل کی خبر لے

انجامِ محبت بھی بگڑ جائے نہ اے دل — دریا تو گیا ہاتھ سے ساحل کی خبر لے

ملتی نظر آتی نہیں یوں منزلِ مقصود — منزل سے کہو خود مری منزل کی خبر لے

کچھ زور سے ہے دردِ جگر حد سے زیادہ — ایسا نہ ہو بڑھ کر یہ کہیں دل کی خبر لے

بننا ہے کسی روز اسے داغِ محبت — اے چرخِ ستمگر مہِ کامل کی خبر لے

ٹوٹا تھا ابھی شمع پہ کیا ہو گیا آخر — بڑھ کر کوئی پروانۂ محفل کی خبر لے

مستور اسی میں تو ہے رازِ شبِ محفل — ہو کوئی تو خاکسترِ محفل کی خبر لے

بسمل کی تڑپ کاش دمِ قتل ہو ممکن
ہر قطرۂ خوں دامنِ قاتل کی خبر لے

صدمے سے ترے ہجر کے اللہ بچائے
میں بچ کے نہ کھیلوں تو مرے دل کی خبر لے

یہ چاند یہ تارے نہ اگر راہ نما ہوں
ہے کون جو آزردۂ محفل کی خبر لے

اب شوقِ شہادت کی کوئی حد نہیں اسکے
قاتل کو خبر دے کوئی بسمل کی خبر لے

ہر وقت خیالِ رُخِ محبوب کی دُھن ہے
ایسا نہ ہو آئے تو مرے دل کی خبر لے

کرنا ہے ستم تجھ کو تو وہ ذوقِ ستم دے
جو میری اس افسردگیٔ دل کی خبر لے

مایوس بہت رہروِ واماندہ کا دل ہے
منزل سے کہو خستۂ منزل کی خبر لے

بھٹکے گا تری راہ میں کب تک یونہی آخر
۲۵۶ آ نشتر گُم کردۂ منزل کی خبر لے ۱۸

نہ دے اجازتِ نالہ تو آہ کرنے دے
کسی طرح تو ستمگر نباہ کرنے دے

جو کر رہی ہے کسی کی نگاہ کرنے دے
تباہ کرتی ہے دل کو تباہ کرنے دے

اُنھیں یونہی ستمِ بے پناہ کرنے دے
اُنھیں کا دل ہے یہ آخر، تباہ کرنے دے

خدا کیواسطے اے ضبط، آہ کرنے دے
کسی کو ہجر کی شب کا گواہ کرنے دے

کرونگا عہدِ ضعیفی میں کیوں پھر افسوس
ابھی ہے عہدِ جوانی، گناہ کرنے دے

نہ جا فرشتوں کے لکھنے پہ دیکھ رحمتِ حق
سیاہ کرتے ہیں فردِ گناہ کرنے دے

گناہ سے نہ مجھے روک زاہدِ خود بیں
گناہ ہے مری فطرت، گناہ کرنے دے

ہماری خامشی کیا کم ہے آج محشر خیز
نہ کرنے دے جو وہ کافر نہ آہ کرنے دے

نقوشِ ہستیٔ باطل کا راز یوں نہ کھلا
ذرا قریب سے مجھکو نگاہ کرنے دے

نہ کر ضیائیں مرے داغہائے عشق کی کم
مجھے مقابلۂ مہر و ماہ کرنے دے

گناہ کون نہیں چاہتا کہ سرزد ہوں
مگر جو تیرہ نصیبی گناہ کرنے دے

ہزار بار مجھے روک آہ کرنے سے
ہزار بار کہونگا کہ آہ کرنے دے

غضب میں جان ہی کچھ دن ضبط کے ہاتھوں
نہ کرنے دے مجھے نالے نہ آہ کرنے دے

تجھے یقین محبت کا چاہیے **نشتر**
کرے زمانہ اگر اشتباہ کرنے دے

۲۵۷ ۱۲

وہ حجاباتِ فراق و وصلِ جاناں کیا ہوئے؟
وہ بیاباں کیا ہوئے اب وہ گلستاں کیا ہوئے؟

کیا اسی دن کو کئے تھے تو نے سب عدے وعید
اب زبانِ حسن تیرے عہد و پیماں کیا ہوئے؟

جا رہے ہیں جو چھوٹا سا کفن پہنے ہوئے
کوئی پوچھے ان سے اب وہ ساز و ساماں کیا ہوئے؟

ٹوٹنے میں دیر کچھ ان کے، نہ کچھ ہونے میں دیر
تو بہ میخوار ٹھہرے عہد و پیماں کیا ہوئے؟

کوئی پوچھے ان سے جنکا ابتدا میں ذکر تھا
اب وہ باتیں کیا ہوئیں وہ عہد و پیماں کیا ہوئے؟

حضرتِ دل اب تمھیں تنہائیاں ہیں کیوں پسند
رات دن کے وہ ہجومِ ہمنشیناں کیا ہوئے؟

دلیں آتے ہی ترے اے یاس، دل خالی ہوا
آرزوئیں کیا ہوئیں میری وہ ارماں کیا ہوئے؟

اک دلِ تنہا میں اے **نشتر** یہ شورش یہ ہجوم
اک مصیبت ہو گئے کمبخت ارماں کیا ہوئے؟

۲۵۸ ۸

فغاں جاری رہے اور مجھکو بیزارِ فغاں کر دے
مری خاموشیوں کا خاص اندازِ بیاں کر دے

زمیں کر دے کسیکو، یا کسیکو آسماں کر دے ۔۔۔ غرض جیسا بھی چاہے خدا اُسے دو جہاں کر دے
خیالِ چشمِ میگوں پہ تصدق جسم و جاں کر دے ۔۔۔ جو تیری پاس ہے اے دل وہ نذرِ میہماں کر دے
نظر ایسی مری اے خالقِ ہر دو جہاں کر دے ۔۔۔ جو ہر شاخِ چمن کو میری شاخِ آشیاں کر دے
بہت بیتاب ہیں تیور آج تو بیتابیِ دل کے ۔۔۔ کہیں کمبخت پھر مجھ کو نہ مجبورِ فغاں کر دے
جو ممکن ہو تو کچھ دن یوں نظامِ خلق ہو یارب ۔۔۔ فلک کو تو زمیں کر دے زمیں کو آسماں کر دے
نصیبِ دوستاں ہیں ہجر کے غم ایک مدت سے ۔۔۔ انھیں کچھ روز تو یارب نصیبِ دشمناں کر دے
لُٹا دیتا نہیں کیوں اپنی دولت اہلِ دُنیا پر ۔۔۔ گلستاں سے جو پایا ہے نثارِ گلستاں کر دے
غمِ عشق و محبّت کا یہ لطفِ عارضی یارب! ۔۔۔ حیاتِ چند روزہ کو حیاتِ جاوداں کر دے
نگاہِ یاس کیوں پیچھے پڑی ہے آج مقتل میں ۔۔۔ کہیں کمبخت قاتل کو نہ مجھ پر مہرباں کر دے
نگاہیں ہر قدم پر مانعِ دیدارِ جاناں ہیں ۔۔۔ مجھے اپنی نگاہوں سے جو ممکن ہو نہاں کر دے
جبینِ شوق کی بیتابیاں اب دم نہیں لیتیں ۔۔۔ زمیں کے ذرّے ذرّے کو تو اپنا آستاں کر دے
شکارِ یاس ہو جانے کا ڈر ہے جورِ پیہم سے ۔۔۔ جو ممکن ہو تو کچھ آساں ہمارا امتحاں کر دے
اگر اس جسمِ خاکی سے ترا ملنا نہیں ممکن ۔۔۔ گوارا ہے ہمیں یہ بھی فراقِ جسم و جاں کر دے
خبر گیری کریگا کون اے صیّاد اب اس کی ۔۔۔ لیے چلتا ہے تو کچھ انتظامِ آشیاں کر دے
جب اِس کی سیدھی چالو نہیں زمانے کی یہ حالت ہے ۔۔۔ نہ جانے کیا کسیدن انقلابِ آسماں کر دے

نگاہِ شوق کو اپنی ذرا روکے ہوئے نشتر
کہیں یہ منکشف سب پر نہ اسرارِ نہاں کر دے

سیر کی فرصت اگر مل جائے من مانی مجھے
عالمِ فانی نہ ہو یہ عالمِ فانی مجھے

دے غمِ عشق و محبت کی فراوانی مجھے
ورنہ کر دیگی فنا یارب تن آسانی مجھے

رہنمائیِ دل نے سچے دل سے کی ہوتی اگر
منزلِ مقصود مل جاتی بہ آسانی مجھے

جورِ پیہم سے مرا دل تم نے ٹکڑے کر دیا
اب پریشانی تمھیں ہے یا پریشانی مجھے؟

الفراق اے ہمنشیں، اب میں ہوں اور ہجرِ وسیع
اب نظر آنے لگا چاروں طرف پانی مجھے

پھر میں صیاد اور برق و باد سب کو دیکھتا
باغ کی ملتی جو دو دن کو نگہبانی مجھے

جب سے تیرے جام کے دو گھونٹ ساقی پی لئے
اک مسرت ہو رہی ہے آج روحانی مجھے

میں نے جو مانگا کبھی اس سے وہ مجھ کو مل گیا
نقشِ اُلفت ہو گیا نقشِ سلیمانی مجھے

دیکھکر دونوں کی اُفتادِ طبیعت ایک سی
نغمے بلبل کو دئے اُس نے غزلخوانی مجھے

اور کر دے مشکلیں پیدا طریقِ عشق میں
اب اسی میں کچھ نظر آتی ہے آسانی مجھے

یادِ گیسو سے شبِ غم، ہو گیا میں دست کش
جب نظر آنے لگی ہر سُو پریشانی مجھے

یوں بھی توبہ توڑنے کو میں سمجھتا تھا ثواب
ہو گئی کالی گھٹا تائیدِ ربانی مجھے

دیکھکر انکو پشیماں عرصۂ محشر میں آج
ہو رہی ہے اپنے شکووں پر پشیمانی مجھے

عالمِ فانی کے دھوکے خوب کھائے عمر بھر
عالمِ فانی نہیں تھا، عالمِ فانی مجھے

قید سے میں کب چھٹا تھا کتنی مدت ہو گئی
چھوڑتا اب تک نہیں ماحولِ زندانی مجھے

جب محبت کی پریشانی میں اتنا لطف تھا
ساری دُنیا کی نہ دیدی کیوں پریشانی مجھے؟

کس قیامت کی وہ ظالم رات بھی اک رات تھی
یاد ہے اب تک شبِ غم کی پریشانی مجھے

اُن کو فکرِ جور رہتی ہے، مجھے فکرِ وفا
اک پریشانی اُنھیں ہے، اک پریشانی مجھے

جو پریشانی مجھے اُسوقت ہوتی ہے نہ پوچھ
جب محبت میں نہیں ہوتی پریشانی مجھے

روز لاکھوں آرزوئیں لے کر آنا بزم میں
روز لاکھوں آرزوئیں دلمیں لیجانی مجھے

وہ پشیمانی کے آنسو تھے کسی کے آنکھ میں
روزِ محشر کردیا جس چیز نے پانی مجھے

اب ترے دیدار کی جرأت کہاں اے برقِ حسن
کرچکی ہے عشق تیرے جلووں کی عریانی مجھے

تو مجھے مایوس ہی کردے خدا کیواسطے
کیوں پریشانی تجھے ہو، کیوں پریشانی مجھے

جوش میں آتا ہے دل تو ضبط کردیتا ہے خشک
بادل اُٹھتے ہیں مگر ملتا نہیں پانی مجھے

میں ازل سے ہوں ابد تک مٹ نہیں سکتا کبھی
کیوں سمجھ رکھا ہے نشتر دہر نے فانی مجھے

۲۶۰ ۳۵

حسن خود مست کا مستانہ بنے یا نہ بنے
دلکو کیا حکم ہے، دیوانہ بنے یا نہ بنے

لیکے جاتا تو ہوں، پیمانہ بنے یا نہ بنے
دل مرا قابلِ میخانہ بنے یا نہ بنے

جانے دل عشق میں دیوانہ بنے یا نہ بنے
رہبرِ کوچۂ جانانہ بنے یا نہ بنے

تا قیامت اسے بھولیگی نہ دنیائے وفا
میری روداد کا افسانہ بنے یا نہ بنے

ہم جبیں اپنی ہٹائینگے نہ میخانے سے
قابلِ سجدہ میخانہ بنے یا نہ بنے

لطف تو جب ہے کہ بنجائے مری جیتے جی
بعد میرے مرا افسانہ بنے یا نہ بنے

پوچھ لیتا کوئی زاہد سے کہ مسجد کا تری
ایک در جانبِ میخانہ بنے یا نہ بنے؟

دل بنا جام، یہ اک فال مبارک ہے، مگر
آگے اب دیکھئے میخانہ بنے یا نہ بنے

سامنے ہی مرے میخانے کی ہوئی تکمیل
پھر خدا جانے کہ میخانہ بنے یا نہ بنے

شمع موجود ہے، جل بجھنے کے ساماں موجود
کوئی ہم فطرتِ پروانہ بنے یا نہ بنے

تیرے امکان میں غافل ہے کہ یہ دل تیرا
جلوہ گاہِ رُخِ جانانہ بنے یا نہ بنے

دلمیں آتا ہے کہ بن جاؤں ترا دیوانہ
اور کوئی ترا دیوانہ بنے یا نہ بنے

اک مرا دل ہے کہ ہے جام بھی خُم بھی زاہد
اک ترا دل ہے کہ پیمانہ بنے یا نہ بنے

دلکو اُمید کے دھوکے تو دیے جاتا ہوں
قابلِ جلوۂ جانانہ بنے یا نہ بنے

جی میں آتا ہے کہ جو دلمیں ہے، سب کہہ ڈالوں
پھر مری بات کا افسانہ بنے یا نہ بنے

خاکِ میخانہ میں مٹی تو ملا دیں اپنی
کوئی ساغر، کوئی پیمانہ بنے یا نہ بنے

سنگِ بنیاد تو ہاتھوں سے میں رکھتا جاؤں
پھر بلا سے مری، میخانہ بنے یا نہ بنے

کامیابی کی تمنا ہو محبت میں جسے
عقل کو چھوڑ دے دیوانہ بنے یا نہ بنے

آج کچھ کرہی کے اس بزم سے ہم اُٹھینگے
تجھ سے اے ہمتِ مردانہ بنے یا نہ بنے

جب وہ دیوانہ گر انداز سے دیکھیں نشتر
کون پھر سوچے کہ دیوانہ بنے یا نہ بنے

۲۶۱ ۱۸

دن میں فغاں سے کام ہے، رات میں کام آہ سے
کسکی نگاہ لڑ گئی، میرے دلِ تباہ سے

لوٹ رہا ہوں آہ میں، یار کی بارگاہ سے
دیکھے جہان کو کوئی آج مری نگاہ سے

مجھکو ملی ہے حشر میں، رحمتِ حق گناہ سے
میرے گناہ دیکھئے، آج مری نگاہ سے

شرمِ گناہ نے یہ کیا، حشر میں سحر کر دیا
آئے تھے ہم گناہگار جاتے ہیں بیگناہ سے

حضرتِ زاہد آپ کی، میری نبھی نہ نبھ سکے
مجھ کو یقیں سے کام ہے، آپکو اشتباہ سے

میرا فسانہ ناصحا، کیا تو سمجھ سکے بھلا
سُن اسے میرے کان سے، دیکھ مری نگاہ سے

مجھکو نہ آئے کیوں ہنسی اہلِ جہاں کو دیکھکر
بارِ گناہ سے لدے پھرتے ہیں بیگناہ سے

تیری نظر عیاں پرست، میری نظر نہاں پرست
تیری نگاہ زاہدا، کم ہے مری نگاہ سے

عشق ہے آتشِ مہیب عشق کی طرح ہو اگر
سارے جہاں کو پھونک دی، چاہے تو ایک آہ سے

یونہی شبِ مفارقت، جان کی خیریت نہ تھی
لیجئے سامنے سے وہ، بادل اُٹھے سیاہ سے

منظرِ ماہتاب کل، وقتِ طلوع کیا کہیں
جیسے کوئی جوانِ مست اُٹھا ہو خوابگاہ سے

عالمِ حسن کی تجھے، یوں تو ہوئی نہ ہو خبر
ایک دن اپنے حُسن کو، دیکھ مری نگاہ سے

پردہ روئے دوست ہے، اپنی نگاہِ ظاہری
دیکھیے حُسنِ یار کو دیدۂ بے نگاہ سے

وہم و گماں نے بارہا، ہم کو بھلایا راستہ
آ کے ہم اپنی راہ پر لوٹ گئے ہیں راہ سے

قصہ طور کا ابھی، دل سے اثر نہیں گیا
دیکھو، نہ دیکھو پھر کہیں آج اُسی نگاہ سے

زعم جو عاشقی کا تھا، دل سے مرے نکل گیا
ایک حجاب اُٹھ گیا، آج مری نگاہ سے

غیض اور التفات کیا، کیا جمال اور جلال
وہ مجھے دیکھتے تو ہیں، دیکھیں کسی نگاہ سے

رحمتِ حق نے جب لیا، دامنِ عفو میں مجھے
حشر میں شرمسار تھے، لوگ مرے گناہ سے

حیلۂ رحمتِ خدا، جب ہیں مجھے مرے گناہ
ترکِ گناہ کیوں نہ ہو، بڑھکے مجھے گناہ سے

کوئی جسے نہ سُن سکے، کچھ نہ جسے سمجھ سکے
کرتا ہوں میں وہ گفتگو، انجم و مہر و ماہ سے

دل ہی شکستہ الم، آنکھ ہے صرفِ اشکِ غم
کون انھیں خبر کرے، حالِ دلِ تباہ سے

میری نظر میں کیا جچے، تیری حقیقت اے فلک
تجھ سے ہزار بن گئے، اک مرے دودِ آہ سے

ذوقِ نظر کا فرق ہے، دیکھتے ہیں سب آپکو
کوئی کسی نگاہ سے، کوئی کسی نگاہ سے

مجھکو سکونِ دل تو ہے، اسکو سکونِ دل کہاں
فقر مرا ہے خوب تر، شوکتِ پادشاہ سے

نشترؔ زار منتظر ہے تری اک نگاہ کا
اُس کو بھی دیکھ لے کبھی، پیار بھری نگاہ سے

۲۶۲ ۲۵

جلوہ گاہِ حُسن پوشیدہ دلِ مضطر میں ہے
ڈھونڈتا ہوں میں اُسے باہر جو میرے گھر میں ہے

دلمیں احساسِ ندامت اشک چشمِ تر میں ہے
دوسرا کون آج مجھ سا، عرصۂ محشر میں ہے

راتدن وحشت تلاشِ یار کے چکر میں ہے
جستجو دُنیا میں ہے اُسکی جو اپنے گھر میں ہے

ہمکو کیا مطلب اِس چکر میں رکھیں ذہن کو
ہے زمیں گردش میں یا چرخِ کہن چکر میں ہے

میں ہوں گردش میں کہ سرگرمِ تلاشِ دوست ہوں
آسماں سے پوچھتا کوئی یہ کس چکر میں ہے

نام ہے جسکا تپش، کہتے ہیں جسکو اضطراب
کچھ شرار و برق میں، باقی دلِ مضطر میں ہے

چین آتا ہے نہ اِس پہلو، نہ اُس پہلو مجھے
کیا زمانے بھر کی بیتابی دلِ مضطر میں ہے

بیقراری میں ٹھہر سکتی نہیں ہے کوئی چیز
کس طرح قایم ترا ارمان دلِ مضطر میں ہے

کیوں ہمارے عشق میں ہوتا ہے ناصح سدِ راہ
ایک ہم ہی تو نہیں، دُنیا اِسی چکر میں ہے

کاٹتا ہے پر میرے، صیّاد اس سے پوچھئے
ہمّتِ پرواز دل میں ہے، کہ میرے پر میں ہے

تو اُڑاتی پھر رہی ہے جس کو اے بادِ صبا
زینتِ محفل اسی محفل کی خاکستر میں ہے

بیقراری کی بھی ہے تقسیم کتنی ناروا
کچھ زمانے بھر میں ہے، باقی دلِ مضطر میں ہے

ایک میرا عشق جس کا کوئی پرساں ہی نہیں
اپنی نظروں سے گرا، دنیا کی نظروں سے گرا
خالقِ عالم کا یہ ادنیٰ کرشمہ دیکھئے
دیکھتے ہی انکو، آجاتی ہے رحمت جوش میں
ہو اگر ممکن بڑھا دے اور کچھ بیتابیاں
ناروا ہے موت پر کرنا کسی کی رنج و غم

ایک تیرا حسن جسکی دھوم دنیا بھر میں ہے
قدر باہر بھی جبھی تک ہے، کہ جبتک گھر میں ہے
ساری دنیا سے نہاں ہے اور دنیا بھر میں ہے
راز رحمت کا گنہگاروں کی چشمِ تر میں ہے
اور گنجایش ابھی میرے دلِ مضطر میں ہے
تھا جو غربت میں ابھی تک، آج اپنے گھر میں ہے

کیوں کسی کے سامنے افشا کرے اسرارِ عشق
وہ دلِ نشتر میں ہے جو کچھ دلِ نشتر میں ہے

۲۶۳ ۱۹

کہیں عشق کا یہ کرم رہے، تو مزہ تمہاری قسم رہے
تمہیں شوقِ ظلم و ستم رہے، ہمیں فرقِ لذتِ غم رہے
ہمیں کیا خبر، جو ستم رہے، تو بہت رہے کہ وہ کم رہے
کہ اسیر شوقِ ستم رہے، ہم اسیر لذتِ غم رہے
غمِ عشق تھا وہ ہی اک مگر عجب اختلاف میں ہم رہے
کبھی صرفِ نالۂ غم رہے، کبھی محوِ لذتِ غم رہے
نہ تھی اُنکی زندگی، زندگی، جو ہلاکِ لطف و کرم رہے
وہ ہی خوش نصیب تھے عشق میں جو تمہارے کشتۂ غم رہے
نہ وفا میں میرا جواب تھا، نہ جفا میں اُنکا جواب تھا!

رہے دونوں عشق میں ایک سے، نہ میں کم رہا نہ وہ کم رہے
وہ بسے دل کے پردے میں جلوہ گر، کہیں بدنصیبی کو کیا مگر
کبھی بھول کر نہ پڑی نظر، وہیں وہ رہے وہیں ہم رہے
یونہی کاش عشق میں ہو بسر، کہ رہوں میں اپنے سے بیخبر
کبھی بھول کر نہ ہو آنکھ تر، مرے دل میں لاکھ الم رہے
مرے دل میں رہ کے وہ عمر بھر، نہ الگ رہے نہ ملے کبھی
وہ عجیب طرح الگ رہے، وہ عجیب طرح بہم رہے
جو کسی نے پوچھ لیا کہیں، کبھی میرا قصۂ عاشقی
تو نکل کے آنکھوں سے اشکِ خون، وہیں آ کے پلکوں پہ تھم رہے
نہ حیات کی کوئی اصلیت، نہ ممات کی کوئی اصلیت
رہِ عاشقی کے یہ راہرو، کبھی چل پڑے کبھی تھم رہے
نہ کرم کے ہم ترے شیفتہ، نہ ستم پہ تیرے فریفتہ
وہ کرم رہے کہ ستم رہے، ہمیں لطفِ لذتِ غم رہے
وہ نہیں ہے آدمی آدمی، جو خوشی میں بھول کے رہ گیا
یہ مزہ نشاط و خوشی کا ہے، کہ نگاہ جانبِ غم رہے
ہمیں کیا امید سے واسطہ، ہمیں گھیرتی ہے امید کیوں؟
وہ ہمارا دشمنِ عیش ہے، جو ہمارا دشمنِ غم رہے

جو زبان بند نہ ہو گئی، تو کہیں گے اُن سے یہ حشر میں
ہمیں ایک کیوں ہوئے رو سیہ، ہے تم جہاں وہیں ہم رہے
نہ جنھوں نے ذکر کیا ترا، نہ جنھوں نے یاد کیا تجھے
وہ فضول بارِ جہاں رہے، وہ فضول بارِ شکم رہے
نہ وہ شغلِ بادہ و جام ہے، نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے
نہ وہ دن رہے، نہ وہ سِن رہے، نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے
مجھے کیوں ہو دیر کی جستجو، مجھے کیوں حرم کی ہو آرزو
ہے مزہ تو جب، تری عشق میں مرا دل ہی دیر و حرم رہے
ابھی اُنکے آنے میں دیر ہے، ابھی کون جینے سے سیر ہے؟
ابھی کہدو سانس رواں رہے، ابھی اور آنکھوں میں دم رہے
ہمیں نشتر اپنے خیال میں ہے کسی کی یاد سے واسطہ
ہمیں کیا جو ہمہ ستم رہے، ہمیں کیا جو ہم پہ کرم رہے

۲۶۴

پہلے ہی مرنیوالا سمجھتا یہ کاشکے!
ملجائیں وہ، اور اُنکو سُنا لوں میں کاشکے!
یہ رنگ ہیں مریضِ محبت کی لاش کے
خنجر بکف وہ آ گئی کیا قتل گاہ میں
آنکھوں میں دم ہے اب کوئی ساعت کا میہماں

۱۹

ٹکڑے اُڑینگے کوچۂ قاتل میں لاش کے
گذرے ہیں ہو فسانے غمِ دلخراش کے
ابتک نشاں بنے ہیں غمِ دلخراش کے
نعرے بلند ہونے لگے شادباش کے
بیمارِ غم کے سامنے ہوتے وہ کاشکے!

ہم کیوں نشاطِ دہر سے ہوجائیں شادماں ٹوٹے ہوئے ہیں لطفِ غمِ دلخراش کے
دُنیا میں عاشقوں کا ٹھکانہ کہاں سے لگے دوچار ہوں جو اور تمہاری قماش کے
آنکھوں میں ڈھونڈتے کہ تمہیں دل میں ڈھونڈتے تھے یہ ہی دو مقام تمہاری تلاش کے
نزدیک سے دکھائے مجھے انجم اے فلک ٹکڑے نہ ہوں یہ میرے دلِ پاش پاش کے
غافل ہے آدمی تو اُسی کا قصور ہے نعرے یہاں بلند ہیں "ہشیار باش" کے
دیکھو جسے وہ پھیر میں دیر و حرم کے ہے گویا یہی مقام ہیں اُس کی تلاش کے
ہُشیاریوں سے رکھتے ہماری بلا غرض قایل ہیں ہم تو عشق میں "دیوانہ باش" کے
دنیائے عشق میں ہیں شب و روز تذکرے تیرے حجاب اور ہماری تلاش کے
پانی میں رہ کے تر نہیں ہوتا ہے نیلوفر اس سے سبھاؤ سیکھ یہاں بود و باش کے

۲۶۵
پیری کے دن خراب نہ کر نشترؔ اس طرح
اُس کو تلاش کر، یہی دن ہیں تلاش کے
۱۵

ناز والا نیاز کیا جانے سوز کا رنگ ساز کیا جانے
موت دُنیا میں کس کو کہتے ہیں تیرا مقتولِ ناز کیا جانے
بندۂ ہوشیاری و خود بیں میری غفلت کا راز کیا جانے
کیا کروں تجھ سے بات میں ناصح تو محبت کا راز کیا جانے
کیا مرض، کیا علاج ہے میرا تو اسے چارہ ساز کیا جانے
کون ہے دوست، کون ہے دشمن رحمتِ کارساز کیا جانے

کیا گذرتی ہے دل پہ عاشق کے چشمِ دیوانہ ساز کیا جانے
دلنوازی ہے حسن کا زیور جو نہ ہو دلنواز کیا جانے
میری دنیائے عشق کی باتیں اُنکی دُنیائے ناز کیا جانے
جسکے دل میں نہیں ہے سوز و گداز میرا سوز و گداز کیا جانے
اُس کی یکرنگیٔ کرم نشترؔ
۲۶۶ فرق اور امتیاز کیا جانے ۱۱

نہ بھولیں اپنے گلشن پر زیادہ گلستاں والے چلیں گے ایک دن اس باغ میں جھونکے خزاں والے
زباں سے اُف نہیں کرتے کبھی، دردِ نہاں والے ہیں بالکل بے زباں گویا یہ بیچارے زباں والے
ذرا انکی بھی سن لینا، اگر تمکیں اجازت دے وہاں کچھ بے زباں بھی ہیں جہاں ہیں یہ زباں والے
درِ جاناں مری نظروں میں اک خلدِ مجسم ہے لیے بیٹھے رہیں باغِ جناں، باغِ جناں والے
قفس میں کیا کھٹکنے کو تصورِ باغ کا کم تھا یہ کس نے رکھدیئے تنکے ہمارے آشیاں والے
چلیں زاہد کے کہنے پر کہ ساقی کا کہا مانیں ہمیں گھبرائے دیتے ہیں یہ ظالم درمیاں والے
ہمیں تو چار دن کی زندگی بھی ہوگئی دوبھر نہ جانے جیتے ہیں کیونکر حیاتِ جاوداں والے
"خموشی معنئ دارد کہ در گفتن نمی آید" ہماری بے زبانی کچھ سمجھتے ہیں زباں والے
غمِ پنہاں سے میری زندگی ہے زندگی نشترؔ
۲۶۷ نہ بدلوں میں اگر بدلیں نشاطِ دوجہاں والے ۹

مزہ اس عشق میں جو کچھ ہے وہ جور و جفا تک ہے ستمگر کیوں نہیں وہ تو ستمگر سر سے پا تک سا ہے

وہ ناداں ہیں جو سمجھیں زندگی حدِ قضا تک ہے
حقیقت میں اُسی کے بعد ہے سب کچھ بقا تک ہے

محبت میں خفا مجھ سے نگاہِ آشنا تک ہے
وہ بیکس ہوں کہ میری بیکسی بھی انتہا تک ہے

ہر اندازِ جفا اک امتیازی شان رکھتا ہے
جفائے ناروا، محدود اربابِ وفا تک ہے

اگر دل جلوہ زارِ حُسن میں کھویا تو حیرت کیا
میں سُنتا ہوں اسیرِ حُسن و رعنائی خدا تک ہے

مرے نزدیک محرومی کہیں بہتر ہے دُنیا میں
کہ آخر مدعا بھی تو حصولِ مدعا تک ہے

ستم میں ہو کمی اُنکے، کہ اور اُس میں اضافہ ہو
ہماری کیا، ہمارا زور تو دستِ دُعا تک ہے

نہ جینا اُن کو آتا ہے، نہ مرنا اُنکو آتا ہے
جو اپنی زندگانی کو سمجھتے ہیں قضا تک ہے

ہمارا سا بھی شاید ہی کسی کا ہوگا افسانہ
عجب اک بیخودی سی ابتدا سے انتہا تک ہے

وہ دُنیا کوئی دُنیا ہے، وہ ہستی کوئی ہستی ہے
زیادہ سے زیادہ واسطہ جس سے قضا تک ہے

قضا کی حد سے آگے بڑھکے ہو تو ہی بقا حاصل
وہ کوئی زندگی میں زندگی ہے جو قضا تک ہے

طبیعت سے کرو جو کام، ہوتا ہے اثر اُس میں
جو منظورِ طبیعت ہے، وہ منظورِ خدا تک ہے

الٰہی دردِ اُلفت بڑھکے جائیگا کہاں آخر
کہ اپنی ابتدا ہی میں یہ ظالم انتہا تک ہے

رسا جس روز ہوگی یہ، مزہ آجائیگا نشتر
مری محرومیٔ تقدیر آہِ نارسا تک ہے

نہ جانے زندگی کی ہو گئی رفتار کیا نشتر
محبت میں گوارا مجھ کو احسانِ قضا تک ہے

۲۶۸ 15

سُنتے ہیں ہم شفا بھی تمہاری نظر میں ہے
بس اِک نظر، کہ درد کی شدّت جگر میں ہے

مجھکو کیا اسیر تو صیاد کیا ہوا
جو تھا مری نگاہ میں اب بھی نظر میں ہے

اہلِ نظر ہیں دست بہ دل دست بر جگر
کوئی تو ایسی بات تمھاری نظر میں ہے

نبضیں بھی ڈوبنے لگیں تاروں کے ساتھ ساتھ
اب اور کتنی دیر الٰہی سحر میں ہے؟

زاہد سے رہبری کی توقع فضول ہے
منزل کی کیا کہے جو ابھی رہگذر میں ہے

ہم رنج اور عیش کو سمجھیں نہ کیوں حقیر
دونوں کا جب مآل ہماری نظر میں ہے

دیکھا تھا ایک بار ازل میں جمالِ دوست
اُس دن سے آجتک، وہی جلوہ نظر میں ہے

دیر و حرم میں ڈھونڈھ رہی ہے تمام خلق
باہر تلاش اُس کی ہے جو چیز گھر میں ہے

دُنیا سے میں نے پھیر لی جس دن سے اپنی آنکھ
پوچھے نہ کوئی مجھ سے جو عالم نظر میں ہے

بن بن کے اشک آنکھوں سے حسرت ٹپک پڑی
دُنیائے عشق گوشۂ دامانِ تر میں ہے

اب میں طریقِ عشق نہ چھوڑونگا بھول کر
منزل مری ضرور اسی رہگذر میں ہے

یہ ہم بجز نفس کے کسی اور میں کہاں
مرکز پر اپنے رہ کے ہمیشہ سفر میں ہے

کیا سمجھے میرے مشربِ رندی کو محتسب
اُس نے سُنا نہ ہوگا جو میری نظر میں ہے

چاہے بنائے، چاہے بگاڑے کسی کو یہ
جو کچھ ہے حسن و عشق کی پہلی نظر میں ہے

محرومیوں سے اپنا تو پیمانہ چھٹ سکا
تاثیر سُنتے تھے کہ دُعائے سحر میں ہے

نشترؔ ملک بھی اسکے عُلو کے ہیں معترف
کچھ بھی نہیں ہے، پھر بھی بہت کچھ بشر میں ہے

۲۶۹ ۱۶

ضو فگن جلوہ ترا دل کے نہاں خانے میں ہے
لاکھ ویرانہ سہی رونق تو ویرانے میں ہے

یوں تو مستی دیر میں کعبے میں بُتخانے میں ہے
بات لیکن وہ کہاں جو دل کے کاشانے میں ہے

لطفِ منزل کیا جو قایم رہ گئے ہوش و حواس
لطف پانے میں نہیں ہے، بلکہ کھو جانے میں ہے

فرق مجھ میں اور زاہد میں یہی تو ہے فقط
میں نے پی لی اُسکے پیمانے کی پیمانے میں ہے

ال چوکھا ہو تو زاہد بیش و کم کی فکر کیا
تیرے خم میں وہ کہاں جو میرے پیمانے میں ہے

کس کو میں اچھا کہوں، کس کو برا واعظ، مگر
دن کو جو مسجد میں ہے وہ شب کو میخانے میں ہے

تجھ کو ساقی جام و مینا کی قسم، سچ تو بتا
مجھ سا دریا نوش کوئی تیرے میخانے میں ہے؟

سننے والے تھام لیتے ہیں کلیجہ بزم میں
بات کوئی تو ہمارے غم کے افسانے میں ہے

خم کے خم ساقی بھرے ہوں، مجھ کو ان سے واسطہ
میرے قسمت کی جو ہے وہ میرے پیمانے میں ہے

زندگانی جس کو کہتے ہیں جہانِ عشق میں
سر سے لیکر پاؤں تک وہ در میخانے میں ہے

وہ بھی ہو ساقی عنایت، وہ بھی ملجائے مجھے
میرے حصہ کی جو باقی تیرے پیمانے میں ہے

وعظ سننے والو کو واعظ جو آنکھیں ہوں تو دیکھ
وعظ میں بیٹھے ہیں، دل انکا میخانے میں ہے

چشمِ ساقی سے جو دل کا ربط قایم ہے یہی
دیکھنا سب میکدہ اک روز پیمانے میں ہے

انکی آنکھیں کہہ رہی ہیں آج انکے دل کا حال
کل جو خم میں موجزن تھی آج پیمانے میں ہے

چشمِ ساقی کا تصور، ساتھ رہتا ہے مرے
میں کہیں ہوں، دل مرا ہر وقت میخانے میں ہے

ڈھونڈتی ہے جس کو دنیا کعبہ و بتخانہ میں
وہ نہ کعبے میں ہے نشتر اور نہ بتخانے میں ہے

۲۷۰ ۱۶

پھر جفائے حسن کا آغاز ہونا چاہیے
سوز سے تبدیل دل کا ساز ہونا چاہیے

سعی تا حدِ حریمِ ناز ہونا چاہیے
ہوش کو اب مائلِ پرواز ہونا چاہیے

میری جانب اِک نگاہِ ناز ہونا چاہیئے
ہو وہ کتنی ہی غلط انداز ہونا چاہیئے

کر دیا کرتی ہیں یہ تردید تیری بات کی
کیا تری آنکھوں کو حیلہ ساز ہونا چاہیئے

جانے کب آ جائے ندائے غیب اُسکے کان میں
آدمی کو گوشِ برآواز ہونا چاہیئے

کیوں خوشی میں خوش رہے، کیوں رنج میں ماتم کرے
دل بشر کا نغمۂ ہر ساز ہونا چاہیئے

سچ کہا ہے عیب کرنے کو بھی لازم ہے ہُنر
ہر جفا میں اک نیا انداز ہونا چاہیئے

دیکھ سکتی ہے نظر؟ نیرنگیٔ کون و مکاں
دل کی آنکھوں کو کرشمہ ساز ہونا چاہیئے

بے جفاؤں کے، محبت بے طعامِ بے نمک
ہر ستم اُن کا نظر انداز ہونا چاہیئے

ہر جفا میں سو فسانے ہوں جو تڑپا دیں مجھے
ہر جفا تیری فسانہ ساز ہونا چاہیئے

نام لب پر ہے کسی کا آنکھ میں تصویر ہے
اس اجل پر زندگی کو ناز ہونا چاہیئے

موت سے انسان کی بیزاریاں بیکار ہیں
فاش آخر زندگی کا راز ہونا چاہیئے

دیکھنے کا ڈھنگ بھی، اک چیز ہے نظروں کے ساتھ
تیر تو لاکھوں ہیں، تیر انداز ہونا چاہیئے

میں سراپا بن گیا ہوں آج تصویرِ نیاز
آج تم کو بھی سراپا ناز ہونا چاہیئے

ہجر کی شب اے خیالِ یار کر تو ہی کرم
ایسی تنہائی میں اک دمساز ہونا چاہیئے

بے نیازی عشق سے کیوں حسن کی فطرت میں ہے
ایک دن تو منکشف یہ راز ہونا چاہیئے

ناز کو ہے بے نیازی جب نیازِ عشق سے
عشق کو بھی بے نیازِ ناز ہونا چاہیئے

دل کی خواہش ہے کہ رازِ عشق پوشیدہ رہے
آنکھ کہتی ہے کہ افشا راز ہونا چاہیئے

کیا قفس ہے اور نشتر کیا قفس کی تیلیاں!

۲۷۱ حوصلوں میں قوتِ پرواز ہونا چاہیے ۱۹

دل میں مجھے دُنیا کا، جلوا نظر آتا ہے
بند آتنے سے کوزے میں، دریا نظر آتا ہے

گلشن نظر آتا ہے صحرا نظر آتا ہے
پردو نہیں حقیقت کے دھوکا نظر آتا ہے

ہمراہ ستمگر کے محشر ہے اداؤں کا
گو دیکھنے میں ظالم، تنہا نظر آتا ہے

پھر یاد نشیمن کی، کمبخت نے کی تازہ
پھر آج قفس میں اک تنکا نظر آتا ہے

یہ بند نہ ہوں جبتک دیدار نہیں ممکن
آنکھوں کا مجھے حایل، پردا نظر آتا ہے

سب اہلِ جہاں جسکو کہتے ہیں چمن خانہ
ہم دشت نوردوں کو صحرا نظر آتا ہے

جس وقت سے اُٹھا ہے کوئی مری پہلو سے
اُس وقت سے دل بیٹھا بیٹھا نظر آتا ہے

پھیلا مرا اشکِ غم پھیلے گا بڑی حد تک
کچھ دن میں ہی قطرہ، دریا نظر آتا ہے

جب غور محبت پر، کرتا ہوں میں اے نشتر
لہراتا ہوا سا اک، دریا نظر آتا ہے

۲۷۲ ۹

ہم نے مانا ہے جو کچھ تقدیر ہے
شرط انساں کو مگر تدبیر ہے

سعیِ لاحاصل مری تدبیر ہے
تو جو کر دے وہ مری تقدیر ہے

یہ سمجھکر میں تو کرتا ہوں گناہ
بے گناہی داخلِ تقصیر ہے

جو سراپا تھا کبھی عیش و نشاط
اب وہی دل درد کی تصویر ہے

قیدِ زندانِ ہوس ہے آدمی
آدمی کی ہر ہوس زنجیر ہے

اسطرف آئی اُدھر چلتی ہوئی
نوجوانی برق کی تنویر ہے

دیکھکر تصویر تیرے حُسن کی — دیکھئے جس کو وہی تصویر ہے
لے چلا ہے مجھ کو شوقِ جستجو — آگے اب میں ہوں مری تقدیر ہے
باغِ ہستی سے کنارہ کیا کروں — پھول کیا کانٹا بھی دامنگیر ہے
یا دُعا کرنی ہمیں آتی نہیں — بند یا شاید درِ تاثیر ہے
کہہ گئی کیا بے مروّتِ چشمِ دوست — دل ہمارا یاس کی تصویر ہے
تیرا عالم میں پتہ ملتا نہیں — گو یہ سُنتے ہیں تو عالمگیر ہے
زندگی و موت نشتر کچھ نہیں
خواب وہ، یہ خواب کی تعبیر ہے

۲۷۴ — ۱۳

جو دل دوست تھا وہ بھی سرگرمِ کیں ہے — محبت میں کوئی کسی کا نہیں ہے
فلک ہے، ستارے ہیں، ماہِ مبیں ہے — شریکِ غمِ ہجر کوئی نہیں ہے
جو قسمت حسیں ہے، تو دُنیا حسیں ہے — نہیں تو یہاں کوئی اپنا نہیں ہے
تری مست آنکھوں سے مخمور ساقی — اگر ہم نہیں ہیں تو کوئی نہیں ہے
غمِ عشق ہو اور مجھ کو عنایت — اب اتنے میں میرا گذارا نہیں ہے
وصال اور فرقت کو یہ جانتا ہوں — یہ دوزخ نہیں ہے، وہ جنت نہیں ہے
ہم اپنے سے غافل ہیں، آجاؤ دل میں — ہے تنہائی اِسوقت کوئی نہیں ہے
تمہیں پر مری زندگی منحصر ہے — نہیں تم جو میرے تو کوئی نہیں ہے
سوا تیری چشمِ عنایت کے ظالم — کوئی دردِ دل کا مداوا نہیں ہے

وہ، اور آئیں، کتنا غلط گو ہے قاصد
یہ کہنا کسیکا ہو، اُن کا نہیں ہے

خدا جانتا ہے مرے دل سے بڑھ کر
تمہارا طلب گار کوئی نہیں ہے

مقرر، اجل کا ہے وقت اور پھر بھی
کوئی وقت اِس کا مقرر نہیں ہے

محبت جتاتے مجھے عمر گذری
مگر اُن کو اب تک یقیں ہی نہیں ہے

اداؤں سے کہہ دو کہ لُوٹیں نہ اس کو
مرا دل ہے، مالِ غنیمت نہیں ہے

گنواتی ہے رونے میں کیوں اس کو شبنم
تری زندگی رات بھر بھی نہیں ہے

کہیں فصلِ گُل، فصلِ توبہ ہے واعظ؟
کہو گے وہ ہی تم، جو ممکن نہیں ہے

جئے یا مرے کوئی، اِس کو نہیں غم
حقیقت میں دُنیا کسیکی نہیں ہے

یہ کیا لب پہ آہیں اور آنکھوں میں آنسو
محبت ہے اے دل تماشا نہیں ہے

وفاؤں کے بدلے ستم ہو رہے ہیں
یہ عشق و وفا کا زمانہ نہیں ہے

محبت میں دل اب اُنھیں کا ہے نشتر
تم اپنا سمجھتے ہو اپنا نہیں ہے

۲۷۴ ۳۰

جہاں تم سمجھتے ہو اُس کو، نہیں ہے
خدا جانتا ہے وہ ظالم وہیں ہے

بھوئیں تن رہی ہیں، نگہ خشمگیں ہے
کوئی دم میں گرنے کو بجلی کہیں ہے

یہ صدمے اور اے دل تجھے غم نہیں ہے!
ہزار آفریں، صد ہزار آفریں ہے

نظر بندیوں کے سوا کچھ نہیں ہے
نہ کوئی مکاں ہے، نہ کوئی مکیں ہے

ہے انساں کے بس میں جو چاہے وہ لے لے
خودی بھی یہیں ہے، خدا بھی یہیں ہے

محبت مری بار آور ہو کیونکر / نہ اُن کو یقیں ہے نہ مجھکو یقیں ہے
مرے دل میں دیکھو ہجومِ تمنا / یہ معلوم ہوتا ہے، دُنیا نہیں ہے
نہ جانے کئے ہونگے کتنوں نے سجدے / جہاں آج اسوقت میری جبیں ہے
جو قبلِ جنوں بوسہ گاہِ جہاں تھا / یہ دامن وہی ہی، یہ وہ ہی آستیں ہے
ہوئے انقلابات دُنیا میں لاکھوں / محبت کی دُنیا جہاں تھی وہیں ہے
زمانہ ترقی کا داعی ہے، لیکن / یہ دُنیا جہاں تھی، ابھی تک وہیں ہے
بالآخر مری عاشقی رنگ لائی / جہاں وہم تھا کل، وہاں اب یقیں ہے
مداوائے دردِ جگر کیا کریں ہم / کبھی یہ کہیں ہے، کبھی یہ کہیں ہے
اسیرِ ہوس کے لئے ہے یہ دُنیا / مگس کے لئے جس طرح انگبیں ہے
جسارت کی توفیق جس کو ہو جیسی / زمیں بھی فلک ہے، فلک بھی زمیں ہے
کوئی دستِ وحشت کے دیکھے کرشمے / گریباں جہاں تھا وہاں آستیں ہے
نہ تڑپے نشیمن پہ بجلی سے کہدو / مرے پاس بھی نالۂ آتشیں ہے
عجب حال ہے تیرے وحشت زدوں کا / گریباں کہیں ہے، کہیں آستیں ہے

جو دُنیا کو لیکر چلا ہوں میں نشتر
تو میں اب جہاں ہوں، یہ دُنیا وہیں ہے

۲۷۵ ۱۹

لے ہے عشق جسمیں وہ سر ہی نہیں ہے / وہ دل ہی نہیں وہ جگر ہی نہیں ہے
مجھے حاجتِ چارہ گر ہی نہیں ہے / کہ اب ہوشِ دردِ جگر ہی نہیں ہے

جسے چاہتے تھا کہ دل کی خبر ہو
اُسے میرے دل کی خبر ہی نہیں ہے

وہ کھایا کریں لاکھ قسموں پہ قسمیں
اب اُن کی نظر وہ نظر ہی نہیں ہے

دُعائے سحر کیا کریں مرنے والے
مقدّر میں ان کے سحر ہی نہیں ہے

پڑا سابقہ بھی محبت میں کس سے
جو ظالم بھی ہے بے خبر ہی نہیں ہے

ملے راہرو تجھ کو کس طرح منزل
ابھی تو سرِ رہگذر ہی نہیں ہے

نہیں ہے جو معمورِ دردِ محبت
وہ دل ہی نہیں، وہ جگر ہی نہیں ہے

وہ آنے کو فرما گئے ہیں سحر تک
کہیں اب سُراغِ سحر ہی نہیں ہے

تمنائے دیدار کیونکر کریں ہم
ابھی مجالِ نظر ہی نہیں ہے

ادائیں بھی اُن کی کھُبی جا رہی ہیں
فقط دشمنِ دل نظر ہی نہیں ہے

ہمارے گناہوں کی کیا مغفرت ہو
ابھی چشمِ تر چشمِ تر ہی نہیں ہے

محبت کے ہمراہ رخصت ہوئے سب
وہ پہلا سا دردِ جگر ہی نہیں ہے

ابھی حشر ہونے کا امکان کیا ہے
ابھی انقلابِ نظر ہی نہیں ہے

نظر سے مری جب سے پنہاں ہے کوئی
نظر میں سرورِ نظر ہی نہیں ہے

کبھی میکدہ بھی مرا دیکھ واعظ
کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں ہے

نہیں دیکھتے وہ تو کیا غم ہے اے دل
محبت میں سب کچھ نظر ہی نہیں ہے

قصور اُن کے جلووں کا کیا ہے نشتر
کوئی آج اہلِ نظر ہی نہیں ہے

ہے کیسا غم نشاطِ دو جہاں میرے لئے
ہے بہارِ بے خزاں، فصلِ خزاں میرے لئے

فصلِ گُل میرے لئے، فصلِ خزاں میرے لئے
ہیں غرض رنج و نشاطِ دو جہاں میرے لئے

بجلیوں کا خوف، جورِ باغباں میرے لئے
عرصۂ محشر ہے صحنِ گلستاں میرے لئے

عشق نے کر دی ہے لامحدود توسیعِ نظر
اور پیدا ہوں زمین و آسماں میرے لئے

یا ستارہ بن کے آ یا ماہِ کامل بن کے آ
ایک دن ہو جا کسی صورت عیاں میرے لئے

تم نے جو دو بول میٹھے کہدیئے تھے ایک دن
ہو گئے کہنے کو وہ اک داستاں میرے لئے

اے خیالِ آشیاں مرہونِ منت ہوں ترا
کر دیا تو نے قفس کو آشیاں میرے لئے

جانے اسمیں مصلحت کیا تھی کہ دیدی ساتھ ساتھ
ساری دُنیا کو خموشی اور زباں میرے لئے

سوچتا رہتا ہوں میں قیدِ قفس میں راتدن
آشیاں سب کو خیالِ آشیاں میرے لئے

اب ٹھکانہ اپنا میں ڈھونڈوں گلستاں میں کہاں
لیلیا غیروں نے تھا جو آشیاں میرے لئے

دو گھڑی کو اور تھم جاؤ کہ قصہ ختم ہے
تم نے تکلیف اسقدر کی ہے جہاں میرے لئے

قافلے کا ساتھ چھٹ جانیکا مجھ کو غم نہیں
راہبر ہے اب غبارِ کارواں میرے لئے

اے دلِ غم دوست! اے لذت شناسِ رنج و غم
فصلِ گُل سے بڑھ کے ہی فصلِ خزاں میرے لئے

کس نظر سے دیکھتا ہوں آشیاں کو یہ نہ پوچھ
تنکا تنکا ہے قفس کا آشیاں میرے لئے

ہمصفیروں کو مرے، صیاد کوئی دُکھ نہ ہو
کر دیا ہے ترک انھوں نے گلستاں میرے لئے

زندگی میں کیوں نہ کی اہلِ جہاں نے میری قدر
بعد میرے کیوں ہے عالمِ نوحہ خواں میرے لئے

کیوں نشاطِ گلستاں میں یہ نہ سوچا ایک دن
کون کرتا تھا نظامِ گلستاں میرے لئے

آرزوؤں کا مری مرکز یہی اک شاخ ہے / چھوڑ دے صیاد شاخِ آشیاں میرے لئے
باغ سے جب ہو گیا میرا تعلق منقطع / اب کوئی معنی نہیں رکھتا دھواں میرے لئے
اک نظر اپنی انھیں نظروں سے قاتل اس طرف / اک انھیں تیروں کی تیرِ جانستاں میرے لئے
مجھ کو اپنے آشیاں کی فکر کیوں ہونے لگی / ساری دنیا بن گئی ہے آشیاں میرے لئے
اللہ اللہ عشق نے پہونچا دیا مجھ کو کہاں / دیر و کعبہ ہیں نشانِ بے نشاں میرے لئے
مرحبا اے بیخودی، صد مرحبا اے بیخودی / ہیں مری بیداریاں خوابِ گراں میرے لئے
ہاں نگاہِ یار کچھ دن اور یوں ہی چھیڑ چھاڑ / دل میں وہ اک اور زخمِ خونفشاں میرے لئے
جب قفس ہی میں بسر ہونی ہے نشترؔ عمر بھر / کاش ہو جاتا قفس ہی آشیاں میرے لئے

آسماں بھی آسماں مجھ کو نہ تھا نشترؔ کبھی
اب زمیں بھی ہو گئی ہے آسماں میرے لئے

۲۷۷ ۲۶

اس عقل و خرد کی دنیا میں ہشیار نہ رکھ غافل کر دے
رہنے کے نہیں قابل دنیا، رہنے کے مجھے قابل کر دے
رگ رگ سے یہی آتی ہے صدا، بسمل کر دے بسمل کر دے
کیا حشر ہو میرا جانِ حزیں، انکار اگر قاتل کر دے
بیداد و ستم کی لذت کو محدود نہ اے قاتل کر دے
ہر قطرۂ خونِ بسمل کو اک زخم رسیدہ دل کر دے
احسان جہاں لاکھوں ہیں ترے اک وہ بھی اے قاتل کر دے

بیزار بہت ہوں جلنے سے آسان مری مشکل کر دے
کیا خوب گھٹائیں اٹھی ہیں، کیا سرد ہوائیں آئی ہیں
اب لطف و کرم میخواروں پر، اے ساقی دریا دل کر دے
میں ترکِ محبت تو کر لوں ڈرتا ہوں مگر اس سے ناصح
مرنے کا تو مجھ کو خوف نہیں، جینا نہ کہیں مشکل کر دے
دل ایک ہے اور ارمان بہت، گھر ایک ہے اور مہماں بہت
ممکن ہو اگر تو حسن ذرا، توسیعِ مکانِ دل کر دے
یوں مری رسائی منزل تک دشوار نہیں، ناممکن ہے
میں تھک کے جہاں پر بیٹھ رہوں۔ اُس کو ہی مری منزل کر دے
موقوف بہت کچھ دل پر ہے، جس وقت یہ جس حالت میں ہو
محفل کو یہ کر دے تنہائی، تنہائی کو یہ محفل کر دے
ہے کون سا یہ آئینِ وفا، کس نے یہ سکھائی طرزِ جفا
مرنا بھی مرا آساں نہ کرے جینا بھی مرا مشکل کر دے
غفلت میں وہ دیکھا ہے میں نے، جو ہوش میں دیکھا تھا نہ کبھی
میں ہوش سے اپنے باز آیا، للہ مجھے غافل کر دے
کیا راہِ محبت لطف کی ہے ہر چیز میں ہے اک حسنِ کشش
ہر گام پہ دل کہتا ہے یہی، اب دو ر نہ جا منزل کر دے

مشتاقِ جراحت پھر ہوں میں، ارمانِ جراحت رکھتا ہوں
پھر تیر نظر سے اے ظالم، اک بار مجھے بسمل کر دے
اے غیرتِ دل وہ جانِ ستم، کس دل سے ہی بیٹھا غیر و نیں
اک آہ وہ کر جو ظالم کا، بربادِ سکونِ دل کر دے
رہ رہ کے جما ہی آتی ہے پھر دور ہو اب بے کیفی کا
اُٹھ اپنے رسیلے نغموں سے پھر گرم ذرا محفل کر دے
ہو عشق مجازی بھی تو کیا۔ لیکن ہے وہ ہی عشق اے نشتر
انسان کو جو انساں کر دے، جو دل کو یقیناً دل کر دے

۲۷۸ ۱۶

جو ان حسینوں سے ہم جور کا گلہ کرتے — جفائیں اور بھی یہ دشمنِ وفا کرتے
وفاؤں کے لئے کیوں اُن سے التجا کرتے — جو روک دیتے ستم بھی کہیں تو کیا کرتے
جو رات ٹھنک، نہ آنکھوں سے راستا کرتے — نہ جانے حال سحر تک ہمارا کیا کرتے
سوا ترے نظر آیا نہ کوئی اور ہمیں — بیاں کِس سے محبت کا ماجرا کرتے
نہ جانے کیا ترا اے ضبطِ غم بگڑ جاتا — کسی کی یاد میں آنسو اگر بہا کرتے
وہ ہی ہے بندۂ خالق، اُسی کی یاد ہی یاد — جسے کسی نے نہ دیکھا خدا کرتے
جو موت ملتی کہیں عاشقی میں مُنہ مانگی — تو انتہائے محبت کی ابتدا کرتے
ترے خیال کی ہوتی نہ تقویت جو ہمیں — شبِ فراق کا کس طرح سامنا کرتے
دو روزہ زیست تھی، دو روزہ جی لئے ہم بھی — جہاں میں اور زیادہ قیام کیا کرتے

تمہارے پردے کی رکھنی تھی شرم جب ہم کو
تمہیں بتاؤ سرِ طور اور کیا کرتے

شبِ فراق یہ رہ رہ کے سوچتے تھے ہم
جو دل کو صبر نہ آتا تو آج کیا کرتے

اُسکی زیست یہاں تھی اُسکی موت یہاں
جو اِس جہاں سے اُٹھا خدا خدا کرتے

خدا کے خوف پہ اہلِ جہاں کا ہے یہ حال
خدا کا خوف نہ ہوتا تو جانے کیا کرتے

جو نذرِ حُسن نہ کرتے، تو حضرتِ ناصح
تمہیں بتاؤ ہم اس دل کا اور کیا کرتے

جفا و جور غنیمت ہیں اُن کے حضرتِ دل
وہ ملتفت ہی نہ ہوتے تو آپ کیا کرتے

وقارِ ضبط کا ہوتا اگر نہ پاس ہمیں
تو اپنی پچھلی محبت کو رویا کرتے

خدا سے ہم نے کبھی التجا نہ کی کوئی
جو بے طلب نہ وہ دیتا، تو التجا کرتے

خطا پہ رحمتِ حق منحصر تھی جب نشتر
۲۷۹ اگر نہ کرتے خطائیں تو ہم خطا کرتے ۱۸

لیجئے پھر، لیکے بادل بجلیاں اُٹھنے کو ہے
کوئی دم میں پھر سوالِ آشیاں اُٹھنے کو ہے

فصلِ گل اُٹھنے کو ہے فصلِ خزاں اُٹھنے کو ہے
ایک دن آخر بساطِ گلستاں اُٹھنے کو ہے

پھر ہماری خانہ ویرانی کا موسم آگیا
پھر ہمارے نشیمن سے دھواں اُٹھنے کو ہے

چشم و دل سب کر رہے ہیں کوششِ اخفائے راز
ہمنشیں اب اعتبارِ رازداں اُٹھنے کو ہے

آگیا اے عندلیب اس باغ سے وقتِ وداع
دل اُٹھا اپنا، نگاہِ باغباں اُٹھنے کو ہے

وائے غفلت اسمیں محوِ رنگ و بو ہیں اہلِ باغ
دو گھڑی میں جس نشیمن سے دھواں اُٹھنے کو ہے

فرق اگر کچھ ہے تو یہ ویرانہ و گلشن میں ہے
اُٹھ چکا اسمیں دھواں اسمیں دھواں اُٹھنے کو ہے

طور کا قصہ نہ دہرایا گیا پھر آج تک
دہر سے شاید یہ رسمِ امتحاں اُٹھنے کو ہے

ناظمانِ عرصۂ محشر سے کہدو ہوشیار!
ایک دنیا آج سرگرمِ فغاں اُٹھنے کو ہے

ہے نوازش برق کی گر آشیانوں پہ یہی
اہلِ گلشن سے مذاقِ آشیاں اُٹھنے کو ہے

تجھکو بچنا ہے اگر اس سے تو چھپ جا زیرِ خاک
ورنہ فتنہ روز زیرِ آسماں اُٹھنے کو ہے

یوں تو عبرتناک ہے ہر موت کا منظر یہاں
حسرت اُس پر ہے جو کوئی نوجواں اُٹھنے کو ہے

دل کے آثار آج پھر اچھے نہیں آتے نظر
آج شاید دل میں پھر دردِ نہاں اُٹھنے کو ہے

کیوں رہیں ہر وقت ہم پابندِ فکرِ آشیاں
ایک دن آخر یہاں سے آشیاں اُٹھنے کو ہے

جانے کیا انجام ہونا ہے جبینِ شوق کا
رکھدیا ہے سر تو سنگِ آستاں اُٹھنے کو ہے

گلشنِ ہستی میں ہے ہر وقت تازہ انقلاب
ایک بننے کو ہے اور ایک آشیاں اُٹھنے کو ہے

بس یہی ہے بیٹھنا اُٹھنا ہمارا عشق میں
بیٹھنے کو دل ہے اور دردِ نہاں اُٹھنے کو ہے

دو سکون و نظمِ عالم کو نویدِ انتشار
پھر غزلخوانِ نشترِ جادو بیاں اُٹھنے کو ہے

۲۸۰ ۱۸

یہ مناظر ہیں کہاں کے سامنے
آ گیا کس آستاں کے سامنے؟

ہیچ ہیں سب وارداتیں حسن کی
ایک میری داستاں کے سامنے

منتظر اب دل مرا اُسوقت دیکھ
جب دھواں ہو آشیاں کے سامنے

سبز ہو شاخِ شجر یا خشک ہو
ایک ہیں برقِ طپاں کے سامنے

خوگرِ غم یوں نہیں ہونے کا میں
بجلیاں رکھ آشیاں کے سامنے

